میر باقر علی داستان گو

داستانیں اور داستان گوئی



ترتیب وتدوین

عقیل عباس جعفری

میر باقر علی داستان گو

داستانیں اور داستان گوئی

ترتیب و تدوین

عقیل عباس جعفری

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔۷۵۳۰۰

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان

ISBN-978-969-403-198-9

اشاعت اوّل: 2014

تعداد: پانچ سو

قیمت: 500روپے

مطبع: احمد گرافکس

کریم آباد، کراچی

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح

انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے

اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

ڈاکٹر فاطمہ حسن
معتمد اعزازی

حرفِ چند

انسانی گویائی اور داستان گوئی کے آغاز کا درمیانی فاصلہ کتنے عرصے پر محیط ہے، یہ تو بتانا ممکن نہیں لیکن داستانوں پر تحقیق کرنے والے اس کو مختصر وقفہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق ''نطق کی صلاحیت اور قصہ گوئی میں فاصلہ ایک گام ہی تو ہے۔''

تحریر سے پہلے تقریر تھی، مکالمہ، بیانیہ اور شاعری تھی۔ معاشرتی حیوان کی بنیادی ضروریات میں ابلاغ ہمیشہ شامل رہا ہے۔ تمدن کی تاریخ دو بڑے دھاروں پر بہتی رہی۔ ایک طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تھا جس میں بھوک، موسم کی شدت اور ہر طرح کے حملہ آوروں سے بچاؤ شامل ہے۔ دوسرا دھارا روحانی تقاضوں، مثلاً مظاہرِ قدرت، کیفیات، رشتوں کی نوعیت سے منسلک رہا۔ مرد و عورت کا رشتہ، ماں اور بچے کی جبلّی محبت، مظاہرِ قدرت دیگر مخلوقات، دوست دشمن کا تعین ابتدائی انسان نے کیسے کیا ہوگا؟ غم اور خوشی کی کیفیات سے گزرتے ہوئے کتنی آوازیں نکالی ہوں گی۔ ہیولوں، سایوں اور ان دیکھی مخلوقات کا کیا تصور باندھا ہوگا۔ امکانات اور اندیشوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کیا کیا صورت ہوگی۔ یہ جاننے میں ہماری مددگار وہ اساطیری داستانیں اور قصہ کہانیاں ہیں جو ان کے بیان کرنے والے دوسروں تک منتقل کرتے رہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں نثری اور منظوم داستانوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔

تمدن کی ترقی کے ساتھ داستان گوئی کا فن پھلتا پھولتا رہا۔ قدیم عرب اور ایران میں یہ باقاعدہ پیشے کی صورت اختیار کر گیا۔ عرب میں دورِ جاہلیت میں قصہ خوانی کی محفلیں بڑے اہتمام سے سجتیں۔ قہوہ خانوں اور بازاروں میں قصہ سنانے والوں کو ''سامر'' اور قصے کو ''سمر'' کہا جاتا تھا۔ ایران میں بھی یہ رواج عام تھا۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس فن کو اپنایا۔ ایران کے قصہ خوانوں کا ذکر اور تاریخ، محمد حسین آزاد کی کتاب ''سخندانِ فارس'' میں موجود ہے۔

مغلیہ دور میں جہاں وسطی ایشیا خصوصاً ایران اور ترکی سے دیگر فنون ہندوستانی تہذیب کا حصہ بنے وہاں قصہ خوانی کا فن بھی بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں رسائی حاصل کر گیا اور صرف درباروں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ پشاور سے دلی اور لکھنؤ کے چوک اور بازاروں تک پہنچ گیا۔ ہندوستان کی زمین اس فن کے لیے زرخیز تھی کہ یہاں پہلے بھی اساطیر اور داستانوں کو سنانے کا رواج موجود تھا۔ قصہ خوانوں کے باب میں شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں ملازم ملا مرزا اسد بیگ شیرازی سے میر باقر علی تک متعدد نام تاریخ کے اوراق پر موجود ہیں مگر وہ ایک نام جو کسی بھی فن میں ایسا سنگ میل بن جاتا ہے جس سے سفر کا تعین کیا جا سکے، وہ میر باقر علی ہیں۔ میر باقر علی کو یہ فن ورثے میں ملا تھا اور ان کی باقاعدہ تربیت داستان گو کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اُن کے نانا امیر علی قلعے میں قصہ خواں تھے۔ اُن کے ماموں میر کاظم علی قصہ خوانی سے بڑھ کر داستان گوئی تک پہنچے۔

میر باقر علی نے خاندانی ورثے کو نہ صرف قبول کیا بلکہ داستانوں میں علمی رنگ بھی بھرا اور آخری عمر میں جب یہ فن ذریعۂ معاش نہ رہ سکا تو ان داستانوں کو تحریری شکل دے دی۔

قصہ خوانی سے داستان گوئی تک یہ فن سنانے والے کی صلاحیتِ بیان کا مرہونِ منت رہا ہے۔ اس میں ذخیرۂ الفاظ داستان کو آگے بڑھانے سے زیادہ واقعات کو مرقع کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں کھینچا ہوا یہ خاکہ سامع کے چشم تصور کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس خاکے میں رنگ داستان گو کی آواز، ادائی، مکالمات، حرکات و سکنات سے بھرا جاتا تھا۔ داستان گوئی کی مقبولیت نے ان داستانوں کو قلم بند کرنے کی جانب متوجہ کیا تو ابتدا میں یہ کام بھی دربار کی سرپرستی میں ہوا، بعد میں نول کشور پریس نے اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس پریس نے صرف داستانِ امیر حمزہ کی چھیالیس جلدیں مختلف داستان گو سے لکھوائیں اور شائع کیں۔

میر باقر علی کے ذکر کے ساتھ ان داستانوں کی تاریخ کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ انھیں اس فن پر آخری نام قرار دیا جاتا ہے مگر وقت کا سفر کب رُکا ہے۔ آج اکیسویں صدی میں اس فن کی بازیافت ہوئی ہے۔ ہندوستان میں علمی و ادبی خانوادوں کے دو چشم و چراغ محمود فاروقی اور سید دانش حسین نے داستان گوئی کے فن کو دوبارہ مقبولیت کی راہ پر گامزن کیا ہے پاکستان میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پرفارمنگ آرٹ (ناپا) نے بھی اس فن پر توجہ دی ہے۔ ان کے ادارے سے بھی باکمال نوجوان داستان گو سامنے آئے ہیں۔

داستان گوئی کی بازیافت نے ایک مرتبہ پھر پرانی داستانوں کی طرف رُخ کرنے پر اُکسایا ہے۔ شاعر و محقق عقیل عباس جعفری نے بڑی محنت سے میر باقر علی کی زندگی اور فن کا احاطہ کرنے والے مضامین جمع کرنے کے ساتھ ان کی مطبوعہ داستانوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس امر کو مقدم جانا کہ انھیں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔

ضیا محی الدین

پیش لفظ

میر باقر علی کے بارے میں جو کچھ میں نے سنا یا پڑھا اس سے مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اداکار تھے۔ بڑے اداکار۔۔۔ وہ اسٹیج پر اپنا کام دکھاتے تو Kemble اور Keen کے ہم پلہ ہوتے۔ انہوں نے ڈرامے کی بجائے داستان گوئی پر اپنی توجہ صرف کی اور اس طرح کہ ان کے اپنے عہد میں کوئی اور ان کا پاسنگ نہ تھا۔

اداکار (خواہ وہ داستاں گو ہی کیوں نہ ہو) کے پاس صرف دو ساز ہیں۔۔۔ اس کی آواز اور اس کا جسم۔ آواز کی تربیت پانے والوں کو ایسی مشقوں سے گزرنا پڑتا ہے جن سے جسم میں لچک پیدا کی جا سکے تاکہ انہیں اپنے اعضا پر قابو پانے میں آسانی ہو۔ اور ایسی مشقیں بھی جو آواز کو پھیلانے (Project کرنے) میں مددگار ثابت ہو۔ لیکن یہ مشقیں محنت مانگتی ہیں۔ محنت ہی نہیں مشقت مانگتی ہیں۔۔۔ جو ہمت والے فنکار ہیں اور تندہی سے یہ مشقت اٹھاتے ہیں وہ آواز کا جادو جگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔۔۔ آواز کی پرداخت صرف کسی تربیت گاہ تک ہی محدود نہیں رہتی۔ ایک حساس، پیشہ ور اداکار (یا داستاں گو) ان کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیتا ہے اور آواز کی گاڑی کو تیل دیتا رہتا ہے کیونکہ آواز کو کسی وقت زنگ بھی لگ سکتا ہے۔

داستاں گو کے لیے آواز سے بڑھ کر کوئی آلہ ایسا نہیں جو اس کو منفرد یا ممتاز بنا سکے۔ جب میں یہ پڑھتا ہوں کہ "تلفظ، الفاظ کی اونچ نیچ کو چھوڑ کر میر باقر علی اپنی آواز کے زیر و بم لب و لہجے کے اُتار چڑھاؤ اور موقع کی مناسبت سے ہر کردار کی ایسی نقل اُتارتے خود تصویر بن جاتے"۔ اور جب میں یہ بھی سنتا ہوں کہ ایسا کرنے میں وہ بھونڈے پن کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ مقام انہوں نے صرف ریاضت سے پایا ہوگا، ایسی پختہ ریاضت جس میں تہذیب بھی شامل ہوتی ہے کیونکہ آواز کی پرداخت کے بعد ہی آواز میں وہ لوچ، وہ کھنک پن اور استقامت پیدا ہوتی ہے کہ اداکار ایک باوقار آدمی کے انداز گفتگو اور اس کا لہجہ ایک بھڑ بھونجے کے

لہجے میں سہولت سے بدل سکتا ہے۔

جو قصے وہ بیان کرتے تھے ان میں بیسیوں ایسے حصے ہیں جہاں ایک فقرہ تین، چار، پانچ سطروں سے کم کا نہ ہوتا تھا۔۔ایسے فقرے کو بیچ میں توڑنا (سانس بھرنے کے لئے) ایک گناہ کبیرہ ہے۔ اداکار اگر سانس بھرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو وہ اقتباس پھسپھسا ہو کر رہ جاتا ہے۔۔یہ صرف وہی منجھا ہوا اداکار بول سکتا ہے جو سانس کے اخراج کا منبع (diaphram) اور اس کی تکنیک پہ عبور رکھتا ہو۔

ایک بڑے اداکار کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ وہ مختلف علوم پر بھی قادر ہو لیکن میر باقر علی کی جودت نے انہیں اُکسایا کہ وہ ان تمام چیزوں پر دسترس حاصل کریں جن کا ذکر داستانوں میں بار بار آتا ہے۔۔مثلاً خواتین کے بناؤ سنگھار کے آداب، ایک ایک زیور کی ہئیت سے واقفیت۔۔جنگ میں کام آنے والے تمام ہتھیاروں کا علم، پتنگ بازی کے رموز۔۔پہلوانوں کے داؤ پیچ۔۔بھٹیاروں کے رہن سہن کے اطوار، عیاروں کی تمام چالبازیوں سے گہری واقفیت، اور سب سے بڑھکر علم طب۔۔انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ ان تمام چیزوں کو ذہن میں بٹھانے کے لئے انہوں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے، داستاں گوئی کی تربیت انہوں نے اپنے ماموں سے پائی اور ذخیرۂ الفاظ بھی شاید انہیں ورثے میں ملا لیکن "مقرر کائنات" بننا ان کی اپنی اُپج کا کمال ہے۔

سنا ہے کہ ان کی آواز کی ایک ریکارڈنگ ہندوستان میں کسی کے پاس محفوظ ہے، یقین نہیں آتا کیونکہ ان کے عروج کے زمانے میں ابھی آواز ریکارڈ کرانے کی مشین، ایجاد نہ ہوئی تھی۔ میر صاحب نے اٹھتر برس کی عمر میں وفات پائی۔۔ہوسکتا ہے 1925/26 میں کسی غیر پیشہ ور نے ان کی گفتگو کو پانچ منٹ والے توے میں محفوظ کرلیا ہو۔۔کاش مجھے یہ توفیق ہو کہ میں بھی اسے سن پاؤں۔

عقیل عباس جعفری ان محققوں میں سے ہیں جو چپ چاپ، بغیر کسی نمود کے، تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کتاب کو تیار کر کے اُردو کے چاہنے والوں پر انہوں نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ نادر کتابیں چھاپنا انجمن ترقی اردو کا شیوہ ہے۔ "میر باقر علی داستان گو" ان کی فہرست مطبوعات میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا۔

عقیل عباس جعفری

کتاب بیتی

ملا واحدی، اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے خاکے میر باقر علی داستان گو سے تعارف کا پہلا ذریعہ بنے تھے۔ 16 فروری 1928ء کو دہلی میں پیوند خاک ہونے والے دلی کے اس آخری داستان گو کی قبر بھی 1947ء میں بے نام ونشان ہو گئی۔ نہ داستان گو رہا اور نہ اس کی داستانیں۔ دلی کے لکھنے والے اگر اس کا احوال اپنی تحریروں میں رقم نہ کرتے یا ان کے داماد صغیر حسین نقوی ان کے حالات زندگی محفوظ نہ کرتے تو شاید آج ہم میں سے کوئی بھی اس یکتا و یگانہ داستان گو کے نام سے واقف نہ ہوتا۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں دلی سے دو داستان گو اٹھے اور انھوں نے داستان گوئی کے فن کو از سر نو زندہ کر دیا۔ یہ دانش حسین اور محمود فاروقی تھے۔ پھر یہ دونوں داستان گو دنیا بھر میں اپنے فن کا جادو بکھیرنے لگے۔ داستان گوئی کا فن زندہ ہوا تو میر باقر علی داستان گو کا نام بھی فضا میں دوبارہ گونجنے لگا۔

اب سوچا گیا کہ کیوں نہ میر صاحب کا احوال بھی تلاش کیا جائے اور ان کی داستانوں کو بھی کھوجا جائے۔ مرحوم دلی کے لکھاریوں کی کتابوں میں داستان گوئی کے فن کے بارے میں بھی مضامین موجود تھے اور تقریباً ہر بڑے لکھنے والے نے میر باقر علی داستان گو کا خاکہ بھی رقم کیا تھا۔ ایسے میں اردو ڈکشنری بورڈ اور انجمن ترقی اردو، پاکستان سے بھی مدد ملی۔ میر باقر علی کی شائع کردہ چند داستانیں وہاں سے بہم ہوئیں۔ ایک داستان حسین فراقی نے عطا کی اور ایک آدھ داستان نٹ پاتھ یا ترا سے ملی۔ دلی سے چھپی ہوئی ایک نئی کتاب داستان گوئی کی مدد سے نہ صرف اس فن کو نئی زندگی دینے والے افراد سے تعارف حاصل ہوا بلکہ ان کی ایک طبع زاد داستان بھی دست یاب ہوئی۔ لاہور کے نوجوان صحافی محمود الحسن نے کتاب میں دانش حسین سے لیے گئے انٹرویو کی شمولیت کی اجازت عطا کی۔ فہیم شناس کاظمی نے عزیز حامد مدنی کی ایک نظم بہم پہنچائی اور یوں یہ کتاب ترتیب پا گئی۔

اپریل 2014ء میں اسلام آباد میں عالمی یوم کتاب کے میلے میں، میں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی

معتمد اعزازی ڈاکٹر فاطمہ حسن سے اس کتاب کا سرسری سا ذکر کیا تو انھوں نے اس کتاب کو نہ صرف اپنے ادارے کی جانب سے شائع کرنے کی پیش کش کی بلکہ اپنے ادارے کے تمام وسائل یک جا کر کے اسے اس قدر جلد آپ تک پہنچا بھی دیا۔

میں جناب ضیا محی الدین کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں، جنھوں نے اس کتاب کے لیے پیش لفظ تحریر کیا اور یوں کتاب کی افادیت میں بیش بہا اضافے کا سبب بنے۔ میں مجلس ترقی ادب، لاہور کا بھی ممنون ہوں، جس کی شائع کردہ داستان 'کالا باتی' کے کچھ ٹکڑے اور محمد سلیم الرحمن کے تعارفی نوٹ کا اقتباس کتاب کا حصہ بنے۔ یار دیرینہ عقیل صدیقی کا بھی احسان مند ہوں، جن کی وساطت سے میری رسائی اردو ڈکشنری بورڈ کے کتب خانے تک ہوئی۔ راشد اشرف، حسنین جمال، حماد ناصر، محمد امجد، ظہیر عباس، محمد زبیر اور احمد سلیم کا بھی ممنون ہوں جو اس کتاب کی اشاعت میں نہ صرف دل چسپی لیتے رہے بلکہ اس کتاب کے لیے وقتاً فوقتاً اہم لوازمہ بھی فراہم کرتے رہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ترتیب

داستان گوئی ...

میر باقر علی داستان گو ...

داستانیں ...

عہد حاضر ...

داستان گوئی

داستان گوئی کا فن

مہیشور دیال

تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بہت قدیم زمانے میں، خاص طور پر مشرقی ملکوں میں، مشکل فلسفوں اور گہری مذہبی تعلیمات کو صرف زبان سے بیان کیا جاتا تھا اور صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح سے انسان کا تہذیبی سرمایہ ذہن و دماغ کے راستے سے، بغیر کسی تحریر کے ایک سے دوسرے کو پہنچتا رہا۔ جب اتنی بڑی بات انسانی پہنچ سے باہر نہیں تھی تو داستانوں کو اس طرح زبانی بیان کرنا اور محفوظ رکھنا تو ایک معمولی بات تھی۔ پرانے وقتوں میں جہاں شام کا دھندلکا چھاتا تو بچے اپنی دادی ماں کے گرد کہانی سننے کے لیے اکٹھے ہو جاتے۔ اکثر چھوٹے بچے کہانی سنتے سنتے ہی سو جاتے۔ یہ کہانیاں لمبی بھی ہوتی تھیں اور چھوٹی بھی، مگر سب کی سب دلچسپ ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے بچے لمبی کہانیاں دے سنانا ہی پسند کرتے تھے جس میں ان کے اس جذبے کی کہ "آگے کیا ہوگا؟" کبھی تسکین نہ ہو یا بہت دیر سے ہو۔ بچے بار بار پوچھتے "تو پھر کیا ہوا؟" جب کہانی ختم ہو جاتی تھی تو بچے انگڑائی لے کر مسکرا اٹھتے تھے لیکن دل میں یہ خیال چٹکیاں لیتا رہتا کہ کاش کہانی ابھی ختم نہ ہوتی۔ اس وقت کی ولی کی گھریلو زندگی کا یہ بڑا خوشگوار پہلو تھا اور پھر یہ کہانیاں بچوں کو یونہی بے مقصد نہیں سنائی جاتی تھیں بلکہ ان کے ذریعے بچوں کو دنیاداری، پیار محبت، بہادری اور دلیری، نیکی اور اپنے مذہب اور ریت رواجوں کی جانکاری اور تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کہانیوں کا قدرتی طور پر بچوں پر بڑا اثر پڑتا تھا اور بچے بعد میں بھی جب آپس میں کھیلتے تو ان کہانیوں کے بادشاہ، شہزادوں اور پریوں وغیرہ کا ذکر کرتے اور بعض مرتبہ ان کے جیسی ہی اداکاری کرتے۔ ان کہانیوں کو سننے کے لیے صرف بچے ہی نہیں بلکہ گھر کے نوکر اور نوکرانیاں اور اکثر محلے کا چوکیدار تک آ جاتا تھا۔

قصہ گوئی انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ہم دن رات چھوٹے چھوٹے قصے ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں، کچھ اصلی، کچھ من گھڑت اور کچھ سنے سنائے، ایسا شروع سے ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

داستان گوئی ایک فن اور پیشے کا روپ اختیار کر گئی۔ ہندوستان کے کونے کونے میں آج بھی دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھانڈ، نقال اور فقیر، سفر میں اور گا گا کر پرانے قصے سناتے ہیں، مگر چونکہ دلی، ادب اور تہذیب کا گہوارہ رہی ہے، داستان گوئی یہاں ایک الگ فن ہو گئی اور داستانوں کے بیان کے لیے اعلیٰ اور منجی ہوئی زبان استعمال ہونے لگی۔ داستان گو بڑے مقبول ہو گئے اور انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ کچھ داستانیں حقیقت پر بھی مبنی ہوتی تھیں، خاص طور تاریخی حکایتیں اور کچھ داستانیں محض خیال کی پیداوار ہوتی تھیں، جن میں مبالغے سے بڑا کام لیا جاتا تھا۔ یہ جنوں، پریوں اور ایسے بادشاہوں اور شہزادوں کی کہانیاں ہوتی تھیں جو عجیب وغریب طاقتوں کے مالک ہوتے تھے اور جنھیں جنگ میں فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اپنے طلسماتی اور ہوش اڑانے والے واقعات کی بنا پر یہ بے حد دلچسپ ہوتی تھیں۔ سننے والے بڑی لگن اور دلچسپی سے سنتے رہتے اور ایسا محسوس کرتے کہ سارے واقعات ان کے سامنے ہو رہے ہیں، بعض مرتبہ تو ان پر اتنا اثر ہوتا کہ وہ یہ سوچنے لگتے کہ یہ سب کچھ ان پر ہی بیت رہا ہے۔

مغلوں کے زمانے میں داستان گوئی کو بڑا فروغ ملا اور مغل بادشاہوں اور امرا نے اس کی سرپرستی کی۔ فارغ البالی کا زمانہ تھا اور لوگ قدر دان تھے۔ کسی شخص میں کوئی خوبی ہوتی تو اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا۔ عمدہ داستان گو اپنے فن کا مظاہرہ شاہی دربار میں بھی کرتے تھے۔ جن داستان گو فن کاروں کی دربار تک رسائی نہ ہوتی وہ عوام کو لطف اندوز کرتے۔ ایسے داستان گو مخصوص مقامات پر اپنے آپ کو جما لیتے تھے، جیسے جامع مسجد کی سیڑھیاں، یا کوئی چوک چوراہا اور یا کسی امیر کی بیٹھک۔ داستان سننے کے شوقین وقت مقررہ سے بہت پہلے ہی پہنچ جاتے اور داستان گو کے سامنے بیٹھ جاتے۔ جہاں تک معلوم کیا جا سکا ہے کسی داستان گو کو اپنے فن کا مظاہرے سے مالی نفع یا آمدنی مقصود نہیں تھی اور نہ انھیں اس سے کوئی باقاعدہ آمدنی ہوتی تھی جس سے گزر اوقات ہو سکے۔ ہاں شاہی خاندان کے افراد، امیر اور شوقین لوگ داستان کے اختتام پر خوشی سے کچھ نقدی انعام اور دل بڑھاوے کے طور پر دے دیتے تھے جنھیں داستان گو قبول کر لیتے تھے۔ البتہ شاہی دربار سے وابستہ داستان گو کو ایک باقاعدہ وظیفہ یا تنخواہ ملتی تھی۔

داستان گو اپنی داستان کے لیے ایک دن مقرر کر دیتا تھا۔ عموماً جمعرات کے دن وہ اپنی داستان سناتا اور اس روز ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو جاتی۔ ایک چھوٹے سے چاندی کے پیالے میں گھولوا (افیم سے تیار کیا ہوا) داستان گو کو سب سے پہلے پیش کیا جاتا۔ وہ اس میں سے ایک چسکی لے کر چینا بیگم کو دوسروں کی طرف بڑھا دیتا۔ اس کے بعد داستان گو اپنی داستان شروع کرتا اور افیم کی چسکیوں کے درمیان یہ داستان صبح کی نماز کی اذان تک چلتی رہتی۔ داستان سننے میں لوگ اتنا کھو جاتے کہ مجال ہے کہ کوئی سننے والا آنکھ بھی جھپک لے۔

داستان گو اپنی داستان کو ایک انتہائی دلچسپ موڑ پر اس دن کے لیے چھوڑ دیتا اور ساتھ ہی صبح کی نماز کی مسجد سے اذان سنائی دینے لگتی۔ داستان گو ایک انگڑائی لے کر کہتا "باقی داستان اگلی جمعرات کو سناؤں گا۔ خدا حافظ"۔

لوگ اپنے اپنے کپڑے سنبھال کر گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر سوئیں گے اور اپنی نیند پوری کریں گے۔ ویسے بھی جمعہ ہے اور یہ دلی میں بازاروں اور سرکاری محکموں کے لیے تعطیل کا دن ہے۔ داستان گو فیم کی ایک چسکی لے کر اپنے آپ کو سمیٹتا ہے۔ سننے والوں کے ذہن میں داستان کو یہ انتہائی دلچسپ موڑ بار بار ابھرتا ہے اور وہ اسی لمحے سے اگلی جمعرات کی شام کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ہر داستان مہینوں چلتی رہتی۔ کئی داستان گو ایک شام کی داستان ختم کرنے کے بعد فارسی میں کہتے "باقی داستان فردائے شب را"۔

ہر داستان گو کا انداز بیان الگ ہوتا تھا مگر ہر انداز لازماً بڑا پر اثر اور ڈرامائی ہوتا تھا۔ داستان گو کی آواز بھاری، گونج دار اور بلند ہوتی تھی۔ اگر داستان میں مکالمے آ جاتے تو داستان گو کا لہجہ کردار کے مطابق بدل جاتا۔ دوسرے لفظوں میں داستان گو نہ صرف داستان بیان کرتا بلکہ اس میں ضرورت کے مطابق اداکاری سے بھی کام لے لیتا۔ اس کا الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑا وسیع ہوتا اور وہ ہر ممکن طریقے سے داستان کی دلچسپی کو قائم رکھتا۔

ہر داستان گو، داستان گوئی کی حد تک، زبان پر قدرت رکھتا تھا اور جو زبان اور محاورے وہ استعمال کرتا تھا ان کا عوام پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ انھیں عمدہ اور نئے الفاظ سننے کو ملتے تھے۔ داستان گو اپنی داستانوں کو جگہ جگہ مدتوں سناتا رہتا تھا اور وہ اسے زبانی یاد رہتی تھیں۔ کیا مجال ذرا سا بھی کہیں چوک جائے۔ بے وفائی اور بدبختی کے موضوعات پر داستانوں میں وہ اپنے طاقتور بیان سے سننے والوں پر رقت طاری کر دیتا تھا اور لوگ آنسو پونچھتے اور آہ بھرتے تھے۔ تفریح، مزاح اور تمسخر کے لیے وہ دوسرے حربے استعمال کرتا تھا، جن میں پھبتی اور ذومعنی فقروں کا استعمال شامل تھا۔ پھبتی کسنے کا ایک اپنا نرالا فن تھا اور اسے کسی کا مذاق اڑانے کے لیے ایک مہذب اور بے آزار طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ ذومعنی فقرات کو سن کر صرف وہی لوگ لطف اندوز ہوتے جو ان کے دوسرے معنوں کو جو پوشیدہ ہوتے تھے فوراً سمجھ جاتے تھے۔

موضوع کے اعتبار سے اس وقت کی داستانوں کو نیچے لکھی ہوئی چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- رزمیہ

2- حزنیہ یا نشاطیہ

3- عشق و محبت

4- فریب اور عیاری

اس وقت کی داستانوں کے مقبول ترین مجموعے یہ تھے۔ داستان امیر حمزہ، جو سب سے پہلے محمد تغلق کے زمانے میں امیر خسرو نے فارسی میں لکھی تھی۔ بعد میں اس کا ترجمہ شہنشاہ اکبر کی تفریح اور دل جوئی کے لیے فیضی نے کیا تھا۔ طلسم ہوشربا، عمر عیار، بوستان خیال (جس کا ترجمہ دلی کے خواجہ امن نے کیا تھا)، رانی کیتکی، بگل صنوبر اور گل

بکاؤلی۔ان میں سے بیشتر داستانیں اس اسلوب اور انداز بیان میں تھیں جس میں الف لیلیٰ کے مشہور قصے تھے۔

ہر داستان عجیب و غریب واقعات کے باوجود انسانی زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی کرتی تھی۔عموماً داستان کسی ایسے شہنشاہ کے ذکر سے شروع ہوتی تھی جس کے اقبال،شان وشوکت اور طاقت اور دولت کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا مگر جو زمانے کی پیرہ دستیوں سے کھنڈرات میں بدل جاتی ہیں۔ہر داستان میں ایک سبق پوشیدہ ہوتا تھا جیسے نیکی کی بدی پر فتح،بزدلی اور مکاری کی شجاعت کے ہاتھوں شکست۔اسلام اور کفر کی ٹکر میں اسلام کی فتح وغیرہ وغیرہ۔داستان گو موقعے اور محل کے مطابق اپنی داستان میں اشعار کا استعمال بھی کرتا تھا۔اس سے تاثر میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا تھا۔اشعار نثر کی یکسانیت کو توڑنے کا کام بھی کرتے تھے اور داستان کی دلچسپی بنی رہتی۔

داستان گوئی کے فن کو میر باقر علی نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔زبان پر بھی جو قدرت ان کو حاصل تھی اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ان کی ایک داستان کا ٹکڑا،فارسی آمیز زبان میں ملاحظہ کیجیے:

''کمترین یہ داستان فرحت عنوان یہاں سے گزارش کرتا ہے کہ دختر کو چک باختر و بالا باختر ختم ہو چکا ہے اور لقائے بے بقا رراندۂ درگاہ زمرد شاہ باختری مقابلہ جناب آفتاب عالم تاب دولت قاہرہ و ماہتاب جہاں افروز سلطنت باہرہ۔شکندۂ گردان،گردن کشان عالم،سلطان المعظم امیر المکرم صاحب قران عرب و عجم سے بھاگ چکا ہے اور بڑے بڑے مغرور دولت پر سر پر غرور خم کر چکے ہیں۔انہی ایام سرور انجام میں ایک روز کا ذکر ہے کہ میان بارگاہ سلیمانی،دربار جہاں بانی منعقد ہے اور قریب سو،سوا سو طائفہ ارباب نشاط حاضر۔تھاپ طبلوں پر پڑ رہی ہے۔آواز ہوشا ہوش و بادہ نوش کے ساتھ سارنگی کا لہرا اور بائیں کی گمک آسمان کو جا رہی ہے،طرح طرح کے باجے،الغوزے،بربط،بین،چنگ،دف،ڈھولک،رباب،سرنائی،سرسنگھار،طاؤس،ستار اور نسترن بج رہے ہیں۔ساقیان گل فام،جام و صراحی لیے ہوش اڑا رہے ہیں......اسی ہنگام عیش و نشاط میں دفعتاً ایک جوڑی عیاران طرار اور جاسوسان ہوشیار کی گردن میں آلودہ اور پسینے میں غرق بہ حضور شہنشاہ والا جاہ گیتی،ظل اللہ سلطان سعد بن قباد غازی حاضر ہوئے۔حد ادب سے زمین خدمت کو بوسہ دے کر دست بستہ عرض کیا۔

شاہا بقائے عمر تو بادہ ہزار سال ۔۔۔ لیکن بہ ایں حساب بصد حشمت و جمال
سالے ہزار ماہ و ہے صد ہزار روز ۔۔۔ روزے ہزار ساعت و ساعت ہزار سال

سرور عالم کی عمر دراز ہو،خانہ زاد حسب حکم عقب لقا باختری میں سرگرم رفتار تھے کہ ایک درہ کوہ شل ور فردوش نظر سے گزرا۔جب اس سے سربند کیا تو وہ عالم دیکھا کہ

شجر شجر سے ہویدا ہے رنگ بوقلموں ۔۔۔ چمن چمن ہے بنا رشک کلبۂ عطار
روش روش پہ درختان باغ استادہ ۔۔۔ قدم قدم پہ صنوبر جدا قطار قطار

بچھا ہے سبزۂ صحرا میں فرش مخمل سبز — کھنچا ہے روئے زمیں سائبان ابر بہار
ہر ایک غنچے سے پیدا ہے یار کی شوخی — ہر ایک گل سے ہویدا ہے رنگ و بوئے نگار
نسیم مست نکلتی ہے جوشِ مستی میں — لپٹ لپٹ کے جوانانِ باغ سے ہر بار
برنگ بادہ کشاں مست ہیں وحوش و طیور — مثال صوفی سرمست وجد میں اشجار

نمک خوار اس کیفیت و بہار میں مصروف تھے کہ سامنے سے ایک گرد تیرہ و رنگ بلند ہوئی۔ جب قریب اس گرد کے پہنچے تو دیکھا کہ کئی ہزار فیلان کوہ شکوہ مست و سر بلند جن کی جھل ہائے مکلل تا پاشنہ لٹکتی اور کاٹھیاں پولادی جوہر دار پشتوں پر کسی۔ ان پر دو دو جوانان زبردست سوار، ہاتھوں میں نشان سر بلند اور اعلام فلک پیوند سنبھالے، پھریرے ہوا سے اڑتے، گرد و پیش سانٹے مار، بھالے بردار، بان انداز، چرکٹے اگدا گد، بری بری غل مچاتے۔ ان کے بعد سانڈنی سوار، قطار در قطار سانڈنیوں کی گردنیں گودیوں میں لیے چوراسیاں لٹکتیں۔ گھنگرو بجتے، وردیاں شتری بانات کی پہنے، بتیاں سرگی سروں پر باندھے، پیچھے ان کے نیزہ بردار مرکبوں پر سوار۔ نیزوں سے نیستان پھولا نظر آتا تھا۔ ان کے بعد دو بادشاہ زبردست القاب و انصاف نام "تاج زریں بر سر، قبائیں شہنشاہی در بر۔ تیغ میں ان کے لقائے بے حیا ایک فیل کوہ پیکر سوار۔ عقب میں اس کے یعقوب شاہ بن لقا اور بختیارک بن بختک بن الغش بن مادرش بن سگ سفید .... اور القاب سے عرض کرتا جاتا تھا کہ خداوند امیر سے نام تقدیر جاہی لشکر خدا پرستان فرمایئے۔ لقا نے کہا کہ خداوندا درۂ آذر کوہ اور عطلیاباد میں تمہارے ہی ہاتھ پر بربادی ان نادیدہ خدا پرستوں کی کئی ہزار برس پہلے تقدیر فرما چکا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں عیار آداب بجا، پچھلے قدموں ہٹ رخصت ہوئے اور یہاں بادشاہ اسلام نے واسطے روانگی امیر کشور گیر کو ارشاد فرمایا۔ صاحب قرآن نے پہلوان عادی کو کہ ہر اول لشکر تھا حکم سنایا۔ پہلوان عادی سلام کر اپنے خیمے پر آئے اور دوسرے روز لشکر ظفر اثر اور فوج دریا موج جناب صاحب قران دوراں مع پانچ ہزار پانسو چھپن سرداران نامی، بہادران گرامی، دلیران صف شکن اور جوانانان تیغ زن، تین سو زنگی، چار سو فرنگی، پانسو مدائنی، چھ سو ہندی، سات سو حبشی، آٹھ سو ترکی، ایک ہزار عجمی، بارہ سو باختری، باقی شیران بیشہ عراق اور شاہزادگان آفاق جو خاص خاندان قریش سے تھے مع امیر نامدار و بادشاہ اسلام و مہر سپہر عیاری، قطب فلک خنجر گزاری، شاہنشاہ عیاران روزگار یعنی خواجہ عمر بن امیہ ضمیری نامدار اور شاگردان خاص چار مہتر، چودہ سرہنگ، ایک لاکھ اسی ہزار عیار دقائق مقام مہتر قران دا ولادھر روانہ ہوا .... بدیع الزماں کہ صاحب قران کشتی گیران میں ان کا وہ عالم ہے کہ ابھی گرد گل رخسار کے سبزۂ تو نے نمائش نہیں کی ہے۔ شعلہ حسن بے دود نظر آتا ہے۔ شجر قامت باغ نوجوانی میں ہنگام نوخیزی ہے اور غزال چشم شباب میں آمادۂ شوخی ہے ان کے دل میں شکار کی امنگ اٹھی۔ حکم کی دیر تھی کہ میر شکار نے جانوران صید گیر باز، جرہ، باشین، کوہی، کوہیلا، ترمتی،

سیاہ گوش، چیتے وغیرہ کو درست کر ر دولت شاہزادہ پر حاضر ہوئے اور ادھر ایک مرکب عیار قمار کہ سم جس کے فراخی سر طبل بیٹھے ہوئے آنکھیں ابلی ہوئی، جلد باریک، نعل ہلال عید، نتھنے سی تھوتھنی، کنوتیاں چھوٹی چھوٹی، کلائیاں شیر کی سی، گردن مور کی، پٹھے ہاتھی کے سے، کمر چیتے کی اور رفتار کا وہ حال کہ

گر کھڑا ہو مشرق میں اور سامنے ہو اس کے غرب

تک اسے راکب کہے اتنا کہ چل تو یاں سے واں

پہنچے پائے صدائے ہاں نہ منھ سے تا بہ لب

پہنچے ہے یہ باد پیماں یاں سے واں اور واں سے یاں"

اس دور میں امیر حمزہ کی داستانیں بڑی مقبول تھیں۔ ان میں بیان کیے ہوئے واقعات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے اور ان کی دلچسپی آخر تک بنی رہتی تھی۔ داستان گو ان کہانیوں کو اصل کتابوں سے ازبر یاد بھی کر لیتے تھے اور اپنی طرف سے دلچسپی کو بڑھانے کے لیے اضافہ بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کہانیوں کی زبان کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مغل دور میں خواندہ اور ناخواندہ عوام کی فارسی آمیز مشکل اردو کو سمجھنے کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ امیر حمزہ کی داستانوں کے دو ٹکڑے، جو دلی کے عوام میں مقبول تھیں اور جنھیں داستان گو اکثر سناتے تھے، نیچے پیش کیے جاتے ہیں:

"جب کہ نو مہینے گزر گئے، ایک روز گھڑی بھر دن چڑھا تھا کہ محل کے اندر سے ایک خواجہ سرا آیا اور کچھ آہستہ سے بادشاہ کے کان میں کہہ کر چلا گیا۔ بادشاہ نے اسی وقت دیوان برخاست کر کے خلوت کیا اور خواجہ بزر جمہر کو بلوا بھیجا اور فرمایا تم ساعت کو تولد کی سادھو، ہمارے گھر میں لڑکا ہوا چاہتا ہے۔ بزرجمہر نے واسطے دریافت کرنے وقت کے کئی گھڑیاں فرنگی و ہندی اپنے نزدیک رکھیں اور اضطراب ستاروں کے معلوم کرنے کو ایک طرف حاضر کیے تختہ اپنے روبرو رکھا، قرعہ اپنے ہاتھ میں لے کر زینت کی اور عین تولد کے وقت ڈالا۔ زائچہ لکھ کر صالح میں نظر کی تمام شکلوں کو خوب سا دیکھ کر بادشاہ کو مبارکباد دی اور کہا یہ بادشاہ زادہ ملک ایران میں ستر برس بادشاہت کرے گا بلکہ ہفت اقلیم سے خراج لے گا۔ پر ایک مصاحب بد کے سبب سے سرگردانی بھی بہت سی اٹھاوے گا۔ یہ کہہ کر فکر میں نام رکھنے کی گئے کہ کیا نام رکھیے۔ وہیں عیار آئے اور انھوں نے بادشاہ کو بعد دعا کے خبر دی وہ جو چشمہ نوس خاص کئی برس سے سوکھ گیا تھا آج خود بخود پانی آ گیا اور رواں ہوا۔ بزرجمہر نے بموجب اسی خوشخبری کے نوشیرواں نام رکھا اور بعضے راوی کہتے ہیں تولد کے وقت میں بادشاہ کے ہاتھ میں جام شراب کا تھا۔ بزرجمہر نے بزبان فارسی بادشاہ سے کہا اے قبلہ عالم نوش رواں کن اور مطابق اس مژدہ کے نوشیرواں نام رکھا۔ بادشاہ نے خواجہ بزرجمہر کو خلعت مرصع عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ نقار خانے اور توپ خانہ میں خبر دو کہ شلک ہو اور شادیانے بجیں۔ جونھی یہ خبر ہوئی توپ خانے میں لگی مبارکباد کی سلامی دغنے اور نقار خانے میں جہاں تک نقارچی تھے انھوں نے

زربفت کے تھانوں سے نوبت خانے کو منڈھ کر سائبان اور پردے جا دے کے باندھے اور سقرلات کی زرنگار کرتیاں گلوں میں پہن کر زری سرپیچ سروں پر باندھے ہوئے روپہیری نقاروں کی چوڑیاں سب نے اپنے آگے رکھیں اور زیلو کو سینک کر بم پر پانی چھڑکا۔ مرصع نگار چوبین اپنے اپنے ہاتھ میں لیں اور لگے بجانے۔ اس کی آواز ہر ایک غنی اور فقیر نے سنی، جہاں تک امرا و وزرا تھے سب نے مبارکباد کی نذریں بادشاہ کو دے کر تہنیت دی۔ بادشاہ نے نذریں لے کر موافق مرتبے کے خلعت دیا اور بغداد میں صحبت جشن کی آراستہ ہوئی۔ جہاں تک دعا گو تھے، حاضر ہوئے اور لگا مجرا ہونے۔ بھانڈ، بھگتیے، کشمیری قوال، ڈھاری، کلاونت بھی تھے اور رنڈیوں کے طائفے بھی حاضر ہوئے اور لگا مجرا ہونے۔ قانون، رباب، مردنگ، ستار، طنبورہ چنگ، مور چنگ، سارنگی، تال، کٹھال، پکھاوج، منڈول، ڈھولکی، جیلادہ، بربط، تنجری لگے بجنے اور ان کے سروں کے ساتھ وہ خوش آواز جہاں تک تھے ٹپہ، خیال، دھرپت، گیت سنگیت، بنک چنگل، بندترانہ، سرگم دستک فارسی، ٹھمری، کہروا، دادرا لگے گانے، راگ کا ایک عجیب طرح کا عالم ہوا اور کنچنیاں، ڈومنیں، میراثنیں، چونا والیاں، رام جنیاں، نٹنیاں آئیں۔ ہر ایک کا ہر ایک طرف لگا ناچ ہونے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس روز اتنا مال و زر انعام میں خرچ کیا کہ ہر ایک فقیر اپنے اپنے گھر میں آسودہ ہو گیا۔ ایک برس کی تمام ملک کی تحصیل رعیت کو معاف فرمائی۔

گیارھواں دن نوشیرواں کی تولد کو ہوا تھا کہ بادشاہ کو عین جشن میں خبر ہوئی کہ التمش کا نواسہ بختیارک کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔ بادشاہ نے سن کر بزرجمہر سے فرمایا یہ لڑکا تیرے دشمن کی اولاد میں سے ہے۔ اس کا نانا بھی تیرا دشمن تھا اور اگر یہ جیتا رہا تو مقرر تجھ سے دشمنی فرمائے گا۔ اس کو مار ڈال تا فتنہ باقی نہ رہے۔ اگر جیتا رہا تو بہت سے فساد برپا کرے گا۔ بزرجمہر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ بادشاہ کا اختر دولت ہمیشہ تابندہ رہے، جو ارشاد ہوا سو بجا ہے لیکن ابھی بے گناہ ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس پر مہربانی ہو۔ فرمایا مختار ہے لیکن آخر کو ایذا اٹھانی پڑے گی......"

امیر حمزہ کی ہی "اکیسویں داستان" کا یہ انتہائی دلچسپ اقتباس بھی دیکھیے:

"دوشنبہ قصہ کو یہاں تک عرض کیا تھا کہ امیر جشن میں رہے اور گستہم پہلو شکستہ لندھور کے روبرو سے بھاگا۔ ایک پہاڑ کے دامن میں جا کر اترا لیکن ہر روز امیر کی خبر منگوایا کرتا تھا۔ ان روزوں میں عیاروں نے یہ خبر دی کہ کئی روز سے لندھور نے امیر کی معہ تمام سرداروں ضیافت کی ہے۔ چنانچہ آج لشکر میں کوئی نہیں ہے۔ سوائے مقبل وفادار کے تمام لشکر خالی ہے۔ یہ نہایت خوش ہوا اور دو کنیزیں مہر نگار کی ہمراہ اپنے لایا تھا کہ امیر نے ان کو محل میں مہر نگار کے دیکھا تھا۔ ان کو اپنے نزدیک بٹھایا اور شیشے شراب کے منگوا کر ان کے اوپر نقلی مہر مہر نگار کی اور ایک خط اشتیاق کا ان کو لکھ کر دیا اور کہا تم اپنی صورت مردوں کی بنا کر ہتھیار لگاؤ اور یہ شیشے لے کر حمزہ کے لشکر میں جاؤ۔ مقبل طلایہ میں ہے اوس سے جا کر کہو کہ مہر نگار نے حمزہ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ البتہ لے جائے گا بس کسی طرح یہ شراب امیر کو پلاؤ اور تم جلد چلی آؤ لیکن

اس ولد الحرام نے اس شراب میں کئی شتقال زہر ہلاہل ملایا تھا۔ اگر قطرہ اس کا دریا میں گرے تو اس کنارے کی تمام مچھلیاں مرجائیں۔ وہ شیشہ ان کو حوالے کر کے تعظیم کیا اور لشکر اسلام کی طرف روانہ کیا۔ یہ دونوں بدذاتیں گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور لوازمہ مسافری کا اپنے ذات سے لگا کر اسی شب لشکر میں آئیں۔ طلایہ داروں نے ان کو روکا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آتے ہو۔ جواب دیا کہ ہم ایران سے آتے ہیں اور امیر کے پاس جائیں گے۔ وہ لوگ ان دونوں سواروں کو مقبل کے پاس لے گئے۔ مقبل نے ان سے پوچھا تمھارے آنے کا کیا سبب ہوا۔ کہا ہم کچھ مخفی احوال رکھتے ہیں خلوت میں کہیں گے۔ مقبل نے ان کو اپنے نزدیک بٹھلایا اور سب لوگوں کو کنارے کیا اور ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ان دونوں نے کہا ہم مہر نگار کی کنیزکیں ہیں، امیر ہمیں پہچانتے ہیں۔ ملکہ نے اپنی شراب خاص کی شیشی میں بھر کر کے بھیجی ہے اور یہ خط دیا ہے۔ ہم اس وقت یہاں کا احوال سن کر قافلے سے جدا ہو کر آئے ہیں۔ مقبل سن کر نہایت خوش ہوا اور کئی آدمی ان کے پاس بٹھلا کر لندہور کے لشکر کی طرف چلا۔ بارگاہ میں جا کر امیر کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔ آتش عشق مہر نگار کے سینہ میں مشتعل ہوئی تھی۔ اس نے دو سوار بھیجے ہیں۔ بے اختیار کھڑے ہو کر خسرو ہندوستان سے فرمایا تم مجلس اسی طرح رہنے دو، مجھے کچھ کام ضروری ہے۔ ایک ساعت میں آتا ہوں اور عمر سے کہا تم میرے عوض خسرو ہندوستان کی خدمت میں حاضر رہو کہ ناخوش نہ ہونے پاوے۔ یہ کہہ کر مقبل کے ہمراہ تنہا سوار ہو کر لشکر میں آئے اور خیمے میں جا کر اون دونوں کو بلوایا اور خلوت کی۔ دونوں نے مجرا کیا اور امیر کے روبرو وہ شیشی رکھ کر خط گزرانا۔ امیر نے اون دونوں کو دیکھا کہ واقعی مہر نگار کی کنیزکیں ہیں۔ خط کو لے کر دیکھا اور مہر نگار کی مہر کو لگے بوسے دینے۔ ان دونوں نے عرض کی کہ یہ شراب اپنے پینے کی خاطر بھیجی ہے۔ امیر نے ان شیشوں پر مہر دیکھی کر گئی ہے۔ ایک شیشہ کا منہ کھول کر شمع کی روشنی کی طرف ملایا اور یاد کر کے مہر نگار کو شیشہ منہ سے لگایا اور پی گئے۔ جونہی وہ شراب حلق سے تلے اتری ایک ہچکی امیر کو آئی اور گر کر بے ہوش ہو گئے۔ ان دونوں نے دیکھا کہ اس کا کام تمام ہوا، کئی میخیں خیمے کی اوکھاڑ کر پچھاڑی کی راہ سے بھاگیں اور یہاں ہر چند امیر نے ہاتھ پاؤں مارے پر کوئی اندر نہ آیا کہ مہر نگار کی کنیزوں کے ساتھ خدا جانے کیا باتیں کرتے ہیں۔ امیر نے یہاں تک بے قراری کی کہ قالین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور زمین میں گڑھے پڑ گئے......"

قوت بیان اور روانی کے اعتبار سے میر باقر علی اپنی داستانوں میں جادو نگاری کرتے تھے۔ داستانیں سب پرانی ہی ہوتی تھیں مگر میر باقر علی زیادہ تر اپنی زبان استعمال کرتے تھے اور ان کا طرز بیان بڑا دل نشین ہوتا تھا......

یہ دیکھیے ان کی جادو بیانی کا ایک نمونہ، ان کی داستان کے ایک ٹکڑے میں:

"ابھرا ابھرا سینہ، اٹھتی جوانی، آئینہ سا پیٹ، چیتے کی سی کمر۔

برس چندرہ کا یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

کاسنی جوڑا پہنے، جام شراب گلفام ہاتھ میں لیے، مخمور بادۂ نشاط پیچھے دو خواصیں پیشِ راں ہاتھوں میں، سامنے کچھ گائنیں ستار، تنبورہ، ڈھولک کے ساتھ دھیمے دھیمے سُروں میں چھوٹے چھوٹے ولس اور بھاگ کے خیال گا رہی ہیں۔ جونہی نگاہ شاہزادے کی اس جادو ادا پر پڑی، مرغ دل تیر نگاہ ناز کا شکار ہوا۔

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی　　وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

شاہزادہ شکار کی جستجو میں خود شکار ہو کر واپس آ رہا تھا کہ

سامنے سے ناگہاں اک طرفہ باغ آیا نظر

وصفِ شادابی میں ہے جس کی مری قاصر زباں

لغزش مستانہ دکھلانے لگا پائے خیال

بس کہ اس کی چار دیواری تھی صاف آئینہ ساں

اور قریب باغ ایک میدان وسیع میں اکثر خیمے، ڈیرے، قناتیں، چھولداریاں استادہ ہیں۔ شاہزادہ بدیع الزماں قریب ان خیموں کے آئے تھے کہ ایک عیار نے آگے بڑھ کر آواز دی "خبردار، ہوشیار۔ یہ لشکر رخشان تیغ زن کا ہے۔" شہزادے نے مرکب کو روک کر امیہ بن عمر سے کہا تم جا کر رخشان تیغ زن سے کہو، ہمارے سردار آپ سے ملاقات چاہتے ہیں……

بدیع الزماں مرکب بڑھا داخل لشکر ہوئے اور خیمہ رخشاں پر آ دیکھا کہ ایک جوان زبردست جس کا چھاتہ گردن تیار، مچھلیاں بازوؤں کی ابھری ہوئیں، رانیں سوئی، آنکھیں سرخ، قربان میں کمان ہزار تیر کا ترکش شکل دم طاؤس پیچھے پڑا، جوڑی خنجر آبدار کی کمر میں لگی، بڑی شان و شوکت سے بیٹھا ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شاگرد نے عرض کی کہ کسرت کا وقت آ گیا ہے۔ یہ سن کر رخشاں نے شہزادے سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔

قریب ہی زیر شامیانہ اکھاڑا بنا ہوا تھا جس میں پھڑیاں ہر چہار سمت، کسرت اور کشتی کی ہر شے رکھی تھی۔ شاگرد لنگر لنگوٹے باندھے کچھ ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہے تھے اور کچھ دوسری کسرتیں کر رہے تھے۔ رخشاں نے بدیع الزماں کو ایک دنگل پر بٹھایا۔ چند جام شراب پی، لباس اتار اکھاڑے میں اترا اور نہایت نخوت سے آواز دی کہ آؤ کون آتا ہے۔ آٹھ دس شاگرد آ کھڑے ہوئے اور رخشاں نے بیٹھ کر کہا آؤ چت کرو۔ وہ سب لپٹ گئے مگر رخشاں نے ایک ایک کو اٹھا کر پٹک دیا اور کھڑے ہو کر ہنکارا…… کہاں ہیں رستم و سہراب، اسفندیار و گودرز، حمزہ و بدیع الزماں۔ آئیں اور حلقہ میری بندگی کا اپنے کان میں ڈالیں۔ بدیع الزماں کو اس لاف کی کب تاب تھی، بولے اے جوان ایسی شیخی بہادروں کو سزاوار نہیں۔ رستم وغیرہ تو خیر اپنی جگہ ہیں، اگر آپ کہیں تو میں موجود ہوں، ہاتھ مل

جائیں۔ رخشاں نے ہنس کر کہا، آیئے۔ شہزادہ سامان کشتی سے آراستہ ہو کر سامنے آیا۔ طاقت آزمائی کے بعد بہت دیر تک داؤ پیچ ہوتے رہے۔ شاید ہی کوئی داؤ ایسا ہو کہ جو نہ کھیلا گیا ہو۔ آخر میں شہزادے نے رخشاں کی کمر بند زنجیر میں ہاتھ ڈال کر ایک ہی قوت میں سر سے بلند کیا اور نعرہ مارا کہ منم سرگروہ کشتی گیران جہاں بدیع الزماں۔

اب جو شاہزادہ لشکر گاہ اسلام میں پہنچا، خلوت ہوئی تو عشق نے زور باندھا، معشوقہ طناز کی یاد آئی۔ ہر چند ضبط کیا مگر کہیں عشق و مشک چھپتا ہے۔ ایک ہائے کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

یہ خبر خواجہ عمر بن امیہ تک پہنچی اور انھیں شاہزادے کے عشق میں مبتلا ہونے کی بھی آگہی ہوئی۔ فوراً بدیع الزماں کے خیمے میں پہنچے۔ شہزادے کو ہوش آیا، گھبرا کر پلنگ سے اترا اور شرمندہ شرمندہ سامنے بیٹھ گیا۔ امیر نامدار نے بھی زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ شہنشاہ نے جاتے ہوئے امیر نامدار سے کہا تم جا کر شہزادے کو سمجھاؤ کہ صاحبزادے ہم نے عالم شباب میں ایسے بہت کھیل کھیلے ہیں مگر انجام اس کا سوائے ذلت و خواری کے اور آہ و بے قراری کے کچھ نہ دیکھا کیونکہ معشوقان چمن روزگار ہفتہ دوستی میں مشاق ہیں۔

دم دلاسے میں لگانا دل تو ان کا کھیل ہے
روز کرنا اک شکار ان کی ہیں ادنیٰ شوخیاں
سن کے نالہ عاشقوں کا کہتے ہیں کیا راگ ہے
ذبح کر کے دیکھتے ہیں سیر رقص بسملاں

ہر داستان گو کی اپنی الگ زبان اور انداز بیان جدا ہوتا تھا مگر میر باقر علی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ 1857ء کے ہنگامے کے آس پاس کا زمانہ تھا اور فارسی کی جڑیں اس وقت بھی بڑی مضبوط تھیں۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ داستان گوئی کی زبان دلّی کے سب لوگ سمجھتے تھے، وہ بھی جو معمولی پیشوں کے آدمی تھے اور جن کا اکتساب علم برائے نام تھا۔ دلّی کی یہی فضا دلی کو علم وادب اور تہذیب کا مرکز بناتی تھی۔ اب تو داستان گوئی دلّی کی ثقافتی تاریخ کا ایک بھولا بسرا حصہ بن گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آنے والی نسلیں حیرت سے سوچیں گی کہ ہندوستان میں کبھی اس قسم کا فن بھی عروج پر تھا۔ دلّی کے اس وقت کے داستان گو بھی شاید یہ بات بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ دنیاوی جاہ و حشمت کے جس عروج و زوال، زمانے کی جن نیرنگیوں اور چیرہ دستیوں کا وہ اپنی داستانوں میں ذکر کر رہے ہیں، ان کا فن بھی ان کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے تاریخ کی گود میں سما جائے گا!

عالم میں انتخاب.....دلّی
میشو رو یال
اردو اکادمی، دلّی

داستان گوئی

شاہد احمد دہلوی

"چڑا لایا چانول کا دانہ، چڑیا لائی دال کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی"۔ کون ہے جس نے اپنے بچپن میں شوق سے یہ کہانی نہ سنی ہو۔ اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی دل چسپ کہانیاں ہمارے بچپن کے تخیل کو رنگین بناتی تھیں اور ہم چڑے چڑیا کی دنیا میں ایسے کھو جاتے تھے کہ بالآخر سو جاتے تھے۔ اس کے بعد بادشاہوں کی کہانیاں، دیو اور جن اور پریوں کی کہانیاں، ہماری دل کشی کا سبب بنیں اور انھیں سننے کے لیے پہاڑ سا دن ہمیں کاٹنا پڑتا۔ دن کو اگر کہانی سنائی جائے تو مسافر راستہ بھول جائیں۔ خدا خدا کر کے رات اپنے ساتھ راحت کا پیغام لاتی اور بچے کھانے پینے سے فارغ ہو گھر کی بڑی بوڑھی کو گھیر کو بیٹھ جاتے اور بڑی بی مزے لے لے کر کہانیاں سناتیں۔ سننے والوں کا ہنکارہ چل رہا ہے، لو صاحب انھیں تو نیند آنے لگی۔ ایک اونگھ رہا ہے، دوسرے پر غنودگی طاری ہے۔ تیسرا نیند میں جھونٹے کھا رہا ہے، غرض ایک ایک کر کے سب کی آنکھ لگ گئی اور لال پری اور کالے دیو کی کانوں سنی باتیں خواب کی دنیا میں آنکھوں دیکھی ہونے لگیں۔ بڑی بی کی کہانیاں کچھ ایسا جادو جگاتی تھیں کہ دو ایک ہی کہانیوں میں بچوں کی آنکھوں میں نیند کھلنے لگتی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب سو جاتے۔

بچپن میں مہمل سی کہانیاں بھی لطف دیتی ہیں۔ ان کہانیوں نے ہمارے لیے تخیل کی ایک عجیب دنیا آباد کی اور ہماری متخیلہ تجسس کے پروں پر اس انجان دنیا کی سیر ہمیں کراتی پھری۔ یہ خواب ناک دنیا ہمارے لیے ایک حقیقی دنیا بنی ہوئی تھی۔ پختہ شعور سے محروم ہونے کی وجہ سے عقل کی کسوٹی پر وہم کا کس نہیں لگایا گیا تھا۔ اور جب عقل کا چراغ روشن ہوا تو خیال کا دیا مدھم پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ٹمٹما کر بجھ گیا۔ مگر ذوق تجسس اور شوق فرار جو بچپن کا خاصہ ہے یک سر معدوم نہیں ہو جاتا۔ یہ ہر عمر کے انسان میں قائم رہتا ہے۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ آدمی ایک بڑا بچہ ہے۔ اور ایک شاعر کہتا ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے۔ بچپن کی خواہشات و احساسات عمر کے ہر حصے میں قائم

رہتے ہیں اور انھی سے زندگی کی تلخیوں میں شیرینی اور پریشانیوں میں سکون پیدا ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انھی کا وجود زندگی کی خوش گواری کا ضامن ہے ورنہ جینا دوبھر ہو جائے۔

ہر چند کہ شعور و عقل نے منطقی استدلال کی شمع روشن کر دی اور وہم و خیال کے اندھیرے کو دور کر دیا اور ہم چڑے چڑیا کی کہانی کو ایک فضول سی چیز سمجھنے لگے لیکن بچپن کی تصویر زائی کا سکہ پھر بھی ہمارے دلوں پر جما رہا اور جب کبھی بھی موقع ملا کسی اور ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہو گیا۔ چڑے چڑیا کی کہانی نے آگے چل کر "داستان امیر حمزہ" جیسی داستانوں کا روپ دھارا۔ دل بہلانے کا ذریعہ گھریلو کہانی کے بدلے داستان بنی، کہانیوں کو چھوڑا تو داستانوں کا طریقہ ایجاد کیا۔ دن بھر کے تھکے ہوئے دماغ کو آرام پہنچانے کے لیے کہانی کسی نہ کسی روپ میں درکار تھی، چناں چہ داستان گوئی ایک فن کی حیثیت سے وجود میں آئی۔

داستان کہانی ہی کی ایک بہت ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس میں بھی عجیب و غریب واقعات اور ان ہونی باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایسی باتیں جنھیں عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی لیکن پیرایہ بیان اس درجہ دل کش ہوتا ہے کہ سننے والے اس میں محو ہو جاتے ہیں اور اس کی قوت ممیزہ وسلب ہو جاتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ فن کی کام یابی اس کی دل کشی میں پوشیدہ ہے۔ گوئٹے کا قول ہے کہ فن کی انتہا "حیرت" ہے۔ داستان میں یہ دونوں خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اجنبی فضا، فوق الفطرت کردار، جادو، عیاری، مکاری اور ان سب پر مستزاد داستان کہنے کا طریقہ ان سب عناصر میں اتنی دل کشی اور اتنی حیرت خیزی ہوتی ہے کہ سننے والے ششدر رہ جاتے ہیں اور اس جادو کی دنیا میں پہنچ کر مسحور ہو جاتے ہیں۔

داستان گوئی کی ابتدا کے متعلق قیاس کہتا ہے کہ انسان نے جب سے ٹولیاں بنا کے رہنا شروع کیا ہوگا اور اظہار خیالات کے لیے کوئی ذریعہ بیان وضع ہو گیا ہوگا اسی وقت سے داستان گوئی بھی وجود میں آئی ہوگی۔ ہر ایک اور ہر قوم میں داستانوں کا وجود کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ عرب کے زمانہ جاہلیت میں داستان سرائی کا یہ طریقہ تھا کہ طعام شب سے فارغ ہو کر سننے والے کسی کھلے مقام پر ریت پر آ بیٹھتے، چاند کھیت کرتا، نبیذ کا دور چلتا اور داستان گو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا۔ داستان کا ایک حصہ ختم ہونے پر محفل برخاست ہوتی اور داستان گو اجرت کی کھجوریں سنبھالتا اپنے گھر کا راستہ لیتا۔ جب تک چاندنی راتیں رہتیں یہ مشغلہ جاری رہتا۔ انگلستان میں بادشاہ آرتھر اور ان کی گول میز کے سورما داستان کا موضوع خاص تھے۔ فرانس میں شارلی مین اور اس کے سورماؤں کے کارنامے داستان سراؤں کے ورد زباں تھے۔ ایران میں داستان کے ہیرو امیر حمزہ اور ان کے رفقا تھے۔ ہندوستان میں راجہ رسالو کی شجاعت کی داستانیں اور آلہا اودل کے رزمیہ کارنامے آج تک لاکھوں سننے والوں کی دل چسپی کا سبب ہیں۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ایرانی داستان طرازی و داستان گوئی نے ہند میں رواج

پایا۔ ایک روایت ہے کہ اکبر اعظم کے دربار میں ایک شخص امیر خسرو نے فارسی میں داستان امیر حمزہ لکھی، اور اردو کی موجودہ داستان امیر حمزہ کو اسی کا بنیادی تصور سمجھنا چاہیے۔

داستان سننے کا رواج تو قدیم سے چلا آتا ہے لیکن داستان گوئی کو ایک مستقل فن کی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب سرکاروں درباروں میں داستان گو باریاب ہونے لگے اور شاہی داستان گو بڑی بڑی تن خواہوں پر ملازم رکھے جانے لگے۔ بادشاہوں اور امرا کی عیش پرستی کے مشاغل میں داستانیں سننے کا اور اضافہ ہوا۔ سونے لیٹتے تو داستان گو اپنے بیان کا جادو جگاتا اور بالآخر داستان ان کے لیے ایک خواب آور لوری بن جاتی۔

داستان گو، یوں تو ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے لیکن خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہوں کے زمانے میں چاروں طرف سے کھنچ کر دلّی میں جمع ہو گئے تھے۔ یہاں بادشاہ اور امرا شاد و آباد تھے۔ دولت فراواں تھی۔ اہل کمال روٹیوں کو محتاج آتے اور یہاں قدر دانی کے ہاتھوں مالا مال ہو جاتے۔ فنون دل بستگی کے پودے بھی وہیں پنپتے ہیں جہاں سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے۔ جب دلّی میں خزاں آئی تو لکھنؤ میں بہار آئی اور یہاں کے اہل کمال پورب میں جا بسے۔ شاہان اودھ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور دلی کے سارے نقشے لکھنؤ میں جم گئے۔ بادشاہوں اور نوابوں کا ذکر ہی کیا، عوام کا یہ حال تھا کہ دس یار دوست رات کو کسی جگہ جمع ہو گئے۔ کوئی کنا چھیل رہا ہے، کوئی شیرینی کا دونا لیے بیٹھا ہے اور پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔ ایک طرف چائے کی دیگچی انگیٹھی پر چڑھی ہوئی ہے اور داستان گو یوں رطب لسانی میں مصروف ہے۔

"مخمور پر ایک تو مار پڑی ہے اور دوسرے یاد اپنے گل عذار کی دل سے لگی ہے۔ بے تاب اور بے قرار مثل عندلیب زار بال کھولے، نالہ و شیون کرتی چمنستان میں آئی اور چبوترہ بلوریں پر جو وسط باغ میں بنا تھا، فرش مکلّف بچھا، وہاں آ کر بیٹھی کہ خاطر مضطر تسلی یاب ہو لیکن سیر گلزار نے اور زیادہ ہوائے عشق بڑھائی۔ وہ گل بدن بے کلی سے گھبرائی جب یاد قامت یار آئی صورت سردار دکھائی دی۔ چشم نرگس کو دیدۂ حیراں سمجھی، زلف سنبل کو گیسوئے پریشاں سمجھی، نخل ماتم نظر آیا۔ گل کو اپنے لخت جگر سے مشابہ پایا۔ قصہ مختصر نسریں عذار با دل خار خار، سینہ فگار، یاد محبوب گل اندام میں اس طرح بے قرار تھی آخر وہاں سے اٹھ کر بارہ دری میں آ کر پلنگ پر گری۔ حرارت عشق کی تپ چڑھی۔ دین و دنیا کی خبر نہ رہی۔ سارا دن مثل مردے کے پڑی رہی۔"

سننے والے افیون کی چسکی لگاتے جاتے ہیں اور واہ وا سبحان اللہ کہتے جاتے ہیں۔ داستان گو بڑا مزاج شناس ہے اور ہوا کا رُخ دیکھ کر بات کرتا ہے۔ کوئی بات اپنی داستان میں ایسی نہیں آنے دیتا جس سے اس کے سننے والوں کی دل چسپی میں کمی آئے۔ اس کا کمال فن یہی ہے کہ سننے والوں کے تخیل کو ایک حیرت ناک دنیا میں پہنچا دے۔ جب تک داستان ختم نہ ہو، وہ اس دنیا کی فضا میں سانس لیتے رہیں اور داستان کی افیون سے ایسے

مدہوش ہوں کہ پیالیوں میں گھلی ہوئی افیون کا بھی انھیں خیال نہ آئے اور پونڈے پر چاقو بھی تیز کرنا بھول جائیں بلکہ اگر ممکن ہو تو گنے کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالیں اور حسن یوسف کا قصہ ایک کہانی بن جائے۔

مرزا غالب نے فرمایا تھا کہ "داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔"

جب داستان گوئی نے ایک دل چسپ مشغلے سے بڑھ کر "فن" کی حیثیت حاصل کر لی تو اس کے چند اصول و قواعد بھی مرتب کر دیے گئے۔ پہلا یہ کہ داستان طویل اور دل کش ہو مگر اس میں تو اردو ڈنکر ارٹہ ہو اور سننے والے مدت دراز تک انجام کے مشتاق رہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں کوئی جز و نفرت انگیز یا اخلاق سے گرا ہوا نہ ہو۔ تیسرے زبان و بیان کی خوبیوں سے آراستہ ہو۔ چوتھے داستان میں جو واقعات پیش کیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہو۔ داستان گو ان بنیادی اصولوں سے واقف تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی پابندی بھی کرتے لیکن اصل چیز داستان کا زور بیان ہوتا کہ وہ سننے والے کو اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا کہ وہ قصے کی واقعیت پر غور کر سکیں۔ داستان گو لب و لہجہ، آواز کے اتار چڑھاؤ، حرکات و سکنات اور موقع و محل کی مناسبت سے ایسا طرز بیان اختیار کرتا کہ خود اس واقعہ کی تصویر بن جاتا۔ اس طرح سامعین کو ڈرامے کا بھی مزہ آ جاتا اور سامعہ کے ساتھ باصرہ پر بھی داستان گو کا قبضہ ہو جاتا۔ ادھر نفس اجتماعی کی کارفرمائی بھی ہوتی اور سننے والے تنکوں کی طرح داستان گو کے سیل تکلم میں بہے چلے جاتے۔

داستان خالصتاً کہنے کا فن ہے، لکھنے کا نہیں لیکن بعد میں داستانیں لکھی بھی جانے لگیں، مگر جو لطف اس کے سننے میں آتا ہے، پڑھنے میں نہیں آتا۔ سننے میں واقعات پر غور و خوض کرنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے ایک فرضی اور عجوبہ دنیا ہمارے لیے ایک اصلی اور واقعی دنیا بن جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے میں ہمارا تجزیاتی شعور کارفرما ہوتا ہے اور وہ لطف نہیں آتا جو داستان کا مقصد ہے۔ تاہم لکھی ہوئی داستانوں کا طرز بیان اتنا جاذب توجہ ہوتا ہے کہ ہم پکار اٹھتے ہیں۔ "اگر ایسا نہیں ہوا تو کاش ایسا ہوا ہوتا۔"

داستان گوؤں کی محبوب ترین داستان "امیر حمزہ کی داستان" ہے جس کی صرف ایک کڑی "طلسم ہوش ربا" ہی سات ضخیم جلدوں پر محیط ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب اور بڑی قابل قدر داستان ہے جسے بیان کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ دلّی کے آخری داستان گو، میر باقر علی مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس داستان کو پورا کیا ہے۔ اردو ادب میں داستانوں کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ داستان امیر حمزہ کے بعد "بوستان خیال" ہے جو اس دعوے کے ساتھ لکھی گئی کہ داستان امیر حمزہ اس کے آگے کہانی ہو جائے گی۔ اس کے بعد "باغ و بہار"، "آرائش محفل" اور "فسانہ عجائب" ہے اور اس سلسلے میں "الف لیلہ" کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کی کہانیاں بیان کرنے والی ایک عورت ہے اور جس کی مخاطب اس کی چھوٹی کنواری بہن ہے۔ اصل کتاب عربی

زبان میں ہے اور اردو میں اس کی چند کہانیوں کا ناقص ترجمہ ملتا ہے۔ نثر کی داستانوں کے علاوہ منظوم داستانیں بھی بے شمار ہیں، یہ مثنویاں کہلاتی ہیں اور ان میں سے "بدر منیر" اور "گلزار نسیم" رہتی دنیا تک قائم رہیں گی۔

داستان کے فن کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ رزم، بزم، حسن و عشق اور عیاری، اور ہر رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا جاتا ہے۔ تفنن و ظرافت کی چاشنی عیاروں کی کارگزاریوں سے دی گئی ہے۔ اگر عیاریوں کا مذکور نہ ہو تو داستان کی طوالت اجیرن ہو جائے۔

وقت کوتاہ و قصہ طولانی، داستان گوئی میں جاہ و قمر نے لکھنؤ میں اور میر کاظم علی اور میر باقر علی نے دلی میں بہت نام پایا۔ میر کاظم علی کے والد میر امیر علی شاہی داستان گو تھے جو غدر کی بساط کے ساتھ لپٹ گئے۔ میر کاظم علی غدر کے بہت بعد تک رہے اور میر باقر علی جو ان کے بھانجے اور شاگرد تھے کچھ سال ہوئے ہم سے رخصت ہوئے۔ یہ اپنے فن کے آخری باکمال تھے اور ان کے بعد دلی میں اس فن کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ میر صاحب دلی کی پرانی تہذیب کے پرستار اور بڑے وضع دار آدمی تھے۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اور جب تک یہ جیتے رہے ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ سفید بگلا سے بال، سر پر کپڑے کی ٹوپی، گول کترواں داڑھی، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، نیچی چولی کا انگرکھا، چست پیجامہ، پیر میں سلیم شاہی، میانہ قد اور اجلا رنگ۔ باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے، معلومات کا یہ حال کہ کسی موضوع پر گھنٹوں بلوا لیجیے اور پھر یہ نہیں کہ علوم جدید پرانٹ کی سنت اڑا رہے ہوں۔ جی نہیں۔ بڑی سادگی سے مشکل مسائل کو حل کرتے تھے۔ طبیعت ایسی لوچ دار پائی تھی کہ سوسائٹی کے ہر طبقے میں گھل مل جاتے اور اپنی ذہانت سے اس کے جملہ ادب آداب سے فوراً واقف ہو جاتے اور کیا مجال جو کوئی غلطی ان سے سرزد ہو جائے یا ہدف تمسخر بنیں۔ ہم نے انھیں دلی کی شادی بیاہ کی دعوتوں میں بھی دیکھا اور انگریزوں کے ساتھ ڈنر کھاتے بھی دیکھا۔ چھری کانٹے کا استعمال اس بے تکلفی سے کرتے گویا ہمیشہ سے انھیں کا ورود رہا ہے۔

داستان امیر حمزہ سنانے کے علاوہ میر صاحب نے اس صنف میں اختراعات بھی کی تھیں۔ مثلاً لال قلعہ اور شاہی کے واقعات بہ طرز داستان اس عمدگی سے سناتے کہ اگلی بہاریں تخیل کو شاداب کر دیتیں۔

زمانہ شاہی کی عید کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"رات کے دو بجے سے قلعہ میں دھوم شروع ہوئی، صبح کا ہونا، زہرہ کا جھلکنا، ستاروں کا ڈوبنا، مشرق کی طرف عمود سحر کی نمود، شبنم سے بیٹھا ہوا گرد و غبار، دھلا دھلا آسمان، اور وہ ہوا پر اڑتی سی نوبت کی دھن۔ شہنائی کی آوازیں، باجوں کا شور، گھڑیالوں کی گجر، دیوان خاص کے آگے تنگیرے کا ہوا سے جھومنا، پچھیرا پلٹن کا آنا، انگریزی پلٹن کا گزرنا، ایک طرف سانڈنی سوار شتری، باناتی دگلے گلوں میں پہنے۔ سرمئی پٹیاں تلہ دار سروں پر،

داڑھیاں رخساروں پر رخ کیے، سپریں پشتوں پر نیچہ زیب کمر، گھٹنے سفید، موزے سیاہ پاؤں میں۔ ایک ہاتھ میں مہار، دوسرے میں تازیانہ، سانڈنیوں کی گردنیں گودوں میں لیے سانڈنیاں بل کرتے، جن کے گلوں میں گھونگرو، جھانجھن سرخ قند کے رومالوں سے زانوؤں پر رکے ہوئے۔ دوہری کاٹھیاں پشتوں پر جن پر غاشیے، بانات سبز کے زریں بیل اور ترنجوں سے درست، کاٹھیوں پر پڑے۔ ایک طرف چوراسی گچھے دار جھولتی قرزیاں، جن پر سنہری روپہلی چھلے چڑھے۔ سانڈنیوں کی دُمیں قراریوں سے باندھے، دو دو سوار چھم چھم کرتے، دیوان عام کے آگے سے گزرے، اور آگے سانڈنی سواروں کے ان کا افسر بلند سانڈنیہ پر سوار مندیل مغرق سر پر باندھے، گلے میں زرین وردی پہنے، ہاتھ میں مہار، سانڈنیوں کے بعد سواروں کا رسالہ، آگے آگے ان کا رسال دار نواب مرزا سر پر خود زرہ، گلے میں چار آئینہ پہنے، دستانہ فولاد کا مرقع تک کاندھے پر تلوار صیقل اور مصیقل سے نہایت آب دار، عریاں کیے لجام مرکب بائیں ہاتھ میں، سپر دامن گرداں پشت پر، چکلا سینہ، بازوؤں کی مچھلی پلٹی ہوئی، کمر پتلی، گردن تیار، ڈاڑھا چڑھا ہوا، مشکی گھوڑے پر سوار جس کی چھوٹی کنوتیاں، طبلی بیٹھی، آنکھیں ابلی ہوئی، نتھنے پھیلے ہوئے، تھوتھنی غنچہ سی، گردن مور کی سی، سینہ چکلا۔ ایال کے بال باریک اور پتلی جلد۔ باریک رواں چھوٹا اور نرم، پیٹھ چھوٹی، پیٹ بڑا، کمر پتلی، ساغر چوڑی، کلاچی چھوٹی، سم بڑے۔ اس سردار کے پیچھے ایک رسالہ جن کے گھوڑوں کی یک رنگ چوکڑیاں، ان پر سواران جرار نیزے ہاتھوں میں لیے سنانیں چمکتی، پیر قیں دورنگی ہوا سے لہراتی، ان کے عقب میں چوب دار، مردھے، پیادے، چکردار پگڑیاں جن پر سنہری ویمک اور لیس لگی ہوئی۔ گلوں میں سرخ باناتی دگلے۔ برکے پیجامے سفید، پاؤں میں زریں جوتا، عصا چاندی کے جن پر سنہری آڑی بیل بنی ہوئی۔ چپنے ہوئے لو جڑاؤ کاندھوں پر دھرے گزرے، اب شاہزادوں کی تکیں پالکیاں، بوجہ، ہوادار اور تن جام آنے شروع ہوئی نقار خانہ سے نوبت جھڑ رہی ہے۔"

امیر حمزہ کی داستان کا کوئی مختصر واقعہ تین گھنٹے سے کم میں نہیں سناتے تھے۔ رزم کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ داستان کا میدان، میدان جنگ بن گیا ہے، بڑے زور کا رن پڑ رہا ہے۔ اور میر صاحب خود تلوار، کھانڈے، قرولی، گپتی، خنجر، دشنہ اور سینکڑوں ہتھیار چلا رہے ہیں۔ بیان میں ایک زور آ جاتا اور میر صاحب پہلو اور پینترے بدل بدل کر اصل کی نقل اتارتے اور بزم کو رزم کا نقشہ دکھا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سینکڑوں نام لے جاتے اور پھر یہ کوئی رٹا رٹایا کام نہیں تھا۔ جس کا جی چاہے میر صاحب کو ٹوک کر پوچھ لے کہ فلاں ہتھیار کیا ہوتا تھا۔ ہتھیار کی شکل اور اس کا طریقہ استعمال دونوں بتاتے تھے، یہی حال زیوروں اور جواہرات بلکہ ہر بات کا تھا، غرض معلومات کی ایک انسائیکلوپیڈیا (Encyclopedia) تھے۔ عیاروں کا بیان کرتے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ میر صاحب عیار کی تصویر بن جاتے اور پر لطف بیان کرنے میں ایسا لہجہ اختیار کرتے کہ سامعین

مارے خفی کے لوٹن کبوتر بن جاتے۔ داستان شروع کرنے سے پہلے چاندی کی ایک کٹوری میں افیون کی گولی روئی میں لپیٹ کر گھولتے تھے اور بڑی نفاست سے اپنا نشہ پانی کرتے تھے۔ دوران داستان چائے کی چسکی لگاتے جاتے اور جب ذرا توقف کرتے تو کوئی چٹکلہ چھیڑ دیتے یا چائے کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دیتے۔ فرماتے تھے کہ چائے کی تین خوبیاں ہیں، لب سوز، لب بند اور لب ریز۔ پھر ان کی توضیح یوں کرتے کہ بہت گرم ہو، بہت میٹھی ہو اور بہت ساری ہو۔

امیر امرا کے علاوہ دلّی کے غریبوں میں بھی آئے دن ان کی داستان ہوتی رہتی تھی۔ دلّی میں دس پندرہ روپے پر داستان کہتے تھے اور باہر جاتے تھے تو سینکڑوں کی خبر لاتے۔ زمانے کی ناقدری کے شاکی تھے۔ تھیٹر، سینما اور مغربی تہذیب کی دوسری دل بستگیوں نے داستان کی بساط بھی الٹ دی تھی اور میر صاحب تنگی ترشی سے گزر کرتے تھے۔ آخر میں انھوں نے مولانا محمد علی مرحوم کے اخبار "ہمدرد" میں نادر مضامین لکھنے شروع کیے تھے اور چند چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھ کر خود بھی شائع کی تھیں۔ یہ سب مطبوعات اب نایاب ہیں۔ اب نہ میر صاحب ہیں نہ داستان گوئی، یہ فن ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ماہنامہ ساقی دہلی

نومبر 1944ء

حیات فنی کی داستان گو

میر باقر علی

اشرف صبوحی

غدر کے بعد دلّی پر کچھ ایسی ساڑھ ستی آئی کہ اوّل تو پرانے گھروں کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ نہ مکان رہے نہ مکیں۔ سارا شہر ہی بارہ باٹ ہو گیا اور جن کی نال نہیں اکھڑی وہ پیٹ کی خاطر تتر بتر ہوئے۔ روٹی کی خاطر جسے دیکھو خانہ بدوش۔ بارہ برس ہوئے ملازمت کے سلسلے میں دیس نکالا جو ملا تو دلّی کی صورت دیکھنی نصیب نہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے بادشاہ سلامت کا نہ وہ دلّی میں دربار کرتے نہ میرا یہاں آنا ہوتا۔ تقدیر میں ایک مرتبہ پھر دلّی دیکھنی تھی آ گیا، ورنہ یوں ہی روزی کی اذیت میں ترستا ہوا مر جاتا۔

رات کے وقت ریل سے اترا۔ بیوی بچے ساتھ تھے۔ گھر آیا تو عجب نقشہ۔ اسباب کوٹھریوں میں بند، اُجڑا ہوا سماں۔ سفر کی تھکن تھی۔ یونہی زمین پر بچھونے کر سو گئے۔ صبح سے درستی شروع کی، وہ دن اسی ٹینک ٹنچا میں لگ گئے۔ گھر سے باہر تک نہ نکل سکا۔ وطن مکان کی چار دیواری کا تو نام نہیں۔ تیسرے دن باہر نکل کر سوچ رہا تھا کہ پہلے کہاں چلنا چاہیے۔ راہ گیر آ جا رہے تھے۔ سب شکلیں اجنبی، سینکڑوں بوڑھے جوان گزر گئے۔ نہ میں نے کسی کو پہچانا، نہ مجھے کسی نے جانا۔ اتنے میں ایک صاحب منحنی سے جیسے سفید انجور کی پھانک۔ نظریں نیچی کیے سامنے سے چلے۔ ان کی صورت کچھ جانی پہچانی سے دکھائی دی۔ ان کی نظر جو مجھ پر پڑی، ٹھٹکے اور بولے "آپ کا اسم مبارک؟" ۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ دربار کے سبب سی آئی ڈی کا بڑا زور تھا۔ گمان ہوا کہ کوئی خفیہ پولیس والا ہے۔ کون جواب دے کر الجھن میں پڑے۔ ایک منٹ انتظار کر کے انھوں نے پھر مجھے مخاطب کیا "جناب میں آپ سے عرض کر رہا ہوں"۔

میں: (ذرا تیوری چڑھا کر) جناب کو میرے نام سے مطلب؟

وہ: بس جناب جو معلوم کرنا چاہتا تھا معلوم ہو گیا۔

میں: کیا؟

وہ: آپ کو دہلی شریف سے کوئی نسبت نہیں۔

میں: پھر آپ نے کہاں کا رہنے والا سمجھا؟

وہ: کم از کم جمنا پار کا۔

میں: (کسی قدر جھلا کر) چلیے اپنا کام کیجیے۔

وہ: حضت یہ زمانہ بے کاری کا ہے کام کہاں؟

میں یاد کر رہا تھا کہ یہ آواز اور یہ بول چال سنی ہے، کہاں سنی ہے، کب سنی ہے؟ سمجھ میں نہیں آیا۔ صورت حافظے میں آتی اور نکل جاتی۔ انھوں نے خاموش دیکھ کر فرمایا "آپ نے یہ مکان کرایے پر لیا ہے؟"۔

میں: بندہ خدا تم تو سرتیش بن گئے، جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔

وہ: بھئی دلّی کی بولی تو خوب بولتے ہو، بیوی کا صدقہ ہے شاید۔

مجھے اس فقرے پر کچھ ہنسی سی آئی اور میں نے کہا "جناب آخر مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟"۔

ان کی داہنی بغل میں ایک خاصی بڑی پوٹلی تھی جسے ایک دو دو منٹ کے بعد سہارتے، سنبھالتے جاتے تھے اور بائیں ہاتھ میں ایک بستہ سا اس طرح چھاتی سے لگا ہوا جیسے بڑی جماعتوں کے طالب علموں کا قاعدہ ہے۔ دروازے کی چوکی پر اپنا پوٹلا رکھتے ہوئے بولے "جناب اجازت ہے؟"۔ میں نے عرض کیا "شاید آپ کے ہاں کاربرآری کے بعد اجازت کا دستور ہے؟"۔ خدا جانے انھوں نے میرا فقرہ سنا یا نہیں۔ وہ اپنا بستہ کھولنے میں مصروف تھے۔ بستے میں چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں۔ کتابیں کیا دو دو تین تین جزو کے رسالے (ایک کتاب میرے آگے کر کے) "حضت دلّی کی کانا باقی بھی سنی ہے ملاحظہ ہو۔ پرانی کہانیاں ہیں۔ یہ دیکھیے 'پاجی پڑوس'، 'خلیل خاں اور فاختہ' 'پڑھے اور بیچے'۔ بادشاہ کا 'مولا بخش ہاتھی' 'قلعے کی آبادی کا ایک قصہ' ہے۔ سیاسی رنگ مزاج پر غالب ہو تو 'گاڑھے خاں کا دکھڑا' اور 'مغل جان کی انوٹھی' لیجیے۔ قیمت کچھ زیادہ نہیں سوا روپے میں پورا سیٹ"۔

کتابوں کے عجیب نام سن کر میں نے کتابیں ہاتھ میں لے لیں۔ ایک کتاب کے ٹائٹل پر نظر پڑی تو مصنف میر باقر علی داستان گو۔ فوراً میر صاحب کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اب جو حلیہ ملاتا ہوں تو خود بدولت ہیں۔ وہی وضع، وہی قطع، وہی لٹھے کی گول خانہ ساز ٹوپی، کانوں میں رومال لپٹا ہوا، وہی چوڑی آستینوں کا کرتا، وہی چھینٹ کی ادھ سیری نیمہ آستین، وہی سوا نچی کچّی داڑھی، وہی پوستیوں کی سی آنکھیں، وہی مل گجا مل گجا چہرے کا رنگ۔ میری آنکھوں کا تصور رہا اور نہ اُن کی شباہت میں فرق نہ تھا۔ ہاں کسی قدر جھریا گئے تھے۔

میر صاحب کو پہچاننے کے بعد مجھے کہاں تاب تھی، لپٹ گیا۔ "ہائیں میر صاحب آپ ہیں؟ واللہ غضب کیا۔ آخر یہ کون سی عیاری تھی۔ کیا آپ نے بھی مجھے نہیں پہچانا تھا"۔

میر صاحب: آخاہ میاں دولہا! کب آئے؟ جب ادھر سے گزرتا آنکھیں ڈھونڈتیں۔

میں: اُفوہ! کتنے عرصے کے بعد ملنا ہوا!!! گزشتہ اتوار کی رات کو آیا ہوں۔ آپ نے کس سے سن لیا۔ میں تو ابھی کہیں گیا بھی نہیں۔

میر صاحب: میرے دل کو خبر ہوگئی۔

میں: اور آپ نے مجھے پہچان لیا؟ مجھ میں تو زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔

میر صاحب: میاں ہم لوگ نئی روشنی کے نہیں کہ ظاہر میں اُجالا اور دل میں اندھیرا۔ جو آنکھوں میں بس گیا بس گیا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

میں: کیا کہوں کہ آپ کو دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی ہے۔

میر صاحب: تمھاری سعادت مندی ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اچھا آداب عرض کرتا ہوں، ان شاءاللہ پھر کسی وقت ملاقات ہوگی۔

میں: مگر یہ تو فرمایئے کہ یہ کتابیں آپ نے کب لکھیں اور کب چھپوائیں؟

میر صاحب: پڑھو گے تو معلوم ہو جائے گا۔

میں: اس پوٹلی میں کیا ہے؟

میر صاحب: چھالیا! کتابیں بھی بیچتا ہوں اور چھالیا بھی۔

میں: آپ چھالیا بھی بیچتے ہیں؟ داستان گوئی کا سلسلہ ختم ہوا؟

میر صاحب: تم دلّی کو اب کیا سمجھتے ہو۔ کایا پلٹ گئی۔ بجلی کی روشنی میں پرانے ڈیوٹ کو کون پوچھتا ہے۔ میاں "ایک دھوپ تھی کہ ساتھ آفتاب کے" خدا اتالی کرے دلالی نہ کرائے۔ آبرو کے ساتھ بسر کرنے کی آخر کوئی شکل تو ہونی چاہیے۔

میں: لیکن کہاں وہ سبق آموز اور شریف فن، کہاں یہ چھالیا فروشی، کیا آپ اس میں خوش ہیں؟

میر صاحب: ارے صاحب خوشی تو دلّی والوں کی خوش اقبالی کے ساتھ رخصت ہوئی۔ آج جو خوش ہوتا ہے دراصل خوشی کو منہ چڑاتا ہے۔ میں تو بھئی داستان گوئی سے چھالیا بیچنے میں زیادہ خوش ہوں۔

میں: بھلا کیوں؟

میر صاحب: قبرستانوں میں جا کر سناؤں؟ زندوں میں تو کہیں چرچا رہا نہیں۔ کیوں کر رہے؟ جو بے زبان سے نا آشنا اگلے وقتوں کی معاشرت پر منہ آنے والا۔ اگلے انسانوں کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ زندگی کا فلسفہ ہی بدل گیا ہے۔ بچے کھچے کچھ لوگ رہ گئے تھے جن کے ہاں جا کر کبھی کبھی بزرگوں کی فاتحہ پڑھ آتا تھا۔ اُن کی صحبتیں بھی درہم برہم ہو گئیں۔

میں: لیکن چھالیا بیچنا تو بہر حال آپ کی شان کے خلاف ہے۔

میر صاحب: شان ہاتھی کی یا نشان، میاں شان کا مفہوم دنیا نے غلط سمجھ رکھا ہے۔ دوسرے داستان کی طرح میں نے اِس میں بھی کمال پیدا کیا ہے۔ میری چھالیا کھا کر دیکھو داستان کا مزہ نہ آئے تو کہنا۔ بات یہ ہے کہ پان کھانا دِلّی والے بھولتے جاتے تھے (ہنس کر) میں نے انھیں پھر سکھانا شروع کیا ہے اور پنجابی تک کہنے لگے ہیں کہ "آہو میر صاحب، ہن پان دا سواد آیا"۔

میں: (تعجب سے) آپ کا مطلب میں سمجھا نہیں۔ دِلّی والے پان کھانا کس طرح بھول گئے؟

میر صاحب: اپنی معاشرت بدل کر۔ اپنے بڑوں کی ہنسی اڑاتے اڑاتے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر کچھ دن اور پان کھانے والوں میں بے شعوری بڑھتی رہی تو ہمارے تمدن کی یہ چیز بھی گئی۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ چھالیا بیچو۔ چنانچہ اس کی تجارت شروع کر دی۔ اب جہاں چھالیا لے کر جاتا ہوں، میرا فرض ہے کہ پان کھانے کا سلیقہ بھی بتاؤں۔

میں: پان کھانے میں بھی سلیقے کی ضرورت ہے؟

میر صاحب: سبحان اللہ۔ پھر آدمی گھاس کے پتے نہ چبا لے۔ میاں تمھارے بڑوں نے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنے کے لیے پان نہیں کھائے۔ نہ یہ کوئی تعیش کی چیز تھی۔

میں: پھر کیوں کھاتے تھے؟

میر صاحب: گلے، دانتوں اور معدے وغیرہ کی دوا سمجھ کر۔ اور اس لیے پان اور اس کے جملہ لوازمات سے واقف ہوتے، چھالیا کیسی ہونی چاہیے۔ پان کس موسم میں کس حالت میں کون سا کھایا جائے۔ کتھا کیوں کر پکائیں۔ چونا کس طرح بجھائیں۔ آج کل پہلے کی نسبت پان زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ جسے دیکھو پنواڑی کی دوکان پر کھڑا ہے، یا ڈبیہ جیب میں ہے۔ بکر بکر چبائے ہے مگر پوچھو کہ کیا کھایا، پان یا پیپل کا پتا۔ چھالیا یا پنساری کی دوکان کا کوڑا تو دانت گھوس دیتے ہیں۔ ایسوں نے تو ہمیں بدنام کیا ہے۔ ہماری معاشرت میں کیڑے ڈلوائے ہیں۔

میں: تو کیا داستان کہنی بالکل چھوڑ دی؟

میر صاحب:

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی　　　بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

یوں دو چار گنے بندھے ٹھکانے ہیں۔ کبھی بلایا، جا بیٹھا۔ داستان کیا وقت کے مطابق کوئی چٹکلا سنایا۔ دل بہلایا۔ اپنا نہیں بلانے والوں کا، اور چلا آیا۔ ہاں غریب خانے پر بیٹھنے کے پرانے کھنڈروں کے کچھ روڑے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سچ پوچھو تو سر پھوڑنے کا مزہ آجاتا ہے۔ اچھا تو رخصت ہوتا ہوں، یار زندہ صحبت باقی۔

یہ کہہ کر دو قدم چلے تھے کہ پھر پلٹے اور فرمانے لگے۔ بھئی خوب یاد آیا۔ اب کے بیٹھنے کو (انگلیوں پر گن کر) تیسرے دن جی چاہے تو غریب خانے پر تشریف لے آئیے۔ لکھنؤ کے چند اہلِ ذوق آنے والے ہیں۔ ان کی فرمائش ہے کہ دلّی کے رنگ کی داستان سناؤں۔ نو بجے شروع کروں گا، گیارہ بجے تک محفل برخاست ہو جائے گی۔

میں: میر صاحب! میں اور نہ آؤں۔ آخر دلّی آیا کس لیے ہوں؟ اگر آپ وقت پر کسی کو بھیج کر بلوالیں تو بڑا کام کریں۔ دوسری مصروفیتوں میں شاید میں بھول جاؤں۔

دلّی جب ہندوستان کا دل تھی۔ قلعہ آباد تھا۔ اس میں زندگی کے آثار تھے۔ تو ہر فن کا صاحب کمال پیدا ہوتا تھا۔ فارغ البالیاں تھیں۔ قدر دانیاں تھیں۔ لوگ اپنے ہنر دکھاتے تھے۔ دیکھنے والے کبھی بطور پرورش، کبھی 'اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردیش' کے مصداق اور کبھی شانِ امارات دکھانے کے لیے دل بڑھاتے رہتے تھے۔ جب تک سپاہیانہ جوش اور فتوحات کے ولولے رہے، اندر و باہر کا نقشہ تھا۔ تیر اندازی، شمشیر زنی، کشتی، گھوڑے کی سواری کھیلوں میں داخل تھی۔ وہ وقت نہ رہا۔ حکومت دوسرے رنگ پر آگئی تو رزم نے بزم کی صورت اختیار کر لی۔ خوں آشامی کے جذبات مرغ بازی، بٹیر بازی وغیرہ میں اور سواری شکاری کے خیالات تاج رنگ اور دوسرے تفریحی مشاغل میں بدل گئے۔ حیاتِ متحرک پر جمودی کیفیت طاری ہوئی۔ تمام دن مسند تکیہ لگائے بیٹھنے میں اضمحلال ہو جاتے تھے، راتوں کی نیند بدمزہ ہونے لگی۔ لوریوں کی ضرورت پڑی۔ قصے کہانیاں شروع ہو گئیں۔ یہ گویا داستان گوئی کی ابتدا ہے۔ خواہ اس کا موجد ایران ہو یا ہندوستان لیکن ہے یہ قوم کی غنودگی اور حکومت کی افسردگی کے دور کی پیدائش۔

میر باقر علی کے باپ دادا داستان گو نہ تھے۔ ان کے نانا میر امیر علی قلعے میں قصہ خواں تھے۔ میر صاحب کے ماموں میر کاظم علی نے قصہ خوانی سے بڑھ کر داستان گوئی شروع کی اور اس فن کو ایسی ترقی دی کہ لکھنؤ اور فیض آباد کے واجد علی شاہی قصہ خوانوں کو چنے چبوا دیے۔ دلّی والوں کا سکہ بٹھا دیا۔ ان کی ہزار داستانی کا غلغلہ حیدرآباد

پہنچا۔ سر آسمان جاہ کا دور دورہ تھا۔ شہرت کے ہاتھوں وہاں بلوائے گئے اور قدر دانی نے ایسا پکڑا کہ وہیں کے ہو رہے۔ میر باقر علی اُن ہی کے شاگرد تھے۔ ماموں بھانجے کا رشتہ۔ اُستاد لاولد۔ شاگرد ہونہار اور بقائے فن کا شوق۔ خوب سکھایا اور خوب سکھایا۔ ماموں کو تو ہم نے سُنا نہیں۔ بھانجے کو سُنا اور پیٹ بھر کے سنا ہے۔ کیا کہنا، اس فن کے خاتم تھے۔ وہ کیا مرے کہ یہ فن ہی مر گیا۔ میر کاظم علی تو مر گئے میر باقر علی جیسا شاگرد چھوڑ گئے لیکن میر باقر علی نے نام کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ لڑکا کوئی اُن کا بھی نہ تھا۔ ایک لڑکی تھی جسے اُنھوں نے قابلہ کی تعلیم دلائی۔ کاش داستان گوئی سکھاتے کہ اس مرحوم فن کا سلسلہ تو نہ منقطع ہوتا۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں داستان گوئی زیادہ بکار آمد ثابت ہوتی۔

امیر حمزہ اور عمرو عیار کے تقریباً سارے قصّے میں نے پڑھے ہیں۔ میر باقر علی مرحوم کی داستانیں بھی انھی کا ضمیمہ ہوتی تھیں۔ وہی کفر و اسلام کی جنگ آزمائیاں، وہی طلسم کشائیاں، وہی عیاریاں مگر اُن کی طرزِ ادا ایسی دلچسپ ہوتی تھی کہ کیا کہیے۔ اصوات و حرکات کے پورے اداکار تھے۔ میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے تو یہ معلوم ہوتا کہ رستم و اسفند یار کی کشتی دیکھ کر ابھی آئے ہیں۔ بزمِ عیش کا سماں باندھتے تو فضا میں مستانہ رنگ نظر آنے لگتا۔ ہر جذبے کی تصویر کھینچا کیا معنی خود تصویر بن جاتے تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ دفتر کے دفتر نوکِ زبان تھے۔ کھانوں کا ذکر آیا تو ایوانِ نعمت کی فہرست کھول دی۔ کشتی کا بیان کیا تو گونڈی شاہ والوں اور شتو والوں کے سارے داؤں پیچ گنوا دیے۔ بیان کی روانی اس قدر تھی کہ کبھی کبھی حقے کا کش یا اتفاقیہ افیون کی چسکی لگا لینے کی سنی نہیں، ورنہ عموماً داستان شروع کر کے ہی دم لیتے۔ کیا مجال ہے کہ نظم یا نثر میں کہیں ہچکی لیں یا کسی میدان میں جھول آئے۔ موسیقی سے واقفیت کا سامان تو خداساز تھا۔ ترکمان دروازے ڈوموں کی گلی کے اصلی رہنے والے تھے۔ جہاں کی دنیا ہی سُر دوں میں گُھلی ہوئی تھی۔ یہ تو تحقیق نہ ہو سکا کہ موسیقی کا علم کس حد تک تھا۔ گلے سے بھی کام لیتے تھے یا نہیں۔ البتہ کن رسیے پورے تھے۔ بڑے بڑے جلسوں میں اچھے اچھے گویّوں کو ٹوک دیا کرتے۔ آواز کی باریکیوں اور سنگت پر اتنی اچھی نظر تھی کہ اکثر چند توں سے سہا جنے کے لیے تیار ہو گئے۔

آخری عمر میں طب پڑھنے کا شوق تھا۔ باقاعدہ طبیہ کالج دہلی میں جا کر لیکچر سنتے تھے۔ طبیب بننے کے لیے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ داستان میں علمی رنگ پیدا ہو پائے، کیوں کہ طبِ اسلامی کے نصاب میں فلسفہ، ریاضی، ادب، نفسیات، فلکیات وغیرہ تقریباً سارے علوم کم و بیش داخل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی داستان میں اس بدعت سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن افسوس یہ اُن کی اجتہادی غلطی ثابت ہوئی۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ میر صاحب خیر اپنی چال تو نہ بھولے البتہ چھالیا ضرور بیچنے لگے۔ بات یہ تھی کہ میر صاحب داستان گو تھے، علم کے کسی شعبے کے لیکچرار نہیں۔ لوگ اُن سے صرف اپنا دل بہلانا اور اپنے جذبۂ حیرت کی تسکین

چاہتے تھے یا دلّی کے کرخنداروں کی بولیاں ٹھولیاں سننا مقصد ہوتا تھا۔ حقیقت میں داستان بھی اگر سائنس، فلسفہ اور حکمت کی خشکی سے متاثر ہو جائے تو قہقہے کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

خیر آمدم برسرِ مطلب۔ ہفتہ آیا اور اتفاق سے میر صاحب کے ہاں جانا بھولا بھی نہیں لیکن اس دن یکا یک کچھ اتنے کام آ پڑے، اگر میر صاحب اپنے برادر نسبتی کو نہ بھیجتے تو غالباً میں نہ جا سکتا اور اس نہ جانے کا عمر بھر افسوس رہتا۔ ٹھیٹ داستان گوئی کے رنگ میں یہ اُن کی آخری داستان تھی۔ لکھنؤ والوں میں ایک طلسم ہوش ربا کے مترجم کے بیٹے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ میرے والد سے بہتر داستان، کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اس لیے میر صاحب کو بھی اپنا کمال دکھانا پڑا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ میں میر صاحب کے ہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹے سے دالان میں دس بارہ آدمی بیٹھے ہیں۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ طول میں کے قریب ایک چوکی بچھی ہوئی ہے۔ افیون کی ڈبیا، لوٹا پانی کا، دو تین پیالیاں آس پاس رکھی ہیں۔ چوکی کے آگے دیوار کی طرف ایک منحنی سا آدمی لپٹا لپٹایا بیٹھا ہے۔ آگے ڈوری میں ٹنگی ہوئی لالٹین ٹمٹما رہی ہے۔ مدھم روشنی، میری آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی، کیا پہچانتا۔ سلام علیکم کر کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز آئی۔

''میاں بڑی راہ دکھائی۔ میں تو ہار کر داستان شروع کرنے والا ہی تھا''۔

میں: آپ ہیں کہاں؟ آواز آ رہی ہے نظر نہیں آتے۔

میر صاحب: بھائی سردی ہے سردی۔ ناک کی سیدھ میں چلے آؤ، میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔

میں آگے بڑھا اور آواز پر جا پہنچا۔ اُن کی اس وقت کی برزخ بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ سر پر روئی کا کنٹوپ جس کے دونوں سرے اوپر کو الٹ کر ٹوپی سی بنا لی گئی تھی۔ سیاہ زمین اور لال لال بوٹیوں دار چھینٹ کی کُرتی۔ اوپر سے خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی ڈیڑھ سیر روئی کی رضائی۔ ٹانگوں پر خاکی زین کا پاجامہ۔ پاؤں میں سُرخ دھاری دار لدھیانے کے موٹے موٹے موزے پاجامے کی موریوں تک اوپر چڑھے ہوئے۔ میں نے جو انھیں غور سے دیکھا تو تاڑ گئے کہنے لگے: ''کیا دیکھتے ہو بنولا بنا ہوا ہوں، سبحان اللہ اپنا لباس بھی کیسا آرام دہ ہوتا ہے۔ میاں سردی روئی سے بھاگتی ہے یا دوئی سے۔ بھائی میں تو اپنی راحت اور تندرستی کو مقدم جانتا ہوں۔ اب دیکھو سینے کی حفاظت کُرتی سے ہو گئی۔ کان اور گردن وغیرہ کا بچاؤ کنٹوپ سے ہو گیا۔ رہی رضائی، اوڑھنے کا اوڑھنا ہے اور بچھونے کا بچھونا۔ سردی لگے اوڑھ لو ورنہ گدیلا بنا کر بچھا لو۔ بندہ بشر ہے کہیں رات زیادہ آ جائے۔ وہیں سونا پڑے تو دوسروں کے جھوٹے لحاف کی ضرورت نہ بستر کا ٹنٹا۔ جہاں نیند آئے گنڈلی منڈلی مارو اور پڑ جاؤ''۔

اس مختصر سی مجلس میں میر صاحب کے کئی ہم مشرب یعنی چنیا بیگم کے عاشق بھی تھے۔ میر صاحب کو گھولوے

کہ لت کب سے تھی اور کس طرح لگی اس تو کا علم نہیں، مگر تھی اور اس حد تک کہ بغیر نشہ کیے داستان نہیں کہہ سکتے تھے، البتہ اور باتیں افیمیوں کی سی نہ تھیں۔ مزاج صفائی پسند تھا۔ طبیعت میں بھی کثافت نہ تھی۔ جب پیالی چڑھا کر داستان کہنے بیٹھتے تو انجانوں کو افیمی ہونے کا شبہ بھی ہوتا۔ میر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "سطحی نظر آنے والے جانتے ہی نہیں کہ افیم کیا ہے؟ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ دیکھنے میں کالی اور مزے میں ایک کڑوی شے ہے جسے اہلِ نظر نے نکرہ کہہ دیا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ اس کے چوگے میں ایک زبردست فلسفہ، ایک اعلیٰ مذہب بند ہے۔ مردانِ خدا سے پوچھو اس کا باطن کیسا، لالوں کا لال ہے۔ موتو اقبل ان تموتو کی مجسم تفسیر بن جاتے ہیں جہاں اسے گھولنا شروع کیا اور درستی اخلاق و تزکیہ نفس کی بنیاد پڑی۔ سرکش سے سرکش اور ظالم سے ظالم آدمی اسے پیتے ہی رحم کا پتلا اور خدا ترس بن جاتا ہے۔ اس کے اثر سے بڑے بڑے مغرور اور خود پسند سرنگوں ہو گئے ہیں۔ ہزاروں سورما اس کی بدولت میدانوں سے زندہ آ گئے۔ سینکڑوں پیراک پانی میں ڈوبنے سے بچ گئے۔ اس کے صدقے میں بیسیوں صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آواز میں وہ شیرینی کہ مکھیاں ہونٹ چاٹیں۔ خیال آفرینی اس بلا کی کہ بوستانِ خیال کو مات کر دیں۔ زبانی بہادری کے یہ ٹھاٹھ کہ رستم و سہراب تھرا جائیں۔ اور منکسر مزاجی یہاں تک کہ اگر ایک لونڈا جھاپڑ مارے تو سر مقدس زمین کے بوسے لے کر بھی اونچا نہ ہو۔ زبان سے سوائے منمناہٹ کے، کیا مقدور ہے کہ کوئی لفظ اخلاق سے گرا ہوا نکل جائے۔ تواضع کا یہ حال کہ اگر ایک گنڈیری کے چار ٹکڑے کر کے بھائیوں کو نہ کھلا لیں چین نہ آئے"۔

نو بج چکے تھے۔ میر صاحب کے ہم مشرب دوست میاں فجو خاں نے پہلے تو 'کسنبے' کی کٹوری پیش کی۔ یہ پی چکے تو چائے کی پیالی سامنے رکھ دی اور بولے "ہاں جناب میر صاحب! اب شروع کر دیجیے"۔ میر صاحب "بہت مناسب" کہہ کر دوزانو بیٹھ گئے اور اپنی نسبت چند انکسار کے الفاظ کہنے کے بعد داستان کے میدان میں اترے۔ مجھے پوری داستان تو کیوں کر یاد رہ سکتی تھی، نہ ایسا حافظہ، نہ کل کی بات۔ ہاں کچھ ٹکڑے حافظے میں محفوظ ہیں۔ پیش کرتا ہوں، سنیے:

مغنی خبر دہ ازاں دوستاں — کہ بودند چوں گل دریں بوستاں
چمن را تر و تازہ آراستند — چو شبنم نشستند و برخاستند

کم ترین یہ داستان فرحت عنوان یہاں سے گزارش کرتا ہے کہ دفتر کوچک باختر و بالا باختر ختم ہو چکا ہے اور لقائے بے راندۂ درگاہ و زمرد شاہ باختری مقابلہ جناب آفتاب عالم تاب دولت قاہرہ ماہتاب جہاں افروز سلطنت باہرہ۔ شکستہ گردن گرمان گردن کشان عالم سلطان المعظم امیر المکرم صاحب قران عرب و عجم سے بھاگ چکا ہے اور بڑے بڑے مغرور و بد دولت پر سرِ پُر غرور خم کر چکے ہیں۔ ابھی ایام سرور انجام میں ایک روز کا ذکر

ہے کہ میانِ بارگاہِ سلیمانی دربارِ جہاں بانی منعقد ہے اور قریب قریب سوا سو طائفہ اربابِ نشاط کا حاضر۔ تھاپ طبلوں پر پڑ رہی ہے۔ آوازِ ہوشیار و بادہ نوش کے ساتھ سارنگی کا لہرا اور بائیں کی گمک آسمان کو جا رہی ہے۔ طرح طرح کے باجے، الغوزے، بربط، بین، بانسری، بنگ دائرہ، پرند، جل ترنگ، چنگ، دف، ڈھولک، رستانی، رباب، سرنائی، نفیری، سرسنگھار، طاؤس، ستار، طرب، جوش، قانون، کمانچہ، مردنگ، منجیرہ، نے، نسترن بج رہے ہیں۔ ساقیانِ گل فام جام و صراحی لیے ہوش اُڑا رہے ہیں... اسی ہنگامِ عیش و نشاط میں دفعتاً ایک جوڑی عیارانِ طرار اور جاسوسانِ ہوشیار کی گرد میں آلودہ اور پسینے میں غرق پہ حضورِ شاہنشاہِ والا جاہ گیتی پناہ ظلّ اللہ سلطان سعد بن قباد غازی حاضر ہوئے۔ حدِّ ادب سے زمینِ خدمت کو بوسہ دے کر دست بستہ عرض کیا:

شاہا بجائے عمر تو بادا ہزار سال — لیکن بایں حساب بعد حشمت و جمال
سالے ہزار ماہ و مہے صد ہزار روز — روزے ہزار ساعت و ساعت ہزار سال

سرورِ عالم کی عمر دراز ہو۔ خانہ زاد حسبِ حکم عقبِ لقا باختری میں سرگرمِ رفتار تھے کہ ایک درۂ کوہ مثل درِ فردوس نظر سے گزرا۔ جب اس سے سربدر کیا تو وہ عالم دیکھا کہ:

شجر شجر سے ہویدا ہے رنگِ بوقلموں — چمن چمن سے بہارِ شکیب کلبۂ عطار
روش روش میں درختانِ باغ استادہ — قدم قدم پہ صنوبر جدا قطار
بچھا ہے سبزۂ صحرا میں فرشِ مخملِ سبز — کھنچا ہے روئے زمیں سائبانِ ابرِ بہار
ہر ایک غنچے سے پیدا ہے یار کی شوخی — ہر ایک گل سے ہویدا ہے رنگ و بوئے نگار
نسیم مست نکلتی ہے جوشِ مستی میں — لپٹ لپٹ کے جوانانِ باغ سے ہر بار
برنگِ بادہ کشاں مست ہیں وحوش و طیور — مثالِ صوفیِ سرمست وجد میں اشجار

تنک خوار اس کیفیت و بہار میں مصروف تھے کہ سامنے سے ایک گرد تیرہ و رنگ بلند ہوئی۔ جب قریب اُس گرد کے پہنچے تو دیکھا کہ کئی ہزار فیلانِ کوہ شکوہ مست و سربلند جن کی جھل ہائے مکلل تا پاشنہ لٹکتی اور کاٹھیاں پولادی جوہر دار پشتوں پر کسی۔ ان پر دو دو جوانانِ زبردست سوار، ہاتھوں میں نشانِ سربلند اور اعلامِ فلک پیوند سنبھالے، پھریرے ہوا سے اڑاتے۔ گرد و پیش سانٹے مار، بھالے بردار، بان انداز، چرکٹے اگدا گد، بڑی بڑی غل مچاتے۔ اُن کے بعد سانڈنی سوار۔ قطار در قطار سانڈنیوں کی گردنیں گودیوں میں لیے چوراسیاں کھنکتیں، جھنجھر بجتے۔ وردیاں شتری بانات کی پہنے، بتیاں سُرمئی سروں پر باندھے، پیچھے ان کے نیزہ بردار مرکبوں پر سوار، نیزوں سے نیستاں پھولا نظر آتا تھا۔ ان کے بعد دو بادشاہ زبردست القاب و انصاب بنام تاجِ زریں بر سر قبائیں شہنشاہی در بر، بیچ میں ان کے القاب لقائے بے بقا ایک فیلِ کوہ پیکر سوار، عقب میں اس کے یعقوب شاہ بن لقا اور بختیارک

بن بختک بن الغش بن مادرش بن سگِ سفید...... اور لقا لقا سے عرض کرتا جاتا ہے کہ خداوندا! میرے نام تقدیر جاہی لشکر خدا پرستاں فرمائیے۔ لقا نے کہا کہ خداوندا! وہ آذر کوہ اور عطلیا باد میں تمہارے ہی ہاتھ پر بربادی ان نادیدہ خدا پرستوں کی کئی کئی ہزار برس پہلے تقدیر فرما چکا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں عیار آداب بجا پچھلے قدموں ہٹ رخصت ہوئے اور یہاں بادشاہ اسلام نے واسطے روانگی امیر کشور گیر کو ارشاد فرمایا۔ صاحب قران نے پہلوان عادی کو کہ ہراول لشکر تھا حکم سنایا۔ پہلوان عادی سلام کو اپنے خیمے پر آئے اور دوسرے روز لشکر ظفر اثر اور فوج دریا موج جناب صاحب قران دوراں مع پانچ ہزار پانسو پچپن سرداران نامی۔ بہادران گرامی۔ دلیران صف شکن اور جوانان تیغ زن، تین سو زنگی، چار سو فرنگی، پانچ سو مدائنی، چھ سو ہندی، سات سو جُندی، آٹھ سو ترکی، ایک ہزار عجمی، بارہ سو باختری، بائی شیران بیشہ عراق، اور شاہزادگان آفاق جو خاص خاندان قریش سے تھے مع امیر نامدار و بادشاہ اسلام و مہر سپہر عیاری قطب فلکِ خنجر گزاری۔ شاہنشاہ عیاران روزگار یعنی خواجہ عمر بن امیہ ضمیری نامدار اور شاگردان خاص چار مہتر چودہ سرہنگ ایک لاکھ اسی ہزار عیار و قائم مقام مہتر قران و اولاد عمر روانہ ہوا... بدیع الزماں کہ صاحب قران گیتی گیراں میں ان کا وہ عالم ہے کہ ابھی گرد گلِ رخسار کے سبزۂ نو نے نمائش کی ہے۔ شعلۂ حسن بے دود نظر آتا ہے۔

عمر قامت باغ نوجوانی مائل نوخیزی ہے اور غزال چشم شباب میں آمادۂ شوخی ہے۔ ان کے دل میں شکار کی اُمنگ اٹھی۔ حکم کی دیر تھی کہ میر شکار نے جانوران صید گیر باز، جرہ، باشین، کوہی، کوہیلا، بزحتی، بشکرا، منوسانیولے، بحری، چیک، الگز بگز، سیاہ گوش چیتے وغیرہ کو درست کر، در دولت شاہزادہ پر حاضر ہوئے اور ایک مرکب صبا رفتار کہ سُم جس کے فراخی میں سپر طبلی بیٹھے ہوئے آنکھیں اُبلی، جلد باریک، نعل ہلال عید، غنچے سی تھوتھنی، کنوتیاں چھوٹی چھوٹی، کلائیاں شیر کی سی، گردن مور کی، پٹھے ہاتھی کے سے۔ کر چیتے کی اور رفتار کا وہ حال کہ

گر کھڑا ہو شرق میں اور سامنے ہو اُس کے غرب

تک اسے راکب کہے اتنا کہ چل تو یاں سے واں

پہنچے پائے صدائے ہاں نہ منہ سے تا بہ لب

پہنچے ہے یہ بادپا یاں سے واں اور واں سے یاں

القصہ جب وہ گردوں مقام بہ کمال تجمل و احتشام لشکر سے چار یا پانچ فرسخ پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک دریائے ذخار اور بحر مواج کہ ہر موج جس کی مثل زلف جاناں پیچ در پیچ اور ہر گرداب صورت حلقۂ کاکلِ معشوقانِ فتنہ انگیز نظر آتا ہے۔ بڑے زور شور سے مستانہ وار بہہ رہا ہے اور کنارے پر اس کے ایک مرغزار سرسبز و شاداب کوسوں تک چلا گیا ہے۔ سبزۂ زمرد گوں لہلہا رہا ہے، سبزی و ترواٹ آنکھوں میں گھسی جاتی ہے۔

طرفہ سرسبزی نے کی ہے ہر طرف سے سرکشی   ہے زمیں فیروزہ گوں اور لاجوردی آسماں
سجدۂ خالق میں ہے ہر شاخِ نخلِ پُر ثمر   حمد میں خلاقِ عالم کے ہے سوسن تر زباں

کہیں دھانوں کے کھیت پانی سے سیراب، کسان جہاں تہاں ڈھینکلیاں اور پُر وہے چلائے۔ رکھوالے درختانِ ثمر دار کے کھٹکے ہلائے، توتے اُڑاتے۔ وہ ہرے ہرے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، ڈھلے ہوئے ڈابر اور تالاب پانی سے لبریز۔ جھیلیں کٹوراسی چھلکتیں۔ ندیاں رواں، کناروں پر مرغانِ آبی کا ہجوم، تالابوں میں کنول اور سنگھاڑوں کی بیلیں پڑیں۔ کہیں کوکنار پھولا ہوا۔ اللہ رے فضا اس سبزہ زار کی۔ وہ شام کا قُرب، ہوا کی خنکی۔ جھلملاتا سا سورج۔ شفق کی سرخی۔ سرسوں کی زردی اور گھنے گھنے درختوں میں کوئل کا کوکنا۔ موروں کی جھنکار، موسم کا اعتدال، بادِ بہاری کا چلنا، طوطیانِ شیریں مقال کا امریوں پر جھوم جھوم کر گرنا۔ رکھوالوں کے شور۔ گوپھنیوں کے تڑاتے۔ گھنگھروں کی آواز۔ جھٹ پٹے کا وقت:

کہوں کیا سماں اخیری روز کا   مسیحائی کرتی تھی واں کی ہوا
ہر اک سمت سرسوں کے کھیتوں کا روپ   ملائم ملائم وہ دھانوں پہ دھوپ
بھلی لگتی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا   غرض زندگی کا وہاں تھا مزا
وہ دریا کا پُر پیچ آبِ رواں   ہر ایک موج تھی صورتِ کہکشاں
درختوں پہ ہر سو، وہ شورِ طیور   وہ چھپتا سا سورج وہ مہ کا ظہور

کہ دفعتاً دور سے اس دریا میں ایک روشنی ہوئی۔ جب وہ روشنی قریب آئی تو دیکھا کہ ساٹھ ستر کشتی، بجرا، مور پنکھی، ہوڑی، ڈونگا، بادبانی، ناؤ، بیڑا، جن میں ہزارہا کنول، فرشی جھاڑ، گلاس، ثمن، منوّر ہیں۔ ان میں نازنینانِ پری تمثال اور مہوشانِ حور خصال، زلفیں بنا کر چھوٹی ہوئی، دوپٹے سروں سے ڈھلکے ہوئے نشوں میں بے شرسار، زرق برق جوڑے پہنے، گہنے پاتوں سے عالم بے خودی میں آپے سے بے خبر۔ نشہ حسن و شباب میں بے خوف و خطر باہم چہلیں کر رہی اور قہقہے مار رہی ہیں۔ بیچ میں ایک طاؤسی از دُم تا منقار جواہر آب دار سے تیار۔ جوان جوان عورتیں سبزہ رنگ ساڑیاں بنارسی بھاری بھاری باندھے، گاتیاں مارے۔ موٹے موٹے کڑے۔ مگر وہاں جڑاؤ ہاتھوں میں پڑے۔ فتح پیچ کے سر گندھے۔ کوڑیالے سوباف، مانگیں نکلیں، کانوں میں مینا کاری بجلیاں، گلوں میں دوہرے گجروں کے توڑے، گنگا جمنی پنچ ہاتھوں میں لیے ڈانڈیں لگاتی چلی آتی ہیں۔ اندر اس کے سورج مکھیاں روشن، مسند زرتارگی، بیس بائیس انیس خاص خوش رو، ژولیدہ مو، موسی رنگ کے جوڑے، ہلکے ہلکے زیور چپ راست کھڑی، بالائے مسند ایک ماہ طلعت کمال ناز و ادا سے جلوہ افروز سے جلوہ فرما۔ گورا گورا بدن، بھولی بھولی صورت، لمبے لمبے بال، بڑی بڑی آنکھیں، پتلی بھویں، پھول سے گال، ستواں

ناک، غنچہ دہن، پتلے پتلے ہونٹ، دانت موتیوں کی لڑی، صراحی دار گردن، پیاری پیاری وضع:

سمن سینہ و نازک اندام و نرم
عیاں شرم شوخی میں شوخی میں شرم

گول گول شانے، کلائیاں بلور کی بلکہ نور کی، پنجہ حنا میں یاقوت کی صفائی۔

یہ ساعدوں کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا، ہوا وہ بے دم
نیام تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

ابھرا ابھرا سینہ، اٹھتی جوانی، آئینہ سا پیٹ، چیتے کی سی کمر:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

کاسنی جوڑا پہنے، جامِ شراب گلفام ہاتھ میں لیے، مخمور بادہ نشاط، پیچھے دو خواصیں پیشِ راس ہاتھوں میں، سامنے کچھ گائنیں، ستار، تنبورہ، ڈھولک کے ساتھ دھیمے دھیمے سروں میں چھوٹے چھوٹے دیس اور بھاگ کے خیال گا رہی ہیں۔ جونہی نگاہ شاہزادے کی اس جادو ادا پر پڑی، مرغ دل تیر نگاہ و ناز کا شکار ہوا:

تھی نظر یا کہ جی کی طاقت تھی ۔۔۔ وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ ۔۔۔ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
دل پہ چلنے لگا طپیدنِ ناز ۔۔۔ رنگ چہرے سے کر گیا پرواز

شاہزادہ شکار کی جستجو میں خود شکار ہو کر واپس آ رہا تھا کہ:

سامنے سے ناگہاں اک طرفہ باغ آیا نظر ۔۔۔ وصف شادابی میں ہے جس کی مری قاصر زباں
لغزش مستانہ دکھلائے گا پائے خیال ۔۔۔ بس کہ اس کی چاردیواری تھی صاف آئینہ ساں
پشتۂ دیوار پر اس کے وہ سبزہ دوب کا ۔۔۔ خار سر سبزی سے جس کی سر سبزی گل رخاں

اور قریب باغ ایک میدانِ وسیع میں اکثر خیمے ڈیرے، قناتیں، چھولداریاں، بنگلے استادہ ہیں۔ شاہزادہ بدیع الزماں قریب ان خیموں کے آئے تھے کہ ایک عیار نے آگے بڑھ کر آواز دی۔ "خبردار ہوشیار۔ یہ لشکر رخشانِ تیغ زن کا ہے۔" شاہزادے نے مرکب کو روک کر امیہ بن عمر سے کہا تم جا کر رخشاں تیغ زن سے کہو ہمارے سردار آپ سے ملاقات چاہتے ہیں...... بدیع الزماں مرکب بڑھا داخل لشکر ہوئے اور خیمہ رخشاں پر آ، گھوڑے سے اتر خیمے میں پہنچے تو دیکھا کہ حقیقت میں دنگل میں ایک جوان زبردست جسے کا چھاتا گردن تیار، مچھلیاں بازوؤں کی ابھری ہوئی، کمر پتلی، رانیں موٹی، پنڈلیاں گول، آنکھیں سرخ، سپر پس پشت، قربان میں کمان ہزار تیر

کاترکش شکل دم طاؤس پیچھے پڑا۔ جوڑی خنجر آب دار کی کمر میں لگی، موزے سیاہ ولایتی زانوؤں تک، ظفر تکیہ زیر بغل دبائے بڑی شان و شوکت سے بیٹھا ہے اور دائیں بائیں دنگلوں پر شاگردان خاص کو آپس میں ہم سری کا دعویٰ ہے مودب موجود ہیں......

باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شاگرد نے عرض کی کہ کسرت کا وقت آ گیا ہے۔ یہ سن کر رختاں نے شاہ زادے سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔ شاہ زادہ کھڑا ہو گیا۔ قریب ہی زیر شامیانہ اکھاڑا ہرا کیا ہوا تھا۔ جس میں پٹڑیاں ہر چہار سمت۔ ان پر لیزم، نل ڈنڑ، نل کھم، سنتولہ، نیکہ، کریلے، نالی، گودنکل، نالیاں، نال، مگدروں کی جوڑیاں، کبھیاں وغیرہ قاعدے سے رکھی تھیں۔ شاگرد لنگر لنگوٹے باندھے کچھ ڈنڑ بیٹھکیاں لگا رہے ہیں اور کچھ دوسری کسرتوں، جوٹ، پھکوی، بیلیا، ناگ موڑ، بن تور، دھارانی، بکھیتی، کرچی، بانک، پنار، جنوتی، رنج وتی، درستم خوانی، کرنانک، علی مد، شیر در، تیر بیکر، کشتی میں مصروف ہیں۔ ایک طرف دس بارہ ضعیف استاد ہر فن کے بیٹھے کھائیاں اڑائیں اور ورزش کی رکانیں تعلیم کرتے جا رہے ہیں۔ رختاں نے بدیع الزماں کو ایک دنگل پر بٹھایا چند جام شراب پی لباس اتار، سامان کشتی درست کر اکھاڑے میں اترا اور نہایت نخوت سے خم پر خم آواز دی کہ آؤ کون آتا ہے؟ آٹھ دس شاگرد سامنے آ کھڑے ہوئے۔ رختاں نے بیٹھ کر کہا لوچت کرو۔ وہ سب لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس نے سب کو اٹھا اٹھا کر پھینک دیا اور کھڑے ہو کر بکارا کہ ہاں کہاں ہیں رستم و سہراب، اسفندیار و گودرز، مرد بدیع الزماں۔ آئیں میرے مقابلے میں اور حلقہ میری بندگی کا اپنے کان میں ڈالیں۔ بدیع الزماں کو اس لاف و گزاف کی کب تاب تھی۔ بولے، اے جوان ایسی شیخی بہادروں کو سزاوار نہیں۔ رستم وغیرہ تو خیر اپنی جگہ ہیں اگر آپ کہیں تو میں موجود ہوں۔ ہاتھ مل جائیں۔ رختاں نے ہنس کر کہا، آیئے شہزادہ اسی وقت دنگل سے اتر سامان کشتی سے آراستہ ہو سامنے آیا۔ جس وقت شہزادے نے پینترا بدلا تو بوڑھے بوڑھوں کی گردنیں مل گئیں۔ سر سے سر ملا سامنے کے زور ہونے لگے۔ طاقت آزمائی کے بعد داؤں پیچ شروع ہوئے اک دتی، دو دتی، آنٹی سونت، ردوم، موڑھا، قینچی، پنجی، ہنکوڑو، گال، گرہ، جھوم، ہفتہ، لنگڑی، کولا، سنگھی، حمائل، کولا لاٹھی، جھولی، کیلی، ناک، پیچ، کوکھی، بغلی، گھلیہ، پری بند، دیو بند، قلعہ جنگ، بارہ بیلن، غوطہ، جھکی، سلھو، ہوکا، جھڑکی، مغلا، ساندھی، گھسا، اکوہی، قلندرہ سواری، جھولا، جھپکی، گھسوٹا، اڑنگا، دھڑ مار، ہار سنگھار، لنگر، تیغا، قفلی، ہوتے ہوتے شہزادے نے رختاں کی کمر بند زنجیر میں ہاتھ ڈال ایک ہی قوت میں سر سے بلند کیا اور نعرہ مارا کہ منم سر گروہ کشتی گیران جہاں بدیع الزماں بن صاحب قران حمزۂ ذیشاں۔

اب جو شہزادہ لشکر گاہ اسلام میں پہنچا، خلوت ہوئی تو عشق نے زور باندھا، معشوقۂ طناز کی یاد آئی۔ ہر چند ضبط کیا مگر کہیں عشق، مشک چھپتا ہے۔ ایک ہائے کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو گیا...... امیر کشور گیر کو اطلاع ہوئی کہ شاہ

زادہ دامن آذرہ کوہ میں لب دریا چاندنی کی سیر ملاحظہ فرما رہے تھے کہ یکایک چند کشتیاں دریا میں پیدا ہوئیں۔ جوان جوان عورتیں سوار تھیں۔ معلوم نہیں کہ ان میں سے کس فسوں ساز نے جادو کر دیا..... امیر نامدار نے سنا، اٹھ کھڑے ہوئے...... یہ خبر عیاروں نے کوتوالی چبوترہ پر خواجہ عمر بن امیہ ضمری کو پہنچائی۔ خواجہ سنتے ہی خیمہ بدیع الزماں پر آ خدمت امیر باتوقیر میں آداب بجالائے۔ ساری کیفیت سن کر کہا، حضور اطمینان فرمائیں۔ یہ کہیں عاشق ہو گئے ہیں یا ان پر کسی نے سحر کر دیا ہے۔ ہر حال میں اس کا انتظام کرلوں گا۔ اتنے میں شہزادے کو ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو صاحب قران ذی شان۔ خواجہ عمر اور کئی سردار اپنے تابع دار پلنگ کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ بدیع الزماں گھبرا کر پلنگ سے اترے۔ آداب بجا کچھ شرمندہ شرمندہ سامنے مؤدب بیٹھ گئے۔ صاحب قراں نے فرمایا، بیٹا کہاں گئے تھے اور یہ کیا حال ہے؟ شہزادے نے شرما کر نیچی گردن کر لی۔ امیر نامدار نے بھی زیادہ گفتگو کرنی مناسب نہ سمجھی۔ رخصت ہوئے اور چلتے چلتے شہنشاہ عیاران جہاں سے فرمایا تم جا کر شہزادے کو سمجھاؤ کہ صاحب زادے! ہم نے عالم شباب میں ایسے بہت کھیل کھیلے ہیں مگر انجام ان کا سوائے ذلت وخواری اور آہ و بے قراری کے کچھ نہ دیکھا، کیوں کہ معشوقان چمن روزگار ہفت دوستی میں مشاق ہیں:

دم دلاسے میں لگا لینا دل اُن کا کھیل ہے — روز کرنا اک شکار اُن کی ہیں ادنیٰ شوخیاں
سن کے نالہ عاشقوں کا کہتے ہیں کیا راگ ہے — ذبح کر کے دیکھتے ہیں سیر رقص بسملاں

جو جو سرمست بادہ غم ان کے نرگس چشم کا بیمار ہوا، یہ خیال افشائے راز گھل گھل کر گھٹ گھٹ کر جاں بخاطر دل دار کچھ کہہ تو سکتا نہیں آخر کار فرہاد وار جان شیریں تلف کرتا ہے:

غرض انجام اُلفت کا برا ہے — کہ جو محبوب ہے سو دل رُبا ہے
دل آزاری ہے ہر دم کام ان کا — جفا جوئی وفا ہے نام اُن کا
ستم گر ہیں یہ سفاک جہاں سب — کہ ہے عاشق کشی سے اُن کو مطلب
دل آزار و جفا جو فتنہ گر ہیں — خدا شاہد ہے بت بانی شر ہیں

بیٹا! اپنے کو سنبھالو یہ مقام ساحران غدار اور جادوگران نابکار ہے۔ خدا نے ہمیں اپنی راہ میں جہاد کے لیے پیدا کیا ہے نہ کہ حسن و عشق کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر آہ و فریاد کے لیے۔

یہ فرما امیر تو اُدھر روانہ ہوئے اور عمر عیار منہ بنائے ہوئے شہزادے کے پاس آئے اور کہنے لگے، برخوردار ہم سے اب ملازمت نہیں ہوتی، جس کا بیٹے کی طرف سے ایسا پتھر کا دل ہو اس سے کیا امید۔ اپنا وقت بھول گیا۔ ملکہ مہر نگار کی چاہت میں کہاں کہاں جھک مارتا پھرا۔ ملکہ روشن تن کے لیے کوہ قاف تک کی خاک چھان ڈالی اور اب بھی اگر کوئی صورت نظر آ جاتی ہے تو کیا بتاؤں کیا حال کرتا ہے۔ مگر بیٹے کی طرف سے ذرا فکر نہیں۔ کہتا ہے کہ

سمجھا بجھا کر عشق کی آگ کو ٹھنڈا کر دو۔ تو قرۃ العین سمجھ جاؤ۔ محبت کے شعلوں پر خاک ڈال دو۔ لیکن میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ عزیز من نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال' تمھاری جان دو بھر ہو تو صبر و جبر کی تلقین کروں۔" یہ کہہ کر جھوٹ موٹ رونے لگے۔ شہزادے نے جو عمر کو ہمدرد پایا تو بولا، چچا! آپ کو اگر میرا خیال ہے تو اس آفت روزگار کا پتا لگایئے اور اس کے شربت وصل سے سیراب کیجیے۔ خواجہ نے بسورتے ہوئے منہ سے جواب دیا، جان عم مجھ کو تلاش کرنے میں کیا عذر تھا مگر کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میرے پاس ایک خرمہرہ نہیں کہ کسی کو دے کر دریافت کروں اور جب تک کچھ فائدہ نہ ہو کسی کو کیا پڑی کہ اس کا پتا بتائے۔ غیر ملک، غیر مذہب، برا زمانہ، برا وقت۔ یہاں کے لوگوں سے دشمنی اور یہ بھی دستور ہے:

خواہی کہ دل دلبرا نرم شود — ور پردہ بروں آید بے شرم شود
زاری مکن و زور مکن زر بفرلیس — زر بر سر فولاد نہی نرم شود

مہر سپہر عیاری کا عرض کرنا تھا کہ شہزادہ سمجھا یہ حضرت بغیر مٹھی گرم کیے کب ملتے ہیں فوراً دس ہزار روپیہ منگوا آگے رکھا اور کہا، اس وقت اتنا تو حاضر ہے، جب خبر آجائے گی ان شاء اللہ دو چند اور پیش کروں گا۔ خواجہ وہ روپے داخل زنبیل مبارک کر، خدمت امیر نامدار میں حاضر ہوئے اور گزارش کیا۔ پیرو مرشد کمترین نے ہر چند سمجھایا حسن کی بے وفائی، حسینوں کی کج ادائی، عشق کی خانہ خرابی، دل لگانے کا انجام بخوبی تمام بتایا مگر وہ کب سنتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جب تک یہ اچھی طرح خاک صحرائے محبت نہ چھانیں گے آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ اگر حکم عالی ہو تو بندہ پتا لگا کر کوئی بندوبست کرے۔ امیر نامدار نے فرمایا۔ بھائی اگر تم سے ہو سکے تو اس سے کیا بہتر ہے اور ایک ہزار اشرفی خواجہ کو دی کہ یہ زاد راہ ہے، جلد آنے کا قصد کرنا۔ خواجہ رخصت ہو اپنی اصلی صورت میں کوتوالی چبوترہ پر آئے۔ یعنی وہی ناریل سر سا، تکیہ سا چہرہ، چلغوزہ سی ناک، زیرہ سی آنکھیں، بتاسا سی ٹھوڑی، تنکا سے چند بال داڑھی کے مگر سیدھے، پونگی سے شانے، ٹوکرا سا سینہ، تیلی سے ہاتھ پاؤں، مٹکا سا پیٹ، ناف جیسے آب خورہ مٹکے پر اوندھا ہوا اور بان ہائے عیاری سے آراستہ ہوئے۔ سامان سفر زنبیل سے نکالا، تاج عیاری سر پر رکھا۔ جیغۂ شہنشاہی درست کیا۔ کسوتیں رنگیں، تنگ و چست بر میں۔ دام جناب مہتر الیاس کا دوش پر۔ منگیزۂ خضر زیب کتف۔ گلیم عیاری کاندھے پر۔ دیو جامہ حضرت آدم صفی اللہ کا پہنا۔ ایک توبرہ جس میں سنگ تراشیدہ و خراشیدہ بھرے تھے برابر ان کے لٹکایا۔ بچھو برق دم۔ ایک جوڑی خنجر آب دار کی کمر میں۔ گروہ سپر عیاری پشت پر، قربان میں کمان۔ ہزار تیر کا ترکش پیچھے۔ دست پنجۂ عیاری بغل میں۔ چرب بسیلہ عیاری سے ہاتھ چرب۔ دو ڈلیاں جن میں حبوب بے ہوشی بھرے جبڑوں میں دبی۔ بیلہ ہائے بے ہوشی جیب ہائے عیاری میں۔ کمند عیاری ریشم سیاہ کی باریک و بل دار بازوؤں پر۔ نفت آتش بازی گھائیوں میں۔ موے ولایتی سیاہ تا بزانو۔ ایک ایک جوڑی کڑ لگ

کی اندر موزوں کے، غرض یہ کہ ہر طرح سے لیس ہو، تلاشِ معشوقہ بدیع الزماں میں روانہ ہوئے اور راستہ طے و
پے کرتے چلے جاتے ہیں اور اب دیدہ خواہد شد کہ کیا ہوتا ہے۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

"واہ میر صاحب واہ۔ سبحان اللہ کیا کہتا ہے۔"

"جی پیر و مرشد مجھے کیا آتا ہے۔"

"میر صاحب: آپ کے دم سے بھی دلی شہر میں آبادی کا لطف آ جاتا ہے۔ اتنے سے مکان میں ماشاءاللہ
شیخ، سید، مغل، پٹھان سب ہی تو موجود ہیں۔ یہ صورتیں یہاں کے سوا اور کہاں دیکھنے میں آتی ہیں۔"

"خدا رکھے آپ لوگوں کو یہ سب چہل پہل آپ ہی کے قدموں کی ہے۔"

لکھنوی: قسم ہے حضرت عباس کی۔ داستان بھی ایسی ہوئی کہ جوانی یاد آ گئی اور نشے بھی خوب ہی گٹھے۔

مرزا جی: اور چائے کو نہیں کہتے۔ قسم اللہ کی وہ پیارا رنگ آیا ہے کہ جی چاہتا ہے دیکھا ہی کرو۔ اپنے حسابوں
گلاب کے تختے کی سیر کر رہے ہیں۔

میر صاحب: مرزا صاحب مسلمانی اور یہ تاکا فی۔ ایک پیالی ادھر بھی عنایت ہو۔

مرزا جی: میر صاحب چائے آپ کے کتوں کو۔ یہ آپ نے کیا کہا۔ ذرا پہلے ایک چسکی لگا لو۔

میر صاحب: اچھا ہمارے چھوٹے میاں کو دیجیے۔

رات زیادہ آ گئی تھی۔ میں چائے سے انکار کر اور اس سارے منڈلی کو اصرار کرتا ہوا چھوڑ گھر روانہ ہوا۔

دلی کی چند عجیب ہستیاں۔

اشرف صبوحی

میر باقر علی

ملا واحدی

میر باقر علی کی بھی بڑی اہم شخصیت تھی۔ دلّی ہی میں نہیں، پورے ہندوستان میں۔ اخبار نویس میر جالب سے برتر پیدا ہوں گے اور ہوئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر نے اخبار نویسی کو چمکا دیا۔ لیکن داستان گو میر باقر علی سے گھٹ کر بھی آئندہ پیدا نہیں ہوگا۔ داستان گوئی کے فن نے ہی دم توڑ دیا۔

میر باقر علی میر جالب کے ہاں قریباً روز تشریف لاتے تھے اور دونوں خوب گھٹتی تھی۔ میر باقر علی کو بھی میر جالب کی طرح معلومات بڑھاتے رہنے کا شوق اور چسکا تھا۔ میر جالب راہ چلتے طبع شدہ کاغذ پڑا پاتے تھے تو اُسے اٹھا لیتے تھے اور پڑھتے تھے کہ شاید کوئی کام کی بات مل جائے۔ میر باقر علی نے بڑھاپے میں حکیم اجمل سے حکم لکھوایا تھا کہ طبیہ کالج کے تمام اساتذہ انھیں طلبا کے ساتھ بیٹھنے دیں۔ میر باقر علی کی داستانیں تازہ بہ تازہ معلومات آراستہ ہوتی تھیں۔

میں مہینے کے مہینے اپنے گھر میں میر باقر علی کی داستان کہواتا تھا۔ دوسرے تیسرے مہینے راجہ نوشاد علی خان ولی عہد تعلقہ جہانگیر آباد (اودھ) محض میر باقر علی داستان سننے آتے تھے۔ یہ محفل راجہ ہمایوں کے مقبرے میں جمتی تھی، خواجہ حسن نظامی کے اہتمام سے۔

میر باقر علی کی داستان کا ذرا سا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے۔ کوئی بے عقل صاحب بھاوج کو لینے بھاوج کے میکے جا رہے ہیں۔ بھائی نے ہدایت کر دی ہے کہ گفتگو کرنا "ہاں" اور "نہیں" کے سوا باتیں نہ ملانا۔ راستے میں کہیں منڈاسا [پگڑی] سر کے نیچے رکھ کر سو گئے اور آم کا اچار اور روٹیاں منڈاسے کے اندر لپیٹ لیں۔ روٹیوں کی بو کتے نے سونگھی تو وہ منڈاسا لے اُڑا۔ بے عقل صاحب بھائی کی سسرال ننگے سر پہنچے تو بھائی کے سسر نے کہا: "ننگے سر کیسے، خیر تو ہے؟"۔

جواب دیا: "نہیں"۔

بھائی کے سسر نے پوچھا: "تمھارے بھائی کیا کچھ علیل ہیں؟"۔

جواب دیا: "ہاں"۔

پوچھا: "علاج ہو رہا ہے؟"۔

جواب دیا: "نہیں"۔

بھائی کے سسر بھی عقل مند تھے، بولے: "صاف کیوں نہیں کہتے کہ مر گئے"۔

جواب دیا: "ہاں"۔

بے عقل صاحب نے بھائی کی ہدایت کے مطابق ایک دفعہ "ہاں" اور ایک دفعہ "نہیں" کہا تھا۔ بھائی کے سسرال میں کہرام مچ گیا۔ بھاوج عدت بیٹھ گئیں۔ غرض خالی ہاتھ لوٹے۔

اب یہاں سے میر باقر علی کی زبان سے ہے اور میر باقر علی کے الفاظ۔ بھائی نے پوچھا: "بھاوج کو نہیں لائے؟"۔

انھوں نے کہا: "اجی جناب! بھاوج کو کیا لاتا، وہ تو رانڈ ہو گئیں"۔

بھائی نے کہا: "اے تیرا ستیاناس! میں جیتا بیٹھا ہوں اور وہ رانڈ ہو گئیں"۔

انھوں نے کہا: "آپ کا کیا ہے، پھوپھی اماں رانڈ ہوئیں، آپ بیٹھے رہے۔ آپ کا کیا ہے آپ تو بیٹھے ہی رہیں گے"۔

راستے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ایک دن ایک ایسے جنگل میں پہنچے کہ جہاں قریہ، قصبہ، جھانوڑا، کریہ، نگرا، نزماوہ، سرائے، ماجرا، بجیہ، چوپالا، پن چوکی، بیٹھک، نگاؤں، گھراؤں، کھیت، اتارا، گھیر، گھڑھی، پڑاؤ کچھ نظر نہ آیا، کف دست میدان سنسان، بیابان، مگر ابر بلند ہو چکا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ (الخ)

اتنے مترادف الفاظ کم از کم میں تو جمع کر نہیں سکتا۔

سرائے کا نقشہ کھینچتے ہیں: کچا دروازہ، بانسوں کے کواڑ، اندر سرائے کے کالی کیچڑ، گوبر اور بھوسہ ملا پانی بہہ رہا ہے۔ صحن میں ایک چھکڑا کھڑا ہے، جس پر بھیگے ہوئے خونڈرے پھیلے ہیں، وچھپر ہے تو ایسا کہ جگہ جگہ ڈھانچ۔ ایک طرف بھٹیاری، کالا رنگ، اُپلا سا چہرہ، چندھیاں سی آنکھیں، چپٹی ناک، نیلی سوسی کا پاجامہ، ادھوڑی کا جوتا، لال کرتی گلے میں، چندری سر پر، بیٹھی ہے، ہاتھ میں آنے کا پیڑا۔ یہ پہنچے اور بولے: "بی بھٹیاری! ہم رات بھر ٹھہریں گے"۔ جواب ملا "میں صدقے، وہ سامنے بنگلہ ہے۔ بسم اللہ ٹھہریے"۔ (الخ)

میر باقر علی کی کئی داستانیں مولانا ماہر دہلوی کو حفظ ہیں۔ میں نے اُن ہی کے حافظے سے فائدہ اُٹھایا

ہے۔ مولانا ماہر پیدائشی نابینا ہیں۔ اُن کی کنیت ابوالکمال ہے۔ ممکن ہے کسی بیٹے کا نام کمال ہو۔ لیکن ویسے بھی صاحب کمال ہیں۔ عالم دین ہیں۔ طبیب ہیں اور حافظ قرآن تو ہونا ہی چاہیے۔ حافظے کا یہ عالم ہے کہ سنی ہوئی لمبی لمبی داستانیں لفظ بہ لفظ یاد ہیں۔

چند فقرے اور پڑھ لیجیے۔ میر باقر علی نئی بیاہی ہوئی لڑکیوں کو سمجھاتے ہیں:

"یہ ذہن نشین کرلو کہ اب تم ماں باپ کے گھر میں نہیں ہو۔ ساس سسر تم سے اُس طرح محبت نہیں کریں گے، جس طرح ماں باپ کرتے تھے۔ سسرال میں ناحق کوئی سخت سست کہے تو سمجھو کہ وہ آدمیت سے گرگیا۔ تم اُسے ویسا ہی جواب دو گی تو تم بھی آدمیت سے گر جاؤ گی۔ ایک دانشمند کا قول ہے کہ غصے کی ابتدا جنون ہے اور انتہا پشیمانی۔ جس زبان سے اللہ پاک کا نام لیا جائے اُس سے گالی کوسنا نہ نکلنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جسے نوازتا ہے اُسے منی آرڈر نہیں بھیجتا، اُس کے خیالات درست فرما دیتا ہے۔ عاقل کی زبان کے آگے عقل ہوتی ہے اور بے وقوف کی عقل کے آگے زبان۔ تم ہمیشہ عقل سے کام لو۔ بات جب تک تمھارے منہ میں ہے تمھاری غلام ہے اور جب منہ سے نکل گئی تو تم اُس کی غلام ہو گئیں۔ اپنی زندگی بیبیو! غلامی میں نہ گزارو۔ آقا بن کر جیو۔" (الخ)

میر باقر لکیر کی فقیر نہیں تھے۔ میر باقر علی کی داستانیں طبع زاد ہوا کرتی تھیں۔ داستانوں میں علم و حکمت کے موتی بکھیرتے تھے۔ طب جسمانی، طب روحانی، علم الارض، علم الافلاک اور طبیعات وغیرہ کے نکات اور ذاتی تجربات عجیب دلچسپ طریقے سے شامل کرتے چلے جاتے تھے۔

قد اوسط درجے کا تھا اور دبلے پتلے، دھان پان انسان تھے۔ لیکن داستان میں بادشاہ کا ذکر آجاتا تو بادشاہ کا پارٹ اس شان سے ادا کرتے تھے کہ گمان ہونے لگتا تھا کہ ہمارے سامنے داستان گو داستان نہیں بیان کر رہا، ہم تھہار بادشاہ کے دربار میں حاضر ہیں۔

میر باقر علی راجاؤں اور نوابوں اور بڑے بڑے اُمرا کے ہاں داستان کہنے جاتے تھے، لیکن ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے خودداری کو کھویا ہو۔ کوئی نو دولتا یا طور طریقوں سے ناواقف رئیس یا امیر دون کی لیتا تو داستان داستان میں اس کی خبر لے ڈالتے تھے۔ میر باقر علی لیے دیے رہتے تھے۔

میر باقر علی داستان گو

شاہد احمد دہلوی

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہوئے۔ دبلے پتلے سے آدمی تھے، سفید چھوٹی سی داڑھی، سر پر دو پلی، پاؤں میں دیسی جوتی، انگرکھا اور چست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان، کھلتا ہوا رنگ، ستواں ناک، میانہ قد، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ داستان سنانے دور دور جاتے تھے۔ رجواڑوں اور نوابوں میں بلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لیے ملازم بھی رہے۔ رئیس مر گیا تو دلی واپس آ گئے۔ املی کی پہاڑی پر گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سینما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پرسش ختم ہو گئی۔ دلی کے ہندو رئیس چھنامل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چھنامل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سن رہے ہیں۔ بیس پچیس سال ہو گئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانہ میں داستان سنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حصہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ میر صاحب ہمیشہ داستان امیر حمزہ ہی سنایا کرتے تھے۔ ایک نے ان سے پوچھا کہ میر صاحب! یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے "عمر بھر میں ایک دفعہ"۔

میر صاحب کے آباؤ اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً انھی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور اس نے تنگ آ کر کہا "آج پردہ اٹھ جانا چاہیے"

تب کہیں وہ پردہ اٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ ملتا جلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں۔ زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں نام گنا جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے۔ درمیانہ طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں۔ بھٹیاریاں، سقنیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجہ سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سو ڈیڑھ سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں، ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑتے نہ تھے، بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ مثلاً منجنیق کو بیان کرنے ہی میں پندرہ منٹ صرف کر دیے۔ عورت کا حسن بیان کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ اور کچھ نہیں تو چال کی ہی سیکڑوں قسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا، بیگم دہلیز نہیں پھلانگتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اپرانے یا اکتانے لگیں۔ انھوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔ ہر علم کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ اور تو اور جب دلی میں طبیہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اجلی اجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔ اس پر قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقے کا دور چلتا رہتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔ اسے روئی میں لپیٹتے، پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اسے کو اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون دھل کر پانی میں آ جاتی تو روئی اگالدان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ فرماتے "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو۔ پھر داستان شروع کر دیتے۔

دلی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے پھر ایک دور ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی

اکھڑنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر پر داستان کہنی شروع کردی۔ اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔ دس بیس شائقین آ جاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا۔ بعض دفعہ سامعین کی حسب فرمائش کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا نقشہ آ جاتا۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو عیاریاں بیان ہو جائیں اور میر صاحب عیاروں کے کارنامے بیان کرنے لگتے۔ میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ ایک دن ہم بھی سننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو کے آگے کتاب کھلی دھری ہے۔ اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور بہت جوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اونچا کر لیتے ہیں۔ طبیعت بڑی مکدر ہوئی۔ جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی یہاں آ جاتے تو کلکتے والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کسے کہتے ہیں۔ نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کولوٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔ قصہ مختصر میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا: ''حضور یہ اعجاز ہے، حضور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔''

جب داستان سننے والوں کا قحط ہو گیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں۔ مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ ''گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی''، ''پاجی پڑوس''، ''سولا بخش ہاتھی'' اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں۔ جو ایک بار چھپنے کے بعد پھر نہیں چھپیں۔ اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے مگر جو لطف ان کی تقریر میں تھا تحریر میں نہ آ سکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر بیڑا کی شاگرد تھے۔ جن بزرگوں نے میر بیڑا کی داستانیں سنی تھیں کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ غالباً فرق یہی ہوگا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کسمپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دلی کا کامل الفن آخری داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لیے چھالیا بیچتا تھا۔

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

⁂

بزم خوش نفساں، شاہد احمد دہلوی،

مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

میر باقر علی داستان گو

سید یوسف بخاری دہلوی

میر باقر علی دلی مرحوم کے مشہور داستان گو تھے، جن کی ممتاز تخلیقات، خلیل خاں فاختہ، بہادر شاہ کا مولا بخش ہاتھی، گاڑھے خان کا دکھڑا، گاڑھے خان نے ململ جان کو طلاق دے دی، اہل محلہ اور نا اہل پڑوسی، طلسم ہوش افزا، ارارادھوں اور خاتمہ، داستان اردو کے کلاسیکی ادب میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے چند چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

باتوں کی باتیں، کام کی باتیں، کانا باتی، فقیر کی جھولی، استانی، آداب و اخلاق، آقا و نوکر، چوری و سینہ زوری، کون؟۔ آخر الذکر کتابوں میں داستان کا رنگ تو نہیں ملتا البتہ یاد رکھنے کے لائق بہت سی کام کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں میں سے نمبر 6 سے 8 تک اور 15 سے 17 تک اب تقریباً ناپید ہیں اور باقی نایاب یا کم یاب ہیں، البتہ "خلیل خاں کی فاختہ" کو میر صاحب مرحوم کے داماد جعفر حسین نقوی نے پھر شائع کر دیا ہے۔

میر باقر علی 1850ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر حسین علی تھا۔ ایرانی نژاد تھے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں کی آغوش اور اپنے نانا امیر علی عرف میر بڈھا، قصہ گو قلعہ معلی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی جو ان دنوں ڈھوسوں کی گلی واقع ترکمان دروازہ، دہلی میں رہا کرتے تھے۔ سات برس ہوئے تو ناگہاں دلی میں 1807ء کا ہنگامۂ دغا برپا ہوا۔ اس افراتفری اور مار دھاڑ کے زمانے میں اپنی والدہ اور نانا کے ہمراہ اور رواں دواں علی گنج، واقع شاہراہ قطب (مہرولی) مقبرہ صفدر جنگ دلی پہنچ کر پناہ لی۔ جب امن بحال ہوا اور اسی جمی ہوئی تو واپس آئے۔ ابتدا میں محلہ فراش خانہ میں آباد ہوئے۔ عمر کے آخری ایام میں پہاڑی بھوجلا پر سکونت اختیار کی۔ 78 برس کی عمر پائی۔ 1928ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

میر امیر علی کے بعد جو غدر کی کھکھیڑ اٹھا کر کچھ مدت کے بعد چل بسے تھے میر باقر علی نے باقیات میں صرف

اپنے حقیقی ماموں، میر باقر کاظم علی کو پایا۔ میر کاظم علی اپنے وقت کے طوطیِ رنگیں بیاں اور بلبلِ ہزار داستان تھے۔ ہم نے تو نہ انہیں دیکھا اور نہ سنا، ہاں جن بڑے بوڑھوں نے انہیں دیکھا اور سنا، ان سے معلوم ہوا کہ میر کاظم علی جب داستان چھیڑتے تو ان کی مقراضِ زباں گل کترتی اور لب شکر ریزی کرتے تھے۔ کبھی بزم آراستہ کرتے، کبھی رزم کا نقشا جماتے۔ طلسم کشائی کی شرح کرتے تو اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دل مسخر کر لیتے۔ دلی چھوڑ فیض آباد اور لکھنؤ والے بھی ان کی تیغِ زباں کا لوہا مانتے تھے۔ ان کی یہ شہرت انہیں کشاں کشاں دکن لے گئی۔ ہر چند کہ ان کے خمیر میں دلی کا آب و گل تھا لیکن سرآسماں جاہ بہادر کی قدر دانی اور وہاں کی آب و ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ اسی خاک کا پیوند ہو گئے۔ انھی میر کاظم علی سے میر باقر علی نے داستان گوئی کا فن حاصل کیا اور اس فن میں ایسے طاق ہوئے کہ دوسروں کو طاق پر بٹھا دیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ میر کاظم علی اگر اپنے وقت کے حاتم داستان تھے تو میر باقر علی اس کے خاتم ہوئے اور خاتم بھی ایسے کہ اپنی اولاد تک میں بجز ایک صاحبزادی باقری بیگم جو اپنی ماں وزیر بیگم بنت ولاور مرزا کے بطن سے تھیں اور کسی کو نہ چھوڑا۔

باقری بیگم، سید صغیر حسین کی بیوی، طبیہ کالج کی سند یافتہ طبیبہ اور قابلہ تھیں۔ ''استانی'' ان کی تصنیف ہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان آ گئیں۔ 1952ء میں وہ بھی چل بسیں۔ مرحومہ کی یادگار ان کے دو لڑکے سید رضی حسین اور سید شہنشاہ حسین ہیں جو اس وقت زیرِ تعلیم ہیں۔

ہم نے میر باقر علی کو سب سے پہلے اپنے لڑکپن میں دلی کے عربک اسکول، اجمیری دروازے میں دیکھا۔ اس وقت ہم چھٹی جماعت میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ 1919ء کا ہنگامہ خیز زمانہ تھا۔ خلافت کا دورِ جدید۔ اس تحریک کے بانی علی برادران (مولانا شوکت علی و محمد علی) تھے جو ان دنوں پورے شباب پر تھی۔ اسی تحریک کا ایک شگوفہ، گاندھی جی کا کھلایا ہوا، بدیشی مال کا بائیکاٹ اور کھدر پوشی کا زبردست پرچار تھا۔ ادھر سینما کے وجود اور فلمی کہانیوں کی کثرتِ نمائش نے داستان گوئی کے رنگ کو پھیکا کر دیا تھا۔ چنانچہ میر صاحب کی داستان گوئی کا بازار بھی خاصا ٹھنڈا پڑ چکا تھا، لیکن میر صاحب بھلا اس سرد بازاری سے کب مات کھانے والے تھے۔ انھوں نے بھی پینترا بدلا اور نئے انداز اور تیوروں کے ساتھ خم ٹھونک کر سامنے آئے۔ حکیم اجمل خاں کا اشارہ پا کر اپنے قلم کی ایک دو ہی جنبشوں میں: ''گھاڑے خاں کا دکھڑا'' اور ''گھاڑے خان نے ململ جان کو طلاق دے دی'' دھر کے گھسیٹ مارا۔ حکیم اجمل خان سے میر صاحب کی رسم و راہ ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں کے وقت سے تھی۔ حکیم عبدالمجید خاں کے بعد حکیم صاحب گاہ بگاہ اپنے دیوان خانہ شریفی میں باقر علی سے داستان سنا کرتے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی ذات مستحق غربا کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ حق یوں ہے کہ وہ اہلِ فن کے خاموش قدر دان اور سرپرست تھے۔ ان کی داد و دہش کا انداز بھی حکیمانہ اور شریفانہ تھا۔ ان کے الطاف و اکرام کی صورت یہ تھی کہ میر

صاحب جب ضرورت مند ہوتے تو دو چار سیر چھالیا کی ایک پوٹلی لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کرتے "حکیم صاحب کچھ چھالیا لایا ہوں، اگر پہلی چھالیا ختم ہو گئی ہو اور اس وقت ضرورت ہو تو حاضر ہے" حکیم صاحب فرماتے "میر صاحب میں تو کئی دن سے آپ کا منتظر تھا اچھا ہوا آپ آ گئے چھالیا گھر میں بھجوا دیجئے اور دیکھیے اپنی خالی پوٹلی ابھی لیتے جایئے گا"۔

یہ پوٹلی حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق زنان خانے سے بظاہر بالکل خالی آتی تھی لیکن دراصل ایک معقول رقم سے اور وہ بھی نوٹوں کی شکل میں پر ہوتی۔ رخصت ہوتے وقت حکیم صاحب فرماتے۔ "میر صاحب میں رام پور ہو آیا ہوں، فرصت ہو تو آئندہ اتوار کو اپنی باقی ماندہ داستان پوری کر دیجیے گا۔ سننے والے حکیم صاحب اور ان کے مخصوص اور کہنے والے میر صاحب دونوں اپنے دم واپسیں تک سنتے اور کہتے رہے لیکن داستان نہ پوری تھی اور نہ ہوئی۔ اس طرح دلی کے مشہور رئیس لالہ چھنامل بھی میر صاحب کے دل دادہ اور قدر دان تھے۔ ایک مدت تک وہاں سے بھی ان کو چالیس پچاس روپے ماہوار داستان گوئی کا نذرانہ ملتا رہا۔ چھنامل والے ابھی یہی کہا کرتے تھے کہ ہم کو داستان سنتے سنتے بیس بائیس سال گزر گئے لیکن داستان آج تک ختم نہیں ہوئی۔ کسی نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کسی کے روبرو اس داستان کو ختم بھی کیا ہے۔ بولے۔ "عمر میں صرف ایک مرتبہ"۔ میر صاحب کہا کرتے تھے کہ سامعین کے پر شوق تقاضوں سے تنگ آ کر میں ایک دو بار دو تین سال کی مدت میں واقعات کا پردہ اٹھا کر انجام کی جھلک دکھا دیتا ہوں لیکن میرے بزرگوں کی داستان گوئی کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بارہ بارہ سال کے بعد عاشق و معشوق کے درمیان کا حجاب اٹھاتے وہ بھی رسمی طور پر۔

میر صاحب مرحوم کے بقول "داستان کہنے والے کی عمر کوتاہ اور سننے والوں کی عمر دراز۔" ان کا ذکر بھی داستان سے کم نہیں۔ جس روز ہم نے ان کا پہلی مرتبہ دیدار کیا، بہت دور سے اچٹتا ہوا دیکھا تھا، کیونکہ عربک اسکول کے صدر دروازے کی اندرونی محراب کے نیچے جملہ اساتذہ اور طلاب کا جم غفیر دربار خلافت میں جمع تھا جہاں ہمارے میر صاحب "گاڑھے خان" کے روپ میں، چندے آفتاب چندے ماہتاب، کھیس بدن، نگل پیرہن، شریک حیات، محرم و ہم راز، آفت خانہ، فتنۂ زمانہ بی ململ جان کو اپنی طلاقت زبان سے طلاق بائن دے رہے تھے۔ ہندوستان بھر میں بدیشی مال کی دھجیاں بکھر رہی تھیں۔ گھر گھر سے ململ جان کو در در ہونے لگی اور دیس نکالا ملنے لگا۔ آخر حکومت وقت نے ان دونوں رسالوں کی اشاعت و فروخت پر خفیہ پابندی لگائی۔ بڑی خبر ہوئی کہ میر صاحب کو اس مطلقہ بندی، ململ جان کی طلاق کی پاداش میں بندی خانے نہ بھیجا۔

میر صاحب اسکولوں کالجوں اور دلی کے روساء ہاں تو مدعو ہوتے ہی تھے لیکن ہفتے میں ایک بار وہ خود اپنے گھر پر بھی 9 بجے سے 12 بجے تک داستان سنایا کرتے تھے۔ اس وسیع مجمع میں دلی کے اکثر منچلے اور بعض پرانے

روڑے زبان کا چٹخارہ حاصل کرنے کے لیے بڑے شوق و امنگ سے ان کے ہاں جایا اور داستان سنا کرتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ان کو مقرر کائنات کا خطاب دیا تھا۔ دلّی کے علاوہ حیدرآباد دکن، رام پور، لوہارو، دوجانہ، دتیا، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، جہانگیر آباد اور کشمیر تک سے بلاوے آتے تھے اور میر صاحب وہاں جایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لیے ملازم بھی رہے لیکن میر صاحب جہاں گئے انھوں نے اپنی آن بان اور خودداری کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دی۔ جہاں کسی رئیس نے اپنی کچھ اکڑفوں دکھائی یا ذرا اپنے جامے سے باہر ہوا تو میر صاحب نے اول تو اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دے کر لاجواب کر دیا ورنہ داستان گوئی کے وقت داستان کے پردے میں ہی میں اس کی ایسی کی تیسی کر ڈالی۔ ایک دربار میں جب اول بار طلب ہوئے تو صافہ باندھ کر حاضر ہونے کا حکم ملا۔ میر صاحب کو بھلا اس شرط کی کہاں تاب تھی۔ ناظم مہمان خانہ سے انکار کر کے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ وہ غریب اپنی ملازمت کی بقا کے لیے دوڑا دوڑا پیچھے آیا، بار بار منت سماجت کی۔ اس کی گریہ زاری پر میر صاحب نیم راضی ہو گئے صافہ باندھنا تو منظور کر لیا لیکن دربار میں داخل ہوتے وقت صافہ اس شان سے باندھا کہ وہ آدھا سر پر تھا اور آدھا بغل میں اور وہ بھی بار بار میر صاحب کی قدم بوسی کرتا تھا۔ راجا میر صاحب کو بایں ہیت کذائی دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا۔ سمجھ گیا کہ دلی کا میر ہے اور اپنے فن کا امیر۔ امیر امیر سب برابر۔ مجبوراً کہنا پڑا کہ بابا آپ جس طرح چاہو آؤ۔

علی گڑھ میں آپ نواب محمد اسحاق کے ہاں داستان سنایا کرتے تھے۔ میر صاحب نے اپنی داستان میں عالمانہ شان اور بوقلمونی پیدا کرنے کے لیے مختلف علوم و فنون میں اس طرح معلومات حاصل کیں کہ باقاعدہ داخلہ تو نہیں لیا لیکن مسجد فتح پوری اور طبیہ کالج دہلی وغیرہ میں ایک مدت تک طلبہ کے درمیان بیٹھ کر ان کے اسباق کو بغور سنتے اور نوٹ کرتے رہے۔ چنانچہ طب اسلامی کے نصاب میں فلسفہ، ریاضی، ادب، نفسیات، منطق، فلکیات وغیرہ کے متعلق اتنی معلومات اکٹھی کر لیں کہ داستانوں میں ان علوم کے نکات سن کر میر صاحب کے متعلق یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید انھیں ان علوم پر بھی دسترس حاصل ہے۔

داستان گو کا حافظہ تو ویسے ہی قوی ہوتا ہے لیکن میر صاحب کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ پوری داستان حمزہ اور نہ معلوم ایسی کتنی داستانیں ان کو ازبر تھیں۔ کفر و اسلام کی جنگ آزمائیاں، حسن و عشق کی کارفرمائیاں، طلسم کشائیاں اور مختلف کرداروں کی عیاریاں بیان ہوتی تھیں۔ ولی سے لے کر اپنے وقت کے مشہور شعراء فارسی و اردو کے اکثر اشعار موقع و محل پر استعمال کیا کرتے تھے۔ انھوں نے چھوٹی موٹی کہانیاں اور داستانیں خود بھی لکھیں۔ داستان گوئی کا یہ عالم تھا کہ تلفظ، الفاظ کی اونچ نیچ کو چھوڑ کر وہ اپنی آواز کے زیر و بم، لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ اور موقع و محل کی مناسبت سے ہر متنفس کی ایسی نقل اتارتے کہ خود تصویر بن جاتے۔ زمین ہو یا آسمان انسانوں کی بستی ہو یا دیوں

کی، پریوں اور حیوانات کا مسکن، جملہ مناظر۔ بزم ہو یا رزم ماضی کی شوکت وعظمت، اسلاف کے کارنامے، قوموں کے عروج وزوال کے افسانے، دنیا کی بے ثباتی، خواص وعوام کی زندگی، معاشرت، رسوم ورواج کی جھلکیاں، حسن وعشق کی کارفرمائیاں، دنیا جہاں کی استعمالی اشیا، ان کے نام، چہرہ مہرہ، خواص، انسانی حیوانی سراپے، خاکے، نظم ونثر میں دلّی کی ٹکسالی زبان میں اس طرح بیان کرتے کہ کہیں ہچکی نہ لیتے، کسی میدان میں جھول نہ آتا۔ داستان گوئی کے پردے میں قوم کی حالت بتا کر روشن مستقبل کی راہ سجھاتے۔ سنگیت پر ان کو اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔ بعض اوقات گویوں کو ان کی لغزش پر ٹوک دیتے۔ کوئی شامت کا مارا اکڑتا یا بگڑتا تو موسیقی کے قانون اور اصولوں سے اس کو اسی وقت چت کر دیتے۔ قاری سرفراز حسین دھلوی کو ان کے ناول "سزائے عیش" کے لیے ہجڑوں کی لڑائی کا ایک باب لکھ کر دیا تھا وہ اس میں شامل ہے۔

راقم نے کئی بار اپنے والد کے ہمراہ حکیم اجمل کے دیوان خانے میں ان کی داستانیں سنیں، مگر یاد رکھنے یا لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی بھی شاگرد نہیں چھوڑا، لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میر صاحب کے کچے یا پکے آدھے یا پونے برائے نام دو شاگرد بھی ہوئے۔ اول شاگرد خود ان کی صاجزادی تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ سے اس فن میں تھوڑا بہت ملکہ حاصل کیا تھا، وہ اب چل بسیں۔ دوسرے شاگرد میرے مشفق ذوالفقار علی بخاری صاحب ہیں۔ میں میر صاحب کی زندگی میں صرف میر صاحب کو سنا کرتا تھا لیکن بخاری صاحب سنا بھی کرتے اور کچھ ان سے سیکھا بھی کرتے تھے۔ میں نے ان کی داستان کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا ان سے سن کر اپنی یادداشت میں کبھی نوٹ کر لیا تھا۔ وہ بطور نمونہ نذر ناظرین ہے۔ لیکن اسے پڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ یہ پارہ داستان میر صاحب مرحوم کا ہے اور بخاری صاحب کی یادداشت کا ثمر ہے اور میری صرف کورانہ نقل، اس لئے اس کی صحت اور عدم صحت کے عذاب ثواب سے راقم بری الذمہ ہے۔

حکیم اجمل خان کا دیوان خانہ ہے، سفید براق مکلف فرش ہے۔ قالینوں کے ساتھ سہارے کے لیے تکیے لگے ہیں۔ دیواروں پر جا بجا مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور کتبے آویزاں ہیں۔ دروازوں پر بناپٹی کے پردے لٹک رہے ہیں۔ حکیم صاحب اپنے مخصوص احباب کے درمیان تشریف فرما ہیں۔ ان کے سامنے ایک مناسب مقام پر میر صاحب جلوہ گر ہیں۔ اس محفل میں ان کی وہ روایتی اور تاریخی مکلف چوبی چوکی نہیں ہے جس پر میر صاحب محفل میں بیٹھ کر داستان سرائی کرتے تھے۔ دو تین بیدری کام کے فرشی حقے اور لمبی پیچ دار اسنک والی کلی کا دور جاری ہے۔ پان کے بیڑوں سے پر چاندی کا ایک خاصدان، اس کے قریب ہی اگالدان حکیم صاحب کے پاس موجود ہے۔

میر صاحب کا چہرہ مہرہ اور حلیہ ملاحظہ ہو۔ دبلے پتلے، درمیانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، خشخاشی داڑھی، سر

پر روئی کا کنٹوپ ۔اس کے دونوں سرے الٹے ہوئے جو ٹوپی سی بن گئے ہیں۔سیاہ زمیں اور لال بوٹیوں کی چھینٹ کی کرتی ،سیر سوا سیر روئی کی رضائی ۔ٹانگوں میں خاکی زین کا پاجامہ ،موٹے اون کے موزے ، پاجامے کی موریوں پر چڑھے اور کسے ہوئے ۔شباہت میں کوئی فرق نہیں ہاں کسی قدر جھریا گئے ہیں۔

میر صاحب چنیا بیگم (افیون) کے عاشق زار تھے ۔بغیر نشہ گانٹھے داستان شروع نہ کرتے لیکن انجانوں کو ان کے افیونی ہونے کا شبہ تک نہ ہوتا۔میر صاحب نے جیب سے ایک چاندی کی ڈبیا اور ایک چھوٹی سی پیالی نکالی پھر افیون کی ایک گولی کو روئی کے پھوئے میں لپیٹا ، پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور اس اُنٹے کو اس میں ڈبو کر چٹکی سے گھولنا شروع کیا۔تھوڑی دیر میں افیون گھل کر پیالی میں آ گئی ۔روئی علیحدہ کر کے اگالدان میں ڈالی ۔پیالی اٹھا کر گھولوے کی ایک چسکی لگائی اس کے بعد چائے کے دو چار گھونٹ لیے ۔افیون کی تعریف سے اغماض برتتے ہوئے چائے کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوئے " چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند ، لب ریز ، اور لب سوز ہو" اس سوز نے ان کی منقراضی زباں کو سوز و ساز بخشا۔گل کترنے لگی ، داستان شروع ہو گئی:

" ایک تھا دیوانہ ۔برسات کا زمانہ تھا۔وہ اپنے کوٹھے کی چھت پر سوتا تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

کچھ نے چوسر کی بازی جما رکھی ہے۔کسی نے ستار چھیڑ رکھا ہے اور کچھ لوگ کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔یہ اُن کے قریب گیا۔سنا تو کہہ رہے تھے کہ بھئی سسرال بڑے مزے کی جگہ ہے۔

اُس نے جی میں کہا کہ ہم تو کبھی سسرال گئے نہیں۔صبح اٹھا۔اپنی ماں کے پاس گیا اور کہا " کہ بی تم نے ہمیں کبھی سسرال نہیں بھیجا " ۔اس نے کہا " بیٹا تم تو دیوانے ہو عقل مندوں کی باتیں کرو تو سسرال بھیجوں " ۔ان نے کہا " اماں ہم تو ڈوب مریں گے " ۔اس نے کہا " بیٹا! ناک کی سیدھ میں چلے جاؤ سسرال پہنچ جاؤ گے " ۔

یہ چلا ناک کی سیدھ ۔چلا جا رہا تھا کہ راستے میں آ گیا کھجور کا درخت ۔اس نے کہا یہ تو بہت خرابی ہوئی۔ خیر چڑھ گیا کھجور کے درخت پر ۔اب اترنے جو لگا تو پتے تو رہ گئے ہاتھ میں ، پاؤں لگے لٹکنے ۔اتنے میں دیکھا کہ دور سے ایک سانڈنی سوار چلا آ رہا ہے۔اُن نے آواز دی ۔" میاں سانڈنی سوار ذرا میرے پاؤں پکڑ لیو" سانڈنی سوار نے آ کر اس کے پاؤں پکڑے ۔پاؤں پکڑنے ہی تھے کہ نیچے سے سانڈنی نکل گئی اور یہ بھی لگا لٹکنے ۔اتنے میں دیوانے نے دیکھا کہ دور سے ایک آدمی ٹٹو پر سوار چلا آ رہا ہے۔ یہ چلایا " کہ میاں گھوڑ سوار ذرا ہمارے پاؤں پکڑ نا " گھوڑ سوار نے سانڈنی سوار کے پاؤں پکڑے ہی تھے کہ ٹٹو بدک کر دور نکل گیا ۔اب میاں ٹٹو سوار بھی لگے لٹکنے ۔اب دیوانہ کیا دیکھتا ہے کہ دور سے ایک بڈھا ڈوم گدھے پر سوار چلا آ رہا ہے دیوانے نے کہا کہ " بڑے میاں ذرا ہمارے پاؤں پکڑیو نہیں تو ہم مرے " ڈوم بولا ۔" بھیا! میں بڈھا آدمی ہوں مجھ سے پاؤں کیوں پکڑواتے

ہو؟" خیر تینوں نے منت سماجت کی تو بوڑھے ڈوم نے درخت کے نیچے آ کر گھوڑ سوار کے پاؤں پکڑے، گھوڑ سوار کے پاؤں پکڑنا تھے کہ گدھا دولتی جھاڑ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک سانڈنی سوار، دوسرا گھوڑ سوار، تیسرا ڈوم ان سب کا بوجھ جو دیوانے پر پڑا تو بلبلا اٹھا۔ دل بہلانے کو کچھ تو چاہیے، ڈوم سے کہنے لگا۔ "کہ میاں کچھ سناؤ تو دل بہلے "غرض یہ کہ ڈوم نے گانا گایا۔ گھڑ سوار نے ہاتھ سے طبلے پر تھاپ دی، سانڈنی سوار ناچنے لگا اور دیوانے نے ہاتھ بڑھا بڑھا کر داد دینی شروع کی۔ اب جو ہاتھ چھوٹے تو ڈوم پر گھوڑ سوار، گھوڑ سوار پر سانڈنی سوار، دیوانہ تھا سب سے اونچا گرا تو سب سے زیادہ چوٹ آئی۔ نکسیر جو پھوٹی تو کہا۔ "سسرال بڑے مزے کی جگہ ہوگی مگر راستہ بہت ٹیڑھا ہے"۔

داستان کے دوران میں سامعین گوش بر آواز محو حیرت و استعجاب رہتے، کبھی بے اختیار واہ واہ کے الفاظ منہ سے نکل جاتے داستان ختم ہوتے ہی میر صاحب فرماتے۔ "حضرات اب دیدہ خواہد شد، آداب عرض کرتا ہوں۔" ساری محفل بے ساختہ پکار اٹھتی واہ واہ! سبحان اللہ! کیا کہنا ہے۔ میر صاحب واقعی یہ فن آپ ہی کے دم سے اب تک زندہ ہے۔

"واہ حضرات واہ مجھے کیا آتا ہے یہ تو سب حکیم صاحب کے دم قدم کی خیر و برکت ہے اور ان دو چار صورتوں کا صدقہ ہے جو اس وقت یہاں موجود ہیں۔ میں تو:

"دور خاموش بیٹھا رہتا ہوں
اس طرح حالِ دل میں کہتا ہوں"

"میر صاحب یہ کس کا شعر ہے؟"

"واہ حضرت آپ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں؟ خیر، عرض کرتا ہوں، ولیؔ کا ہے۔"

حکیم صاحب متبسم ہو کر آہستگی سے فرماتے ہیں۔ "میر صاحب وہ اکبر الٰہ آبادی کے اشعار بھی کیا خوب تھے۔"

"جی عرض کرتا ہوں سنیے:

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا، اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا؟

پھر کہتے ہیں:

"بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں

کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے"

ایک صاحب بولے۔ "میر صاحب ابھی تو آپ ہنسا رہے تھے اب رُلانے بھی لگے"۔ بولے۔

"حضرت کیا کیا جائے دل روتا ہے:

سکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل سست ہوا آواز نہیں

جو ہونی تھی سو ہو گذری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں"

میر صاحب نے نظیر اکبرآبادی کی زبان میں جو پیش گوئی کی تھی وہ تھوڑی ہی مدت میں پوری ہوگئی۔ حکیم اجمل خاں اور میر باقر علی آگے پیچھے دونوں ایک ہی سال 1928ء میں اللہ کو پیارے ہوئے پھر وہ دیوان خانہ رہا نہ اس کے نورتن۔

اردو نامہ کراچی

فروری 1961ء

میر باقر علی داستان گو

محمد فیروز دہلوی

صاحبو! کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ میر باقر علی داستان گو میں نے دیکھا نہ سنا البتہ ان لوگوں دیکھنے اور سننے کا اتفاق ضرور ہوا جو میر صاحب کے والہ وشیدا تھے اور اُن کی محفلوں میں شریک ہو چکے تھے۔ اُنھیں بزرگوں کی گفتگو اور بیانات سے یہ خاکہ مرتب کیا ہے۔

دو سال قبل میر صاحب کے داماد سید صغیر حسن نقوی کراچی سے دہلی پہنچے۔ ان کے نیاز حاصل کیے۔ میر باقر علی کا ذکر آیا، فرمایا۔۔ ''ان کے آبا واجداد ایران کے مشہور شہر مازندران سے تشریف لائے تھے اور دہلی کے ترکمان دروازے میں رہائش اختیار کی۔ میر صاحب کے نانا میر امیر علی ''قصہ'' گو تھے اور بہادر شاہ ظفر کی خلوت وجلوت میں کہانی قصے سناتے تھے اور میر پیڑہ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے صاحب زادے میر کاظم علی تھے جنھوں نے قصے کو داستان بنایا اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ شمال سے جنوب تک انھیں کی دھوم تھی۔ انھیں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع آیا کہ عاشق ومعشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر میر کاظم نے احساسات، خیالات، اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور تنگ آ کر کہا ''آج پردہ اٹھ جانا چاہیے۔ تب پردہ اٹھا۔ ورنہ نہ جانے کب تک پردہ نہ اُٹھتا۔ اُنھیں کاظم علی نے میر باقر علی کو داستان گوئی کا فن سکھایا۔''۔

میر باقر علی 1850ء میں ڈوموں کی گلی ترکمان دروازے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر حسین علی بھی قلعہ میں ملازم تھے۔ 1857ء کا غدر ہوا۔ میر صاحب کے خاندان نے فصیل سے باہر علی گنج شاہ مرداں (موجودہ جور باغ) میں پناہ لی۔ میر صاحب کے نانا اور والد غدر کی بساط کے ساتھ لپٹ گئے۔ امن وامان ہوا تو میر باقر علی اپنے ماموں میر کاظم علی اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ فراش خانہ میں آ کر بس گئے۔ میر کاظم علی کی ہزار

داستانی کی شہرت حیدر آباد پہنچی۔ سر آسمان جاہ کا دور تھا۔ میر کاظم علی کو یاد کیا۔ وہ حیدر آباد پہنچے اور پھر آخیر عمر تک وہیں رہے۔ لیکن حیدر آباد جانے سے پہلے میر باقر علی کو داستان گوئی میں طاق کر چکے تھے۔ چنانچہ ماموں دکن میں اور بھانجا شمال کی ریاستوں میں داستان سناتے اور انعامات و اکرامات پاتے۔ پٹیالہ، رام پور، بھوپال کے رجواڑوں اور نوابوں میں بلائے جاتے۔ میر باقر علی نے ریاست پٹیالہ میں باقاعدہ داستان گو کی حیثیت سے ملازمت کی۔ یہ ملازمت بھی اُن کی داستانِ حیات کا ایسا قصہ ہے جس کے بغیر میر باقر علی کی داستان مکمل نہ ہوگی۔ میر صاحب انتہائی وضعدار اور خود دار تھے۔ ریاست پٹیالہ کے دربار کا قاعدہ تھا جو دربار میں حاضر ہوتا وہ صافہ باندھ کر آتا۔ چنانچہ میر صاحب کو بھی یہی حکم ملا۔ میر صاحب نے دربار میں صافہ باندھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "جس شخص کو میرا اور لباس پسند نہیں وہ میرا فن کیا پسند کرے گا"۔ یہ کہہ کر دلی آنا چاہتے تھے کہ مہاراجہ کا پیغام ملا۔ میر صاحب آپ اس شرط سے آزاد ہیں جو لباس چاہیں پہنیں۔ چنانچہ میر صاحب کلابتوں کی گول ٹوپی پہنے دربار پہنچے۔ جب تک ریاست میں رہے کسی نے انھیں نہیں ٹوکا کہ میر صاحب صافہ کیوں نہیں باندھا۔

یوں میر صاحب بڑے سادہ لوح اور سادہ مزاج تھے۔ طبیعت میں بلا کا انکسار تھا۔ جس کے پاس بیٹھتے صبح سے شام کر دیتے تھے۔ جوانی میں رنگ گورا تھا لیکن آخری عمر میں کل گیا (ملگجا) ہو گیا تھا۔ درمیانہ قد، چھریرا بدن، چھوٹی سی کچی داڑھی، پوستوں کی آنکھیں، گرمیوں میں چوڑی آستینوں کا ململ کا کرتہ، انگرکھا اور تنگ موری کا پاجامہ، سردی میں چھینٹ کی آدھ سیری نیم آستین پہنتے تھے۔ کانوں سے رومال لپٹا ہوا۔ پاؤں میں دیسی جوتی، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

میر باقر علی نے زندگی میں دھوپ چھاؤں دیکھی تھی۔ اچھے اور برے دن دیکھے تھے۔ وقت کی رفتار پہچانتے تھے۔ ریاستوں میں قدر و منزلت کم ہوئی تو دلی کے رئیسوں اور امیروں اور دیوان خانوں کی زینت بنے۔ سیٹھ چھنامل، حکیم اجمل خاں، نواب فیض احمد خاں اور نواب تھمے خاں کے دیوان خانوں میں داستان سناتے تھے۔ جب یہاں بھی سنانے کا راج ہوا تو گھر بیٹھ گئے۔ پیٹ پالنے کے لیے چھوٹی چھوٹی داستانیں لکھیں۔ خود ہی چھپوائیں اور دلی کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر بیچیں۔ یہ کتابیں میر صاحب اور ان کے گھر والوں کا پیٹ نہ بھر سکتی تھیں۔ اس لیے کتری ہوئی چھالیہ بیچنے لگے۔ یہ چھالیہ بھی خود ہی رات کو کترتے اور دن نکلے داہنی بغل میں ایک بڑی سی پوٹلی دبائے اور بائیں ہاتھ میں ایک بستہ لیے گھر سے نکلتے۔ دلی والوں میں اب بھی چند بزرگ ایسے ہوں گے جنھوں نے میر صاحب کو دلی کی گلیوں میں پاجی پڑوس، مولا بخش ہاتھی، خلیل خاں اور فاختہ کی آوازیں لگاتے سنا ہوگا۔ قدردان آواز سنتے ہی گھر سے نکلتے۔ کتابیں خریدنے کے بہانے میر صاحب سے بات کرتے اور اپنی ضرورت کے مطابق کتری ہوئی چھالیا خرید کر خاموشی سے چلے جاتے۔ یہ تھا انیسویں صدی کا فنکار میر باقر علی

داستان گو جسے دیکھنے اور ملنے کے لیے راجہ اور مہاراجہ بے قرار رہتے تھے۔ اسی طلسمِ ہزار داستان کو بیسویں صدی میں پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ بائیسکوپ کی ایجاد نے داستان گوئی کو زنگ لگا دیا۔ میر باقر علی زمانہ شناس تھے، جانتے تھے کہ اب پردے پر ہزار چہرے نظر آئیں گے اب اس ایک چہرے کو کوئی کب تک دیکھے گا۔ آبرو کے ساتھ بسر کرنے کی آخر کوئی تو شکل ہونی چاہیے۔

والد مرحوم اور اشرف صبوحی میں دوستانہ مراسم تھے چنانچہ ایک روز بعد نمازِ عصر دونوں گلی سیدان پہاڑی بھوجلہ پہنچے۔ میر باقر علی فراش خانہ سے یہاں آن بسے تھے۔ یہ گھر نسبتاً چھوٹا تھا (اس گھر میں گوندنی کا ایک پیڑ ہے اور گوندنی والے گھر کے نام سے آج بھی مشہور ہے)۔ دروازہ پر دستک دی۔ میر صاحب باہر آئے اور چندھیا کر دیکھنے لگے۔ صبوحی صاحب نے تعارف کرانا چاہا، بولے "میاں ہم لوگ نئی روشنی کے نہیں کہ "ظاہر میں اجالا اور دل میں اندھیرا" "جو آنکھوں میں بس گیا، بس گیا"۔ پھر پردہ کرایا اور گھر میں لے گئے۔ رسمی گفتگو کے بعد آنے کی وجہ پوچھی۔ والد مرحوم کا بیان ہے کہ اشرف صبوحی نے ڈرتے ڈرتے کہا "میر صاحب کئی دن سے سوچ رہا تھا مگر اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ یہاں تک آؤں۔ میر صاحب نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا میاں خیریت تو ہے! اشرف صاحب نے چند منٹ توقف کیا اور پھر کہا۔ میر صاحب "خیریت ہی نہیں ہے"۔ پوچھا "ماجرا کیا ہے؟" عرض کیا "میر صاحب! آپ جیسا صاحب کمال، مقرر کائنات، داستان گوئی کا بے تاج بادشاہ اس طرح گلیوں میں مارا مارا پھرے، کتابیں اور چھالیہ بیچے یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ میر صاحب سن کر مسکرائے اور پھر اطمینان سے جواب دیا۔ میاں شان کا مفہوم دنیا نے غلط سمجھ رکھا ہے۔ "شان ہاتھی کا نشان"۔ پھر دلی کو اب کیا سمجھتے ہو۔ کایا پلٹ گئی۔ بجلی کی روشنی میں پرانے ڈیوٹ کو کون پوچھتا ہے۔ میاں ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے...... خدا حالی کرائے ولالی نہ کرائے۔ اور میاں اب دلی کہاں دلی کے دل والے کہاں، خوشی تو دلی والوں کی خوش اقبالی کے ساتھ رخصت ہوئی۔ آج جو خوش ہوتا ہے دراصل خوشی کو منہ چڑاتا ہے۔ میں تو بھی داستان گوئی سے چھالیا بیچنے میں زیادہ خوش ہوش ہوں۔ داستان کیا قبرستان میں جا کر سناؤں۔ زندوں میں تو کہیں چرچا رہا نہیں۔ کیوں کر رہے جو بے زبان سے نا آشنا۔ اگلے وقتوں کی معاشرت پر منہ آنے والا۔ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ زندگی کا فلسفہ ہی بدل گیا ہے بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے جن کے پاس کبھی کبھی جا کر بزرگوں کی فاتحہ پڑھ آتا تھا۔ ان کی صحبتیں بھی درہم برہم ہو گئیں۔ اس لیے سوچا کہ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں آبرو کے ساتھ گزار دو۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ چھالیہ بیچو۔ اب چھالیا لے کر جاتا ہوں اور دلی والوں کو پان کھانا بھی سکھاتا ہوں۔ دلی والے پان کھانا ہی بھول گئے۔ اپنی معاشرت بدل کر اپنے بڑوں کی ہنسی اڑاتے، میں دیکھ رہا تھا کہ پان کھانے والوں میں بے شعوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر یہ بے شعوری اسی طرح بڑھتی گئی تو ہمارے تمدن کی یہ چیز بھی گئی۔ اب

دِلّی والوں کو پھر پان کھانا سکھانا شروع کیا۔ آج کل پہلے کی نسبت پان زیادہ کھائے جاتے ہیں جسے دیکھو پنواڑی کی دوکان پر کھڑا ہے یا ڈبیا جیب میں لیے بکر بکر چباتا ہے۔ مگر اُن سے پوچھو، کیا کھایا پان یا پیپل کا پتا، چھالیا یا پنواڑی کی دوکان کا کوڑا، تو دانت نکوس دیتا ہے۔ ایسوں ہی نے ہمیں بدنام کیا۔ ہماری معاشرت میں کیڑے ڈلوائے۔ اس لیے میں میں نے داستان کہنا چھوڑی۔ میاں تمہارے بڑوں نے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنے کے لیے پان نہیں کھائے۔ ایسے پان کھانے سے تو بہتر ہے آدمی گھاس پتے کھائے۔ اگلے وقتوں کے لوگ پان کھاتے تھے گلے، دانتوں اور معدے کی دوا سمجھ کر، اسی لیے پان اور اُس کے جملہ لوازم سے واقف ہوتے تھے۔ چھالیا کیسی ہونی چاہیے، پان کس موسم میں کس حالت میں کون سا کھانا چاہیے۔ کتھا کیوں کر پکائیں۔ چونا کس طرح بجھائیں۔ اب یہی سب باتیں سکھاتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب دِلّی والوں میں پان کھانے کا کچھ کچھ سلیقہ آ گیا ہے۔ اور تو اور اب تو پنجابی تک کہنے لگے ہیں کہ "آہو میر صاحب ٹُن پان دا سواد آیا"۔ میر صاحب اتنا کہہ کر کے سانس لیا اسی وقت آہٹ ہوئی پلٹ کر دیکھا ایک بچہ خاصدان لیے کھڑا ہے۔ لگی گلوریاں تھیں۔ میر صاحب نے ایک ایک گلوری دی پھر اپنے لیے اٹھائی تھی کہ کچھ یاد آیا۔ کہنے لگے میاں آخری وقت ہے یہ بھی سنتے جاؤ پھر تمھیں کوئی سنانے یا بتانے والا بھی نہیں ملے گا۔ پھر گلوری اٹھاتے ہوئے کہا "میاں یہ گلوری دیکھ رہے ہو یہ میری بچی نے بنائی ہے۔ میں نے چھالیا کترنا، پان لگانا اور گلوریاں بنانا مرزا جی سے سیکھا تھا۔ اب تم پوچھو گے کون مرزا جی؟ میاں یہ مرزا جی قلعے میں شاہی خاصدان کے لیے گلوریاں بناتے تھے اور ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اگر ان کی بابت کچھ کہوں تو ایک دفتر درکار ہے۔ مرزا تین قسم کی گلوریاں بناتے تھے۔ ایک مچھلی کی صورت جس پر چاندی یا سونے کا ورق لپیٹ کر پر اور دُم اس کے پان کی کترنوں سے بناتے تھے اور آنکھیں اس کی بادام سے اور ایک پان کا ماہی پشت نہایت باریک کتر کر اور گلوری کی مچھلی پر پھیلا دیتے تھے۔ طشتری میں نہایت خوش نما معلوم ہوتے تھے اور وہ گلوری کھانے میں نہایت خوش ذائقہ معلوم ہوتی تھی۔ دوسری گلوری کسی محفل یا مجلس کے واسطے بنائی جاتی تھی۔ ایک بہت بڑی کشتی میں ہزار دو ہزار پان کی گلوری بنتی تھی۔ لیکن پاؤں کا ماہی پشت اس خوبی سے لگاتے تھے کہ پان اڑ نہ سکے اور ان پر ورق لگائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی چند چھریاں بھی کشتی میں سلیقہ سے لگا کر رکھ دیتے تھے۔ جس صاحب کا جی چاہتا چھری سے اپنے کھانے کے موافق حصہ کاٹ لیتا۔ جتنا بھی حصہ کاٹا جاتا ہر حصہ میں چونا کتھا چھالیا الائچی پان سب برابر ہوتا۔ تیسری گلوری معشوق پسند بنائی جاتی تھی۔ وہ ایک معمولی مثلث گلوری ہوتی تھی اور اس میں یہ خوبی ہوتی کہ عاشق اور معشوق کھانے کا ارادہ کریں اور گلوری کے دونوں کونے پکڑ کر کھینچیں تو گلوریاں برابر کی الگ ہو جائیں۔

میر باقر علی نے ہر طرح کی وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ ہر علم کا انہوں نے باقاعدہ مطالعہ

کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ سیکھنے کا یہ شوق عمر بھر برقرار رہا۔ میرے ایک بزرگ حکیم اعجاز احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ "جب دلّی میں طبیہ کالج کھلا تو ہم نے بھی وہاں داخلہ لیا۔ میر باقر علی کی عمر اس وقت ساٹھ پینسٹھ سال ہوگی۔ وہ باقاعدگی سے کالج آتے اور ہم لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر طب پڑھتے تھے۔ یہی نہیں انھوں نے امتحان دیا اور فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔ یہی نہیں انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی باقری بیگم کو بھی طبیبہ بنایا۔ وہ طبیہ کالج کی سند یافتہ تھیں۔

میر باقر علی گنجینۂ علم تھے۔ ایک ذرا چھیڑیے گھنٹوں بے تکان بولیں گے۔ ان کی اسی وصف پر خواجہ حسن نظامی نے 1918ء میں انھیں مقررِ کائنات کا خطاب دیا تھا۔ میر صاحب جہاں داستان گوئی میں کامل الفن تھے زبان کے محافظ اور پاسبان تہذیب واخلاق بھی تھے۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے کوثر وتسنیم سے دھلی اردو کچھ کچھ میلی ہونے لگی تھی۔ انگریزی کے الفاظ اس میں شامل ہونے لگے تھے۔ سرکاری دفتروں میں ملازم ہی نہیں دلّی کے بعض شرفا بھی انگریزوں کی نقل میں مزاج شریف کی بجائے "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہنے لگے تھے۔ دلّی کے دروازے اور کھڑکیاں ہر ایرے غیرے کے لیے کھل گئے، زبان تتر بتر نہ ہوگی تو پھر کیا ہوگی"۔

میر صاحب کی عادت تھی کہ راہ چلتے کسی کو غلط لفظ بولتے سنا سرِراہ ٹوک دیا۔ تصحیح کیا، بھلا سمجھایا اور آگے بڑھے۔ میاں! کیا کہا۔ "اُف"... جانتے ہو یہ کیا ہے۔ کہا کلمۂ تاسف ہے۔ بولے صحیح مگر میرے عزیز اس کے ایک اور معنی بھی ہیں وہ بھی گرہ میں باندھ لو۔ اُف عربی میں ناخن کے میل کو کہتے ہیں۔ کسی نے گالی دی یا سخت لہجہ میں بات کی تو میر صاحب کہتے خدا نے تم کو زبان اچھے الفاظ بولنے کے واسطے عنایت کی، جانتے نہیں۔

قدرت کو ناپسند ہے سختی بیان میں　　　　پیدا ہوئی نہ اس لیے ہڈی زبان میں

ایک مرتبہ شریف منزل میں حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے میں حکیم صاحب کے احباب جمع تھے۔ میرے نانا محمد احمد صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ مختلف لفظوں اور محاوروں پر بحث ہو رہی تھی۔ نانا صاحب کا بیان ہے کہ میر باقر علی اپنے مخصوص انداز میں ہر لفظ کے معنی اور استعمال بتا رہے تھے۔۔ اچانک حکیم صاحب نے کہا "میر صاحب یہ بن برسنا کیا محاورہ ہے۔ روز مرہ نہ کتنی بار ہم کہتے ہوں گے لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ بن ہے کیا"۔ میر صاحب نے نہایت شائستگی سے جواب دیا۔ مسیح الملک آپ کے صدقے جاؤں میں تو آپ کی خاک پا بھی نہیں، عرض کرتا ہوں۔ بن ایک سونے کا سکہ ہے جو قطب شاہی بادشاہوں کے زمانے میں چلتا تھا اور سونے کے سکوں میں سب سے چھوٹا سکہ ہوتا تھا۔ حضرت عالم گیر نے جب دکن کا قصد کیا تو دلّی کے البیلوں نے جانے سے انکار کیا۔ مگر چونکہ یہ افواہ مشہور ہو گئی تھی کہ دکن میں بن برسا ہے، اس لالچ سے سب بادشاہ کے ساتھ ہو لیے... پھر کسی نے پوچھا کہ میر صاحب یہ خط طغرا کیا بلا ہے۔ میر صاحب مسکرائے اور ایک ادائے خاص سے

بولے طغرا ایک جانور نما پرندہ کا نام ہے۔ جس کی ہم شکل طغرا لکھا جاتا ہے اور یہ پروں کی مثال ہوتا ہے۔ لفظ طغرا کو
طا کی زیر سے پڑھیں تو یہ جلے ہوئے کے معنی دیتا ہے۔ یہ خط ایک پیچیدہ خط ہے جس کو اکثر بادشاہ اپنے
فرمانوں میں استعمال کرتے تھے"۔

میر صاحب کھرے سید تھے۔ کھری کھری سناتے تھے۔ گھر ہو یا باہر، دسترخوان پر بھی کسی نے خلاف
آداب حرکت کی اور میر صاحب نے سر محفل ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دسترخوان پر ہزار نعمتیں ہوتیں لیکن میر صاحب کی
عادت تھی کہ پہلا اور آخری لقمہ نمک کا لیتے۔ کوئی پوچھتا تو کہتے اصل تو نان ونمک ہی ہے۔ میر صاحب کہیں مدعو
ہیں دسترخوان سجا ہوا ہے۔ ایک طائرانہ نظر ڈالی کہیں کسی چیز کی کمی نظر آئی تو صاحب خانہ کو ٹوک دیا میاں دنیا بھر کی
نعمتیں ہیں مگر "مسقل دان" نہیں۔ میزبان نئے خیالات کا ہوا اور اس نے پوچھ لیا کہ "مسقل دان" کیا؟ تو بھری
محفل میں سمجھانا شروع کیا "میاں یہ مثل مرتبان کے ہوتا ہے اور اوپر اس کے ڈھکنا۔ یہ دسترخوان پر رکھا جاتا ہے
کہ ایسی شے جیسے ہڈی وغیرہ اس کے اندر ڈال دی جائے۔ میاں کیا تم ہڈیاں بھی کھا جاتے ہو۔ یاد رکھو ہڈی کو منہ نہ
لگاؤ اس سے پتھری کا مرض پیدا ہوگا۔ اور اس تنبیہ وتاکید کے بعد میر صاحب کوئی چھوٹی غوری یا طشتری طلب
کرتے اور بائیں جانب دسترخوان سے ذرا ہٹا کر اپنے قریب رکھ لیتے۔ نوالے میں کوئی ہڈی کا ٹکڑا آیا۔
انھوں نے انتہائی نفاست سے اسے نکالا اور لوگوں کی نظریں بچا کر اس میں ڈال دیا۔

شخصیت اور کردار کی اس جھلک کے بعد میر صاحب کا فن بھی دیکھیے۔ میرے جن بزرگوں نے میر صاحب
کو داستان سناتے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی اُجلی چاندنیوں کے فرش
بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا۔ اس پر قالین اور گاؤ تکیہ۔ میر صاحب تخت پر براجمان
ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا
میں افیون کی گولی ہوتی، اسے نکال کر روئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر روئی میں لپٹی ہوئی افیون اس
میں گھولتے رہتے۔ جب ساری افیون پانی میں تحلیل ہو جاتی تو روئی نکال کر اگالدان میں پھینک دیتے اور پیالی
سے چسکی لیتے اور اس کے بعد چائے پیتے۔ عام طور چائے کے بارے میں یہ ضرور کہتے "میاں یہ فرنگی بھی نئی نئی
ایجاد کرتے ہیں۔ شراب حرام ہوئی تو ایسی چیز تیار کی کہ بڑے بڑے مولوی اور متقی بھری محفل میں پیتے ہیں اور کوئی
ٹوکتا تک نہیں بلکہ اصرار کر کے پلاتا ہے واہ بھئی واہ!! مزے کا مزہ اور نشے کا نشہ۔ میاں ہمارے خیال میں تو چائے
کی خوبی بس یہی ہے، لب ریز، لب سوز اور لب بند (بہت زیادہ میٹھی)۔ چائے کے دو گھونٹ لیے اور پھر داستان
شروع کی۔ انتقال سے پہلے ہفتہ میں ایک بار اپنے گھر داستان سنانی شروع کی تھی۔ پہلے ایک گھنٹہ اور سنانے کا
معاوضہ ایک آنہ فی کس۔ جب اس میں گزارہ نہ ہوا تو وقت بڑھا دیا رات بعد نماز عشاء نو بجے سے گیارہ بجے

تک۔ دس بارہ سننے والے میر صاحب کے گھر جمع ہوتے... گھر میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ ہے اس کمرے کے دروازے کے بالکل بیچ میں ایک چوکی پر میر صاحب خود بیٹھتے۔ سرہانے ڈوری ٹنگی لالٹین ہوتی صحن میں بائیں طرف ایک طاق میں چھوٹا سا دیا جلتا۔ داستان سننے والے مؤدبانہ انداز میں گھر میں داخل ہوتے خاموشی سے چنٹی کی چپلی دونی نکالتے اور طاق میں دیے کے پاس رکھ کر خاموشی سے بیٹھ جاتے... (انقلابات ہیں زمانے کے ایک وقت تھا کہ میر صاحب کو ریاستوں اور رجواڑوں سے انعام واکرام میں سنہری اشرفیاں ملا کرتی تھیں اور اب یہ عظیم فنکار دو آنے میں دو گھنٹے داستان سنایا کرتا تھا)۔ میر صاحب نے مجمع پر نظر ڈالی آنے والوں کو پہچانا۔ ان کے قریبی دوست میاں فجو نے سب کو چائے کی ایک ایک پیالی پیش کی، میر صاحب نے معمول کے مطابق چھالیا بیگم کی چٹکی لی اور پھر چائے کے گھونٹ کے ساتھ داستان شروع کی:

"کم ترین یہ داستان فرحت عنوان یہاں سے گزارش کرتا ہے کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ میاں بارگاہ سلیمانی اور بار جہاں بانی منعقد ہوا تو سوا سو طائفہ ارباب نشاط حاضر۔ تھاپ طبلوں پر پڑ رہی ہے آواز ہوشا ہوش و بادہ نوش کے ساتھ سارنگی کا لہرا اور بائیں کی گمک آسمان کو جا رہی ہے طرح طرح کے باجے الغوزے، بربط، بانسری، چنگ، دائرہ، پرند، جلترنگ، چنگ، دف، ڈھولک، رباب، مرچنگ، نفیری، مرمر، سنگھار، طاؤس، ستار، طرب جوش، قانون، کمانچہ، مردنگ، منجیرے، نسترن بج رہے ہیں۔ ساقیان گل فام جام و صراحی لیے ہوش اڑا رہے ہیں۔"

میر صاحب ایک ایک چیز کی تصویر کھینچ رہے ہیں اور خود تصویر بن رہے ہیں۔ ساز و سامان، لباس، ہتھیار کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سینکڑوں نام گنا جاتے۔ زیوروں کا ذکر آیا، بتاتے کہ شاہی بیگمات کے کیا ہوتے تھے۔ درمیانہ طبقہ کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں، نچلے طبقہ کی عورتوں کو کون سے زیور بھاتے تھے۔ دلی کے مشہور سادے کار اکثر و بیشتر میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے زیورات کی بناوٹ پر گفتگو کرتے۔ استاد حامد کے کوچے میں عبدالستار، فیض محمد اور عبداللہ سادے کاروں کے خاندان آباد تھے۔ یہ لوگ شاہی زیورات بناتے تھے۔ اسی خاندان کے کسی سادے کار نے میر صاحب سے کہا تھا "آپ کی زبان چلتی ہے کسی کا دل جلتا ہے۔ یہ دلی کی امیر زادیاں اپنے شوہروں کو پریشان کرتی ہیں کہ فلاں زیور بنواؤ۔ میں تو عید پر ہاتھوں میں جہانگیریاں پہنوں گی اور گلے میں زنجیری۔ میر صاحب اس نوبہت سخت جان ہوتا ہے پہلے دوسروں کو کوستا ہے پھر خود گھلتا ہے۔ خدا واسطے ان زیوروں کا ذکر نہ کیجیے ورنہ دلی کے یہ "متمتع چڑھے" رئیس کنگال ہو جائیں گے۔

دلی کے اس باکمال فنکار نے 1928ء میں زندگی کی آخری سانس لی۔ ستر سال پہلے جو جگہ بنائی تھی وہی جگہ اب آخری آرام گاہ ٹھہری۔ میر باقر علی درگاہ شاہ مرداں میں دفن ہوئے۔ 1947ء میں اس بلبل بوستاں کی تربت کی کیا گت بنی کوئی نہیں جانتا۔

تربت کہنہ کے مٹ جانے میں بھی معنی ہیں	خاک مرحوم ملی جا کے گلِ عالم میں

میر باقر علی داستان گو جیسے جامع کمالات شخص روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ عہد شاہی میں پیدا ہونے اور زر و جواہر میں کھیلنے والا ، روایت پرست انگریزوں کے عہد حکومت میں پیسہ پیسہ کو محتاج رہا۔ زندگی میں ناقدری ہمارے خمیر میں ہے اور مرنے کے بعد چاہت اور عقیدت ہماری عادت ہے۔

خدا آباد رکھے "اردو اکادمی دلّی" کو جس نے دلّی کی اِن کھوری اینٹوں کو جنھیں آثار قدیمہ والے بھی بھول چکے تھے دلّی کے کونوں کھدروں سے تلاش کر کے یہاں یکجا کیا ، ورنہ اب تو یہ عالم ہے۔ ہائے دلّی وائے دلّی۔ بھاڑ میں جائے دلّی۔۔۔!!

دلّی والے: حصہ دوم
مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین
ناشر: اردو اکادمی، دہلی
سن اشاعت: 1988ء

میر باقر علی داستان گو......ایک تعارف

محمد سلیم الرحمٰن

میر باقر علی داستان گو 1850ء میں پیدا ہوئے اور اٹھتر سال جیے۔ داستان گوئی کا فن انھیں میراث میں ملا تھا۔ داستان گو کے طور پر بڑی شہرت پائی۔ اب ان کی یادگار چند کتابچے، چھوٹے موٹے قصے، رسالے اور بعض ادبی جریدوں میں شائع ہونے والے مضامین ہیں۔ یہ بھی انھوں نے عمر کے آخری پندرہ بیس برسوں کے دوران میں قلم بند کیے تھے جب ان کی سرپرستی کرنے اور داستان سننے والے کم رہ گئے تھے۔ بقول شاہد احمد دہلوی: ''میر صاحب جیسی ہوئی داستانیں نہیں سناتے تھے بلکہ طبع زاد داستانیں سناتے تھے۔ داستان کے کردار البتہ بیش تر طلسم ہوش ربا کے ہوتے تھے۔'' (خلیل خان فاختہ، ص 9)

دلی میں کوئی منشی نول کشور نہ تھا جو ان سے داستانیں لکھوا کر چھپوا دیتا اور وہ محفوظ ہو جاتیں۔ خود دلی والوں نے داستان گوئی کے اس باکمال اور آخری نمائندے کی کوئی قدر نہ کی۔ بڑھاپے میں چھالیہ بیچتے اور اپنے ہم شہریوں کو پان کھانے کا سلیقہ سکھاتے پھرے۔ اردو کے نام نہاد بہی خواہ بہت تھے لیکن کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کی معلومات سے فائدہ اٹھا لیتا۔ اور کچھ نہیں تو ان سے پرانے علوم و فنون، پیشوں، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقوں کی لغت مرتب کرائی جا سکتی تھی۔ گزرے ہوئے اور تقریباً فراموش شدہ معاشرے کے بارے میں میر صاحب کی معلومات کتابی نہ تھیں۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں: ''میر صاحب علوم و فنون کا سمندر تھے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے پر آتے تو بیسیوں نہیں سیکڑوں نام لیتے چلے جاتے۔ یہی کیفیت زیورات اور ملبوسات کے ناموں کی تھی۔ حیرت کی بات یہ کہ یہ نام میر صاحب کو طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کی شکل و صورت اور استعمال سے بھی واقف تھے۔ سننے والوں میں سے کوئی ٹوک کر پوچھ لیتا کہ حضت، یہ کیا ہوتا تھا تو میر صاحب اس کی پوری تفصیل بتا دیتے تھے۔'' (خلیل خان، فاختہ، ص 9)۔ زمانے کی ناقدری کا کیا گلہ کیا جائے! اب لے

دے کر ہمارے پاس میر باقر علی کی تحریر کے چند نمونے بچے ہیں اور وہ بھی کم یاب ہیں بلکہ بعض شاید نایاب ہو چکے ہیں۔ دستیاب چیزوں میں بھی صحیح معنوں میں داستان کوئی نہیں۔

ان کی داستان گوئی کا چرچا انیسویں صدی ہی میں ہو گیا تھا لیکن انیسویں صدی کے کسی فرد نے ان کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اگر لکھا ہے تو راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ میر باقر علی کا احوال، عادات اور اسلوب کے بارے میں جن اصحاب نے بھی قلم اٹھایا ان کا تعلق بیسویں صدی سے ہے۔ انھوں نے میر صاحب کو داستان کہتے سنا ہو گا۔ ان کی آرا خلیل خان فاختہ، نامی قصے کے آغاز میں یک جا کر دی گئی ہیں جسے میر باقر علی کی داماد صغیر حسین نے 1960ء میں کراچی سے شائع کیا تھا۔ اس سے ان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

سید ذوالفقار علی بخاری لکھتے ہیں: "میر صاحب بھوجلا پہاڑی والے مکان میں جمعرات کو کہانی سناتے۔ سننے والے آتے، دوقی طاق پر رکھ کر کہانی سننے بیٹھ جاتے۔ میر صاحب کے ہاتھ میں افیون کی پیالی اور زبان پہ داستان۔ یوں بے تکان سناتے چلے جاتے کہ بڑے بڑے طرار جوانوں کو ان کے بڑھاپے پر رشک آتا۔" (دوقی کو حقیر نہ سمجھیے۔ اس وقت دو آنے میں آدھا سیر چھوٹا گوشت آجاتا تھا جو اب سوا سو روپے میں ملتا ہے۔ م۔س)

ملا واحدی رقم طراز ہیں: "میں نے سیکڑوں داستانیں میر صاحب کی زبانی سنی ہیں۔ میر صاحب منحنی آدمی تھے۔ دبلے پتلے، دھان پان، قد بھی معمولی لیکن داستان میں کسی بادشاہ کا ذکر آجاتا کہ اس نے یہ حکم دیا تو حکم کو اس شان سے ادا کرتے تھے کہ گمان ہونے لگتا کہ ہم ایک قہار بادشاہ کے سامنے بیٹھے ہیں اور اسے بولتا دیکھ رہے ہیں۔ علیٰ ہذا کسی ڈاکو کی نقل اتارتے تو ڈاکو کا نقشہ کھینچ دیتے اور کسی معمر عورت کا قول دہراتے تو بالکل بے دانتوں کے بن جاتے۔ سرائے کی بھٹیاری کا خاکہ اڑاتے تو سرائے کا سماں بندھ جاتا۔ میر صاحب لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ چند داستانیں یاد تھیں۔ انھیں دہراتے رہتے ہیں۔ میر صاحب کی داستانیں طبع زاد ہوتی تھیں۔ میر صاحب کو اپنی معلومات بڑھانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے انھوں نے درخواست کی کہ مجھے اجازت دے دیجیے کہ طبیہ کالج دہلی، کی جس جماعت میں چاہوں جا کر بیٹھ جایا کروں۔ حکیم صاحب نے خوشی سے اجازت دے دی۔"

میر باقر علی کے داماد صغیر حسین نے جو نوٹ لکھا ہے اس سے بعض مزید باتیں سامنے آتی ہیں، لکھتے ہیں:

"میر باقر علی داستان گو 1850ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور 1928ء میں انتقال ہوا۔ میر صاحب کے بزرگ ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ کے والد میر حسین علی، آپ کے نانا میر امیر علی شاہی ملازم تھے۔ آپ کے والد کا سایہ بچپن میں اٹھ گیا تھا۔ آپ نے اپنے نانا کے ہاں پرورش پائی جو ترکمان دروازہ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ فن داستان گوئی کو اپنے ماموں سے سیکھا جو اس وقت نظام حیدر آباد کے ہاں داستان گو تھے۔ بچپن کا

زمانہ خوب گزارا۔ بادشاہ کے ہاں سے فصل کی ہر چیز آیا کرتی تھی...... آپ نانا کے ہمراہ قلعے میں جاتے اور بادشاہ کے بچوں کے ساتھ کھلونوں سے کھیلا کرتے تھے۔ 1857ء میں غدر پڑا۔ اس وقت میر صاحب کی عمر سات آٹھ سال کی تھی۔ آپ اپنی والدہ اور نانا کے ہمراہ دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک مقام جو شاہ مرداں کے نام سے مشہور ہے جس کو اس زمانے میں علی گنج کہا کرتے تھے ٹھہر کر پناہ لی۔ جب دہلی میں امن قائم ہوا اور دہلی والے واپس اپنے اجڑے ہوئے مکانوں میں آئے تو میر صاحب بھی واپس آئے۔ علم کا اتنا شوق کہ بڑھاپے میں دہلی کی مسجد فتح پوری اور طبیہ کالج دہلی میں طالب علموں کے ساتھ بیٹھ کر علم حاصل کیا کرتے تھے۔ اہل علم اور بڑے بڑے راجا اور نواب آپ کو یاد فرمایا کرتے تھے، خصوصاً نظام حیدر آباد، رام پور، لوہارو، دوجانہ، دتیا، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، کشمیر وغیرہ کے والیان ریاست، اکثر مدرسوں اور کالجوں میں بھی داستان گوئی کا سلسلہ جاری تھا۔ میر صاحب کی بڑی سادہ زندگی تھی۔ گورا رنگ، درمیانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، خشخشی داڑھی، تنگ موری کا پاجامہ، ململ کا کرتا، اس پر انگرکھا، پاؤں میں سرخ چمڑے کی دیسی جوتی، سر پر کلابتون کی گول ٹوپی۔ میر صاحب نے چند داستانیں ملک و قوم کے واسطے لکھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ گاڑھے خاں کا دکھڑا! گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی۔ یہ کتابیں ذو معنی ہیں جس (کذا) کو دہلی کے چیف کمشنر صاحب نے ممنوع قرار دے کر میر صاحب کو طلب کیا اور فرمایا: آپ تو چھپے رستم نکلے۔ لہٰذا آئندہ آپ اس مضمون کی کتاب نہ لکھیں۔ یہ زمانہ کانگریس اور خلافت کا تھا۔ اکثر آپ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد کے مضامین گھر پر تحریر کرتے تھے۔ میر صاحب نے چند کتابیں تحریر کیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1- خلیل خاں فاختہ	2- بہادر شاہ کا مولا بخش ہاتھی
3- گاڑھے خاں کا دکھڑا	4- گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی
5- باتوں کی باتیں	6- کام کی باتیں
7- فقیر کی جھولی	8- اہل محلہ اور نااہل پڑوسی
9- استانی	10- آداب واخلاق
11- آقا نوکر	12- طلسم ہوش افزا
13- ادھر ادھر ادھوں	14- چوری سینہ زوری
15- کون	16- خاتمہ داستان

"افسوس، میر صاحب نے اپنا کوئی جانشین نہ چھوڑا جس کی وجہ یہ تھی کہ مستقل مزاج شاگرد نہ مل سکا۔ اور میر صاحب کے خود کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ صرف ایک صاحبزادی تھی جو طبیہ کالج دہلی سے سند حاصل کر کے طبیبہ

باقری بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ہندوستان سے پاکستان آنے پر کراچی میں زنانہ شفاخانہ قائم کیا۔ پھر اس کراچی میں گھربار کے چھٹ جانے اور زندگی کے تلخ تجربوں میں مبتلا ہوکر بیمار ہوگئیں اور 1952ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ اب میر صاحب کے فرزند نسبتی اور نواسے موجود ہیں۔ (خلیل خان، فاختہ ص 19 تا 22)

کانا باتی از میر باقر علی داستان گو

مرتب۔ محمد سلیم الرحمٰن

میر باقر علی داستان گو کی مجلس

عزیز حامد مدنی

میر باقر علی داستاں گو کی مجلس تھی
دلی کے شرفا
خواتین ذی جاہ
کشاد سماعت کی خاطر کئی صاحب ذوق آئے ہوئے تھے
ادھر بزم شمعوں کی جھل مل سے اک بقعۂ نور تھی
اور ایسا اُجالا تھا اس جا کہ خود آفتاب سحر آئنہ لے کے حاضر ہوا ہو
مجمروں میں ادھر عود و عنبر کے پیچاں دھویں نے
جاگتی آنکھ کو خواب کے بال و پر دے رکھے تھے
دور و یہ قناتیں تھیں اور چلمنوں کی سبک اوٹ سے جھانکتے تھے پری وش
وہ چہرے کہ خود جن کے پرتو کی عفت سے آنکھیں
آپ اپنے ہی ہونے کی تازہ دلیلیں بنیں

ہر نظر ایک پاس نظر چاہتی تھی
ہر نگہ ایک سلک گہر چاہتی تھی
میر صاحب نے مسند سنبھالی

اور شاہی سواری کے اک فیل کی داستاں
اپنے انداز سے کی شروع

اور فصاحت کے تازہ افق سے

اک شب ماہ سی ہو گئی تھی طلوع

صاحبو، بی بیو!

ہمارا تمہارا خدا بادشہ

داورِ لم یزل

وہ قہار و غفار و ستار

وہ رزاق و جبار ہے

روزگار جہاں گردشیں کھا کے اب کیا سے کیا ہو گیا

مگر آلِ تیمور جب اپنے جاہ و حشم میں تھی یکتا

تو دتی کا وہ تاجدار فرشتہ صفت

جو سخن اور سخاوت میں یکتائے عالم تھا

اس کا ایک فیل مست

شہر میں فیل خانے سے نکلا

اس کے دانتوں پہ سونے کے پتر منڈھے تھے

جن پہ لعل بدخشاں کے گل باف خطاکو

شجرہ ہائے نسب کے امیں

خود جلاتے تھے اپنے لہو سے

اس کے ماتھے کا جھومر رقیبانہ چشمک سی

اوجِ ثریا سے کرتا تھا

جلوس اس کا دمامہ و دف کی آواز

شہنائی قرنا کے رس میں چلا تھا

رقص و رم کا سماں تھا

جھومتی چال تھی

ایک نشے میں اٹھتے قدم سے

غل زمانے کا نکلا تھا

پھول والوں کے میلے میں

جب بادشہ کی سواری نکلتی

تین صدیوں کی ساری روایت کا یہ جشن

اس قلعے کی سوچ خوں میں

ایک طوفاں اٹھاتا تھا

وہ فاتح کے مانند

جس کے مقابل کہیں سنگ و آہن کی دیوار گرتی ہوئی ریت کا ڈھیر ہو

اپنے خوابوں میں خود ہی مگن

تیز چلتا

زر فشاں خاک ان رہ گزاروں کی وہ

منہ پہ ملتا

جانور بے خبر بھی نہ تھا

کچھ سمجھتا بھی تھا شہر کے انتظامات تو کو

باغ در باغ

لال کرتی میں گورے جوانوں کی سب بینڈ باجوں کی ساری دھنیں

اس کے کانوں میں آتی تھیں

زہر سا کچھ پلاتی تھیں

لوگ کہتے ہیں دلی کی جانب بڑھے جب فرنگی

اور تفنگوں کی آواز سے

گونج اٹھی زمیں

اور ترازو تجارت کا کار سیاست کے حربوں کی ایک اوٹ ہونے لگا

لال قلعے کی اونچی فصیلیں

تو میتیوں کا ہونے لگیں اک ہدف

سرنگوں ہو گیا پرچم آلِ تیمور
اور فضا میں دَر آئی وہ تنگی
سانس لینا بھی مشکل ہوا
شہر آباد
کھلا ہوا ہو گیا اک صدف
تو وہ فیل زنجیر توڑے ہوئے فیل خانے سے جنگل کی جانب گیا
شکستہ در و بام کا داغ دل میں لیے
اور برسوں انھیں جنگلوں میں وہ گھوما کیا
جہاں اس کے آبا کی ہیبت کا سکہ جما تھا
وہ گھوما کیا

اور پھر ایک دن
شہر کی یاد نے جب ستایا
تو چنگھاڑتا ان بنوں سے نکل کر چلا
روندتا خار و خس کو
درختوں کو مسمار کرتا ہوا
بلندی و پستی کو ہموار کرتا ہوا
شہر کی سمت آیا
مسافت کا اک موڑ آیا تو دیکھا کہ چند آہنی پٹریاں سی بچھی ہیں
جو میلوں برابر چلی جا رہی تھیں
ادھر شہر پر تھا فرنگی کا قبضہ
شہر کیا ارضِ ہندوستاں ان کے قدموں سے پامال تھی
آئنہ بندیاں شہر کی سب نئی تھیں
قانون و زنداں
شکنجے و شمشیر و سنداں نئے تھے
پٹریاں ریل کی

شہر در شہر

جال سے خود بچھائیں
جنگلوں سے گزرتیں پہاڑی سرنگوں میں کھاتی ہوئی بل
ایک نخش تپاں کی طرح
دور میلوں کی وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں
اس نے دیکھا کہ مدمقابل بھی اک آہنی فیل چنگھاڑتا آرہا ہے
وہ کہ تھا یادو باراس کا پالا ہوا
جس کے اجداد کے استخوانوں میں تھیں جذب
جنگلوں کی سیاہی میں آتی ہوئی آندھیاں
اور سورج کی وہ آتش تیز جس سے زمینوں کے قلب وجگر جل گئے
ان زمینوں میں پالی ہوئی ساری نسلوں کا وہ بھی تو وارث تھا
صدائے تفنگ آشنا کان تھے
رزم آراؤں کی تربیت تھی
وہ تیروں کی بوچھاڑ میں بارہا
جا چکا تھا
نشاناتِ فتح وظفر لے کے
آہنی فیل کو دیکھ کر اس کے غصے کی حد جلال آ گئی
اور گرز و تبر کی طرح
سونڈ اٹھائے ہوئے وہ
مقابل میں آیا
صف آرا قدیم وجدید ایک پٹڑی پہ تھے
اک طرف ایسی طاقت تھی
جو پاسِ شجاعت کی جاری رگ وپے میں جاتی ہوئی بھی
دوسری سمت
چالاک وسفاک

ایجاد کی ایک علامت تھی
اک سیہ فام انجن
کف در دہاں
عہدِ نو کے تحکم کا اژدہا سا
پہلی ٹکر سے وہ فیلِ شاہی لڑکھڑاتا ہوا نیم رخ سا ہوا
ٹوٹ کر گرنے والی چٹانوں کے مانند
لڑھکتا ہوا کروٹیں سی بدلتا
دوسری کی سمت لے کے اٹھا ہی تھا
کہ اک آن میں فیلِ شاہی
بیاباں کے دامن میں بے نام میت ہوا
اس کے مبہوت سارے تماشائی مداح
اپنی بے چارگی میں فراست کی ہر تازہ کاری سے
منہ موڑ کر خود کھڑے تھے

صاحبو...... بی بیو!
یہ افتاد کیا بس فنا و بقا کی یہ چوسر ہے
زمانہ ورق جب الٹتا ہے
بساطِ روایت لپیٹتی ہے
ساز و ساماں نئے
حدیثیں نئی اور عنواں نئے
رو کیے اشکِ خونیں و چاکِ جگر کو
صاحبانِ زمانہ نئے اور دوراں نئے
آ ہی جاتے ہیں

صاحبو...... بی بیو!
ہمارا تمھارا خدا پادشہ

داورِ علم یزل

وہ قہار و غفار و ستار ہے
وہ رزاق و جبار ہے
مری داستاں ختم ہونے کو آئی
چراغ اب بڑھاؤ
نئے داستاں گو
تازہ تر واردات زمانہ کہیں گے
میں نے تاریخ کے تار و پو کو
اپنی سوچ نفس میں پرو کر
داستاں جو بنی تھی وہ اب ختم ہے
وہ شب داستاں گو
جو اک جوئے حرف و سخن کی طرح
صبح تک باقی تھی تاب لب ختم ہے
کوشش فردا کی خاطر
مری داستانوں کی شب ختم ہے

میر باقر علی......تم نے پھر بیچ میں داستاں روک دی؟

زیف سید

شاہ گل فام گنجل طلسموں کی گتھیوں کو سلجھاتا
صرصار جنگل کے شعلہ نفس اژدروں سے نمٹتا
بیابانِ حیرت کی بے انت وسعت کو سر کر کے
پھریرے پہ مامور یک چشم دیووں کی نظریں بچا
سبز قلعے کی اونچی نگر پھاند کر
مہ جبیں کے معطر شبستان تک آن پہنچا ہے

اور اس طرف حق و طاغوت مدِ مقابل ہیں
آنکھیں جدھر دیکھتی ہیں کلہاڑوں کی، نیزوں کی، برچھوں کی فصلیں کھڑی لہلہاتی نظر آ رہی ہیں
جری سورما آمنے سامنے ہنہناتے، الف ہوتے گھوڑوں پہ زانو جمائے ہوئے منتظر ہیں
ابھی طبل پر تھاپ پڑنے کو ہے

اور ادھر شاہزادہ طلسمی محل کے حسیں دودھیا برج میں شاہزادی کے حجلے کے اندر
ابھی لاجوردی چھپر کھٹ کا زربفت پردہ اٹھا ہی رہا ہے
مگر میر باقر علی
تم نے پھر بیچ میں داستاں روک دی

راہداری، منقش در و بام ہست رنگ قالین، بلور قندیل، فوارہ بربط ستار
جھروکوں پہ لہراتے پردوں کی قوسِ قزح
میمنہ، میسرہ، قلب، ساقہ، جناح
آہنی خود سے جھانکتی مرتعش پتلیاں
رزم گہ کی کڑی دھوپ میں ایک ساکت پھریرا
چھپرکھٹ پہ سوئی ہوئی شاہزادی کے پیروں پہ مہندی کی بیلیں۔۔۔

فصاحت کے دریا بہاتے چلے جا رہے ہو۔۔۔
بلاغت کے موتی لٹاتے چلے جا رہے ہو۔۔۔

مگر میر باقر علی داستاں گو، سنو!
داستاں سننے والے تو صدیاں ہوئیں اٹھ کے جا بھی چکے ہیں
تم اپنے طلسماتی قصے کے پر پیچ تاگوں میں ایسے لپٹتے گئے ہو
کہ تم کو خبر ہی نہیں۔۔۔
سامنے والی نکڑ پہ اک آنے کی بائسکوپ آ گئی ہے!

داستانیں

خاتمۂ داستان، مرحوم میر باقر علی داستان گو دہلوی

بلبل ہزار داستان کی زندگی کی مختصر داستان

سید صغیر حسین

میرا بچپن تھا۔ چھوٹے دولھا بھائی اور چھوٹی باجی دونوں ضعیف ہو چکے تھے۔ خاندان والے زیادہ تر چھوٹے دولھا بھائی ہی کہا کرتے تھے۔ چچا، ماموں اور خالو بہت کم کہتے تھے۔ خاندان اور اہلِ محلّہ بہت عزت کرتے تھے، جہاں وہ باہر سے گلی میں داخل ہوئے اور بچے چھپ گئے۔ میری یہ حالت تھی ان کی شکل دیکھی اور غائب لیکن جب کبھی بچے (مجھے) پڑھا۔ کیوں میاں پڑھتے نہیں، کیوں وقت گزار رہے ہو۔ حقیقتاً علم ایک ڈراؤنی گھٹا ہے۔ گرجتی، چمکتی اور برستی ہے تو آبِ حیات برساتی ہے۔ گھر میں قدم رکھا اور آہستہ آہستہ بچے اور محلّے والیاں غائب، غرض ہر ہر قدم پر نصیحت راہ چلتے کو بھی کیا کرتے تھے۔ خدا غریقِ رحمت کرے وہ باعمل تھے اور دوسروں کو باعمل دیکھنا چاہتے تھے۔

آل انڈیا پیراکی ٹورنامنٹ دہلی میں ہونے والا تھا۔ مقابلے میں شرکت کے لیے میں روزانہ دریائے جمنا پر مشق کرتا تھا۔ آپ کو جب معلوم ہوا مجھ کو بلا کر نصیحت فرمائی کہ میاں سیکھو ہنر ہے مگر چھوڑ دینا۔

زمانہ گزر گیا اور گزر جائے گا مگر علم کسی کا رائیگاں نہیں جاتا۔ قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں لیکن ملک اور قوم کی خدمت کرنے والوں کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرتی۔ اللہ کا شکر ہے آج میر صاحب پھر زندہ ہو گئے اور ان کے علم سے دنیا پھر مالا مال ہو گئی۔ دلّی والوں کو بجا طور پر فخر ہے جو میر صاحب نے دوسروں کے مقابلتاً دلّی کا نام روشن کیا۔ یہ ذمے داری دہلی کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اس نور کی شمع کو بجھنے نہ دے اور ان کے علم سے فائدہ حاصل کرے۔

مرحوم میر باقر علی داستان گو 1850ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور 1928ء میں انتقال ہوا۔ میر صاحب کے بزرگ ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ کے والد میر حسین علی اور آپ کے نانا میر امیر علی شاہی ملازم تھے۔ آپ کے والد کا سایہ بچپن میں اُٹھ گیا تھا۔ آپ نے اپنے نانا کے ہاں پرورش پائی جو ترکمان دروازے دہلی میں رہا کرتے تھے۔ فنِ داستان گوئی کو اپنے ماموں سے سیکھا جو اس وقت نظام حیدر آباد کے ہاں داستان گو

تھے۔ بچپن کا زمانہ خوب گزرا، بادشاہ کے ہاں سے فصل کی ہر چیز آیا کرتی تھی۔ جاڑوں میں حلوا سوہن کی ٹکیاں۔ آموں کی گاڑیاں، جوئوں کے چھکڑے، آپ نانا کے ہمراہ قلعے میں جاتے اور بادشاہ کے بچوں کے ساتھ کھلونوں سے کھیلا کرتے تھے۔ وہ آپ کو یاد تھے۔ بکھراج کی گڑیا، زمرد کا طوطا، سونے چاندی کے جھنجھنے۔ میر صاحب نے اپنی کتاب بہادر شاہ بادشاہ کا ہاتھی میں چشم دید حالات تحریر کیے ہیں۔ دہلی میں ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا اس وقت میر صاحب کی عمر سات آٹھ سال کی تھی۔ آپ نے اپنی والدہ اور نانا کے ہمراہ دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک مقام جو شاہِ مرداں کے نام سے مشہور ہے، جس کو اس زمانے میں علی گنج کہا کرتے تھے ٹھہر کر پناہ لی۔ اس جگہ کو نواب قدسیہ بیگم نے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں قدمِ مبارک حضرت علی علیہ السلام نصب ہے، علاوہ بہت سی مسجدیں، امام باڑے، پرانی قبریں، کنویں اور باولیاں آج تک آثار قدیمہ کی یادگاریں ہیں۔ ماہ محرم میں تمام اہلِ اسلام یہاں تعزیہ دفن کرتے اور یادِ شہید الشہدا کو تازہ کرتے ہیں۔ چنانچہ جب دہلی میں امن قائم ہوا اور دہلی والے واپس اپنے اُجڑے ہوئے مکانوں میں آئے تو میر صاحب بھی واپس آ گئے۔ یہ عجیب زمانہ تھا۔ انگریزوں کی سکہ شاہی، انگریزی کی ترقی، علم اردو و فارسی کی تنزلی۔ غرض دنیا ہما گیر (ہمہ گیر) مشکلات سے دوچار تھی۔ بادلِ ناخواستہ زندگی کے دنوں کو پورا کیا۔ ایک مدرسے میں تعلیم جاری رکھی۔ علم کا اتنا شوق کہ بڑھاپے میں دہلی کی مسجد فتح پوری اور طبیہ کالج دہلی میں طالب علموں کے ساتھ بیٹھ کر علم حاصل کیا کرتے تھے۔ آپ نے فنِ داستان گوئی کو چار چاند لگا دیے۔ مشہورِ زماں، فصیحِ دوراں، بلبلِ بوستاں، معانیٔ معدن، شیریں زبانی، مایۂ ناز بلیغ الکلامی کے علاوہ خواجہ حسن نظامی صاحب سے مقررِ کائنات کا خطاب حاصل کیا۔ اہلِ علم اور بڑے بڑے راجہ نواب آپ کو یاد فرمایا کرتے تھے۔ خصوصاً نظام حیدرآباد، رام پور، لوہارو، دوجانہ، دتیا، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، کشمیر وغیرہ کے والیانِ ریاست جو آپ کے فنِ داستان گوئی کی قدر افزائی فرمایا کرتے تھے۔ اکثر مدرسوں اور کالجوں میں بھی داستان گوئی کا سلسلہ جاری تھا۔ میر صاحب کے بعد آج ہندو پاکستان میں اس فن کا کوئی فن کار نظر نہیں آتا۔ میر صاحب کی بہت سادہ زندگی تھی گورا رنگ، درمیانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، خشخشی ڈاڑھی، تنگ موری کا پاجامہ، ململ کا کرتا، اس پر انگرکھا، پاؤں میں سرخ چمڑے کی دیسی جوتی۔ سر پر کلابتوں کی گول ٹوپی۔ وقت کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے۔ پاخانے میں بھی چار کام، کتاب کا مطالعہ، چھالیہ کترنی، منجن کرنا اور ضروریات سے فارغ ہونا۔ ایک مرتبہ روشن آرا باغ دہلی میں لاٹ صاحب کی دعوت ہوئی۔ کسی وجہ سے میر صاحب کو خبر نہ ہو سکی۔ آپ وقتِ مقررہ پر باغ کے پھاٹک پر پہنچ گئے اور لاٹ صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔ جب لاٹ صاحب تشریف لائے تو میر صاحب نے سب سے پہلے سلام کر کے ہاتھ ملایا اور گفتگو شروع کر دی۔ لاٹ صاحب میر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہمراہ لے گئے۔ دو مرتبہ آپ کو دہلی میونسپلٹی نے بلا کر لاٹ

صاحب کے سامنے پیش کیا۔ ایک مرتبہ نواب صاحب فرید کوٹ نے بھی شادی کے موقعے پر بلا کر لاٹ صاحب کو داستان سنوائی۔ لاٹ صاحب نے داستان کے بعد میر صاحب کی عزت فرمائی۔ ریاست پٹیالہ میں جب میر صاحب کو یہ حکم ملا کہ وہ اپنے سر پر صافہ باندھ کر دربار میں پیش ہوں تو آپ اُسی وقت واپس اسٹیشن چلے گئے۔ جب محل کے داروغہ کو معلوم ہوا کہ میر صاحب چلے گئے تو وہ دوڑا ہوا اسٹیشن آیا اور کہا حضور میں بال بچے دار ہوں، مر جاؤں گا۔ میر صاحب نے اُس کو جواب دیا کہ جو میرے لباس کو پسند نہیں کرتا وہ کب میری "داستان" کو پسند کرے گا آخر کچھ دیر سوچ کر مہمان خانے چلے آئے، اتفاق کی بات اُسی رات مہمان خانے کی لالٹین ٹھیک بارہ بجے گل ہوگئی اور میر صاحب کے مطالعے میں خلل واقع ہوا چنانچہ دوسرے دن داستان کا وقت مقرر تھا۔ مقررہ وقت سے چندرہ منٹ جان بوجھ کر ٹھہر گئے اور انتظار کی گھڑیاں بڑھنے دیں۔ تقریباً چندرہ منٹ بعد روانہ ہوئے اس شان سے کہ صافہ آدھا سر پر اور آدھا بغل میں دبا لیا۔ جب دربار میں پہنچے تو عجیب شان تھی کبھی سر سے صافہ اور کبھی بغل سے گرا دیتے ہیں۔ چاروں طرف آداب شاہانہ جاری ہیں۔ ہر طرف سے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور ہر طرف میر صاحب مخاطب ہو کر اپنی کہے چلے جا رہے ہیں۔ میرے باپ دادا نے صافہ نہیں باندھا لیکن تعمیلِ حکم سے بھی انکار نہیں۔ میں دار السلطنت دہلی کا رہنے والا ہوں، میں نے شاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ غرض مہاراجہ کو یہ کہنا پڑا میر صاحب آپ جس حالت میں ہوں تشریف لایا کریں۔ اب داستان کا وقت قریب آیا اور آپ سے کہا گیا کہ کچھ شام کا حال بیان کیجیے تو میر صاحب نے کئی شاموں کے نام گنا دیے۔ ایران، عراق، شام، فلسطین وغیرہ وغیرہ۔ یہ فیصلہ بھی میر صاحب پر ہی رہا کہ جیسا آپ مناسب فرمائیں تو میر صاحب نے صبحِ بنارس اور شامِ (اودھ) کا حال سنایا۔ دورانِ داستان میں یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کا نظامِ سلطنت بہت پسند آیا کہ رات کو ٹھیک بارہ بجے لالٹین گل ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے پٹیالہ میں رہنے کے بعد وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے دہلی آ گئے پھر ایک صاحب ریاست پٹیالہ سے کچھ روپیہ لے کر دہلی آئے۔ میر صاحب نے نہ روپیہ لیا اور نہ خود گئے۔ کہہ دیا میں کسی کا ملازم نہیں۔ میں تو اپنا فن پیش کرتا ہوں۔ شاہانِ مغلیہ کے دور میں لائق داستان گو قصے کے تحت ہر طرح کے علوم و فنون کو ایسے دلچسپ پیرایوں میں بیان کرتے تھے کہ چھوٹے بڑے سب نہایت دلچسپی سے سن لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ داستان علوم و فنون سے آراستہ ہوا کرتی تھی جس کو سُن کر شہزادوں پر بھی اچھا اثر ہوا کرتا تھا۔ آپ جب علی گڑھ کالج میں داستان بیان کر چکے تو نواب محمد اسحاق خاں صاحب نے تمام طلبا اور طالب علموں سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ لوگوں نے سنا کہ آپ کے ملک کا کیسا مفید اور شریف فن ہے آپ بھی میر صاحب کی طرح اس فن کو اپنانے کی کوشش کریں۔ میر صاحب نے چند داستانیں ملک و قوم کے واسطے لکھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ گاڑھے خاں کا ذکھڑا۔ گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی۔ یہ کتابیں رومانی ہیں جن کو دہلی کے چیف کمشنر صاحب نے ممنوع قرار

دے کر میر صاحب کو طلب کیا اور فرمایا آپ تو چھپے رستم نکلے۔ لحاظا (لہٰذا) آئندہ آپ اس مضمون کی کتاب نہ لکھیں۔ یہ زمانہ کانگریس اور خلافت کا تھا۔ اکثر آپ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد کے مضامین گھر پر تحریر کرتے تھے۔ میر صاحب نے چند کتابیں تحریر کیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔(1) خلیل خاں فاختہ (2) بہادر شاہ بادشاہ کا سولا بخش ہاتھی (3) گاڑھے خاں کا دُکھڑا (4) گاڑے خان نے ململ جان کو طلاق دے دی (5) باتوں کی باتیں (6) کام کی باتیں (7) کانا باتی (8) فقیر کی جھولی (9) اہل محلہ اور نا اہل پڑوس (10) استانی (11) آداب واخلاق (12) آقا نوکر (13) طلسم ہوش افزا (14) ارا را دھوں (15) چوری سینہ زوری (16) کون (17) خاتمۂ داستان، جو ہند سے پاکستان منتقل ہونے پر تلف ہو گئیں اب ان شاء اللہ دوبارہ پیش کی جائیں گی۔ افسوس میر صاحب نے اپنا کوئی جان نشین نہ چھوڑا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ مستقل مزاج شاگرد نہ مل سکا اور میر صاحب کے خود کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف ایک صاحبزادی تھیں جو طبیہ کالج دہلی سے سند حاصل کر کے طبیبہ باقری بیگم کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ استانی کتاب مرحومہ باقری بیگم نے لکھی ہے اور کچھ کچھ داستان کی مہارت بھی حاصل ہو گئی تھی لیکن مرحوم کی بے وقت موت سے صاحبزادی تشنہ کام رہیں۔ ہندوستان سے پاکستان آنے پر کراچی میں زنانہ شفاخانہ قائم کیا پھر اس کراچی میں گھر بار کے چھٹ جانے اور زندگی کے تلخ تجربوں میں مبتلا ہو کر بیمار ہو گئیں اور 1952ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ اب میر صاحب کے فرزند نسبتی اور نواسے موجود ہیں۔ چوں کہ نواسے ابھی زیر تعلیم ہیں اس وجہ سے میر صاحب کے علم کو زندہ رکھنے میں راقم الحروف دلچسپی لے رہا ہے اور خصوصاً اُن علم دوست حضرات سے درخواست بھی کرتا ہے جو میر صاحب کے حلقۂ احباب میں قریب تھے وہ میر صاحب کے علم کو زندہ رکھنے میں میری ہر قسم کی اعانت فرمائیں۔

میر صاحب نے جو داستانیں تحریر کی ہیں وہ بے حد دلچسپ و نصیحت اور حکایت سے پُر ہیں جن کو پڑھ کر ملک اور قوم کے افراد فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے بھی میر صاحب کی کہانیاں "طرز داستان" میں نشر ہوا کرتی ہیں۔

میں ان تمام بزرگوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جو میر صاحب کے علم کو زندہ رکھنے اور ملک و قوم تک پہنچانے میں مجھ سے تعاون کر رہے ہیں:

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا، ولے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے؟ کیدھر چلے

خلیل خاں فاختہ

میر باقر علی

خلیل خاں پنشن خوار عمر 82 سال لمبا قد، گندمی رنگ، کتابی نقشہ، چہرے پر جھریاں، ناک کی نوک پر مُنگی کے رنگ کا لیکن مُنگی سے بڑا مغرّی دار مسّہ۔ کسی قدر ہونٹ کی طرف جھکا گویا ہونٹوں سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہے اور مسّے کی نوک پر دو موٹے موٹے بال ایک سفید دوسرا کالا بھورا، بل دار تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اوپر کی طرف سکڑ گئے ہیں تو ناک کے بانسے پر لپٹی ہوئی گاڑھی رطوبت اور کالے کالے چوہے نظر آتے ہیں۔ منہ میں صرف دو دانت ہیں سامنے کے چار دانتوں میں سے ایک دانت نیچے کا اور اوپر کی طرف کی پچلی جو سوڑے گلنے کی وجہ سے جڑ تک گھل گئی ہے اور میل سے زرد اور سبز سیاہی لیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ داڑھی گھن دار ناف تک آپ کو خضاب کا شوق ہے تو گرمیوں میں روز اور جاڑے میں جب دن گرم ہوتا ہے تو گاہے ماہے لگا لیتے ہیں۔ آج کل جدت پسند دنیا والوں نے مہندی اور نیل کا لگانا وقت سمجھا ہے اس وجہ سے خضاب میں لوگوں نے بہت ہاتھ رنگے اور خلیل خاں کی لمبی ڈاڑھی دیکھ کر مفت نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ نہایت خسیس ہیں۔ مفت سمجھ کر دوتا نوتا خضاب لگاتے ہیں تو آپ کی ڈاڑھی آسمان کے خط قوس قزح پر گندے دار ہونے کی وجہ سے تف کر رہی ہے اور گیدڑ اپنی گندے دار دُم کو مقابل نہ سمجھ کر دُم دبا کر بھاگتا ہے۔ خلیل خاں پان کھانے کے شوقین ہیں لیکن دانت نہ ہونے کی وجہ سے پان پن کٹی میں کچل کر کثرت سے کھاتے ہیں تو پان کی پیک ہونٹوں اور باچھوں کی جھریوں سے بہہ بہہ کر جو ٹھوڑی اور ریش بچہ پر آتی اور گرم پیک کے بہنے کی جو سلسلاہٹ ہوتی ہے تو آپ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے پونچھ لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہاتھوں کی انگلیاں اور دونوں ہتھیلیاں اور چار انگل تک داڑھی سرخ اور باقی طرح طرح کے تجربوں سے گندے دار پنچ رنگی ہے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں بھنویں جھک آئی ہیں اور چند بال موٹے پیدا ہو کر پلکوں سے ہمسری کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ خلیل خاں نے ایک آنکھ کے پانی کا قدح کرایا ہے

اس وجہ سے عینک ہر وقت لگی رہتی ہے۔ کمانی کا خم جو ناک پر چبھتا ہے تو آپ نے اُس زخم پر لال دھجی لپیٹ لی ہے پرانی کمانی ڈھیلی ہو گئی ہے تو ڈورے سے اس کو باندھا ہے اور ڈورے کی گرہ بالوں پر لگالی ہے۔ جس سے ایک ڈورے کا پھندا اور دوسرے ڈورے کا سرا سفید میلا بالوں پر نظر آتا ہے۔

آپ وضع کے پورے ہیں۔ دستی پگڑی باندھتے ہیں، جوانی میں بانکے تھے تو اب بھی پگڑی بھنوں پر رہتی ہے۔ سر رعشے کی وجہ سے حرکت کرتا ہے تو کان کی لویں بھی حرکت کرتی ہیں، کمزور اتنے ہیں کہ پوست اور استخواں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں۔ دونوں کہنیاں جوانی کی بے ربطیوں سے اُتر گئی تھیں۔ جوڑ کہنی کا نہایت پیچیدہ اور گھر پندار ہے۔ اس وجہ سے بیٹھا نہیں تو کہنیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ پہلے موٹے بہت تھے اس وجہ سے جگہ جگہ کی کھال لٹکی ہوئی ہے۔ کمر میں اتنا خم ہے کہ جب راستہ چلتے ہیں تو لکڑی اور زمین اور قدم مل کر ایک مربع بن جاتا ہے۔ بیوی کا پرسوں انتقال ہو گیا ہے اور کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ ایک روز خلیل خاں بے چارے ضعف کے مارے گھٹنوں میں سر دیے، دونوں ہاتھ پاؤں پر رکھے اُونگھ رہے ہیں کہ کریمن، مشاطہ کسی کام کو آئی۔ خلیل خاں کا یہ حال دیکھ کر کریمن نے آواز سے کہا میاں آج کیسا مزاج ہے جو حضور یوں شکوے سٹے لپٹے لپٹائے سر جھکائے بڈھوں کی سی صورت بنائے بیٹھے ہیں۔ میں آداب عرض کرتی ہوں۔

بڈھے کا لفظ سن کر خلیل خاں کو جذبہ آ گیا سر اُٹھا کر کڑک کر آواز دی کہ بڑھیا تم ہو گی زبان سے نہ نکلا اور ایسی شدت سے کھانسی اُٹھی کر کھایا پیا سب نکل گیا۔ کریمن یہ دیکھ کر گھبرائی، پرانی توشک ان کے نیچے سے کھینچ کر نکالی۔ خلیل خاں میں اتنا دم کہاں تھا جو اُٹھتے کیوں کہ تے بدن کا زلزلہ ہے جب سانس قائم ہوا اور کریمن توشک دھوپ میں ڈال کر ہاتھ دھو کر خلیل خاں پاس آئی خلیل خاں نے کہا آؤ کریمن بی بیٹھو، کریمن سلام کر کے بیٹھ گئی۔

خلیل خاں نے کریمن سے کہا کہ بی کریمن خدا کی شان ہے کہ تم ہمارے پڑوس میں رہو اور تم کو ہمارا اتنا خیال بھی نہیں جتنے اُوڑو پر سفیدی، کریمن نے چونک کر جواب دیا کہ واری جاؤں یہ کیا حضور نے فرمایا مجھے اور حضور کا خیال نہ ہو گا تو کیا کسی راہ چلتے کا ہو گا۔ میری تو جان بھی حضور کے کام آئے تو آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک۔

واہ واہ واہ۔ یہ خوب ارشاد ہوا۔

خلیل خاں نے کہا کہ بی کریمن تمھاری جان تم کو مبارک رہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا سن ابھی اس قابل نہیں کہ بے بیوی کے زندگی بسر کر سکوں۔ ابھی ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، طاقت بدن میں ہے، حواس درست ہیں اور کسی قسم کی خرابی دماغ میں نہیں۔ گاڑی میں سوار ہو کر دوپہر ہوا خوری کرتا ہوں۔ سب طرح سے فضل الٰہی ہے پھر کیا جو مجرد رہ کر شادی نہ کروں۔

کریمن نے سر سے پاؤں تک بلائیں لے کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کنپٹیوں پر چٹخائیں اور کہا کہ میاں کل کا دن بیچ پرسوں ہی تو چھٹی مری ہیں۔ کئی دفعہ خیال آیا کہ میاں کی شادی جلدی ہو جائے تو اچھا ہے لیکن پھول، دسواں، بیسواں، چالیسواں نہیں ہوا ایسا نہ ہو کہ لوگ اعتراض کریں۔

خلیل خاں نے کہا کہ میں اعتراضوں کو دیکھوں یا اپنی ضرورت کو۔ اگر لوگ کہیں کہ میاں تمھارے منہ پر ناک بُری ہے تو کیا کٹوا ڈالوں۔ واہ واہ یہ تم نے خوب کہا۔ ہاں میں تو اتنا چاہتا ہوں کہ لڑکی کمسن ہو خاندان اچھا لیکن صورت ایسی ہو کہ ہزار پانسو خوب صورتوں میں جواب نہ نکلے۔ سلیقہ شعار ہو، پڑھی لکھی عفیف، نیک طینت اور ہاں اس کا خیال رہے کہ سن پندرہ اور سولہ برس کے اندر ہو۔ کریمن نے یہ سن کر عرض کی کہ جناب یہ باتیں تو سب کی سب الف خاں رسالدار صاحب کی بیٹی میں ہیں اور جو کچھ جناب نے فرمایا اس سے بھی افضل۔ خدا جھوٹ نہ بلائے عورتیں تو ہزاروں لاکھوں نظر سے گزری ہیں لیکن اس شان کی لڑکی میری نگاہ سے نہیں گزری۔ میں تو کیا ہوں بوڑھی بوڑھی عورتیں کہتی ہیں صورت دیکھو تو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ دسوں انگلیاں دسوں چراغ اور صورت کے ساتھ اخلاق ایسے کہ اس سے ایک دفعہ انسان ملے اور تمام عمر بھر اُسے بھول جائے کیا ممکن اور اُس سے دو دو باتیں کر لے تو پھر ایک لمحہ اس سے جدا ہونے کو جی نہ چاہے۔ گورا رنگ، لمبے لمبے بال، نہایت چمکدار نرم اور باریک وہ اس کا سیدھا سر گوندھا ہوا اور ڈھیلی ڈھیلی چوٹی گجھوواں، گوری گردن پر وہ بال جو چوٹی کے بلوں میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے نہیں آتے ہیں پیاری پیاری گردن پر جھلّوں کی صورت نظر آتے ہیں۔ اُس پر یہ طرّہ کہ گلاب کی سی پتّی، کانوں کی لوؤں میں، الماسی ایک ایک بُندہ جس کا عکس بوجہِ خوبیِ حُسنِ گردن میں نظر آتا ہے تو دیکھنے والوں کی گردنیں رُعبِ حُسن سے جھک جاتی ہیں۔ پیشانی کشادہ، باریک اور گھنی خمیدہ جٹی بھویں۔ ستواں ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، دانت جیسے موتی کی سی لڑی، صراحی دار گردن اور آنکھیں تو ایسی ہیں کہ دیکھی ہی نہیں۔ وہ عالم ہے۔

دوہا

امِین ہلاہل مدھ بھرے سیت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جو چتوت اکبار

آبحیات، زہر، جوبن، سفید، کالے، سُرخ
جلانے، مارنے، جھوم جھوم جائے، ایک دفعہ دیکھنے سے

جس وقت بلا تصنّع کسی طرف دیکھ لیتی ہے تو مردوں کا تو ذکر ہی کیا ہے عورتیں بیتاب ہو جاتی ہیں۔ ابھی کوارپنے کی وجہ سے رنگا پیلا نہیں پہنتیں لیکن وہ سادگی کھائے جاتی ہے لاکھ لاکھ بناؤ دیتی ہے۔

خلیل خاں نے کریمن سے کہا کہ بس بس میں ایسی ہی لڑکی کا مدت سے متلاشی تھا۔ سو اللہ کا شکر ہے کام بن گیا دیکھنا بی کریمن اگر میری شادی یہاں ہوگئی تو پھر تم کو مالا مال کردوں گا کہ دس آدمیوں سے حکومت کے ساتھ روٹی کھائے جاؤ اور عمر بھر تم کو ضرورت نہ ہو لیکن سنو شرط یہ ہے کہ اگر آج ہی دوپہر تک وداع ہو تو اچھا ورنہ پرسوں تک تو وداع کرہی لائیں۔ کریمن نے کہا کہ حضور وہ کیا کوئی بازار کا سودا ہے کہ گئے اور خرید لائے۔ یہ منہ کا نوالہ تو نہیں کہ نگل گئے۔ جناب یہ بنی بنارو کے کار ہیں۔ اس میں بڑی کھوتیاں ٹوٹتی ہیں، بر تلے پھٹتے ہیں، خوشامد کرتے کرتے دانت گھس جاتے ہیں اور وہ تو اللہ رکھو امیر گھر کی لڑکی کنبے قبیلے والی، بڑے چاؤ چونچلوں سے اور منتوں مرادوں سے پلی۔ تمام کنبہ ہاتھوں چھاؤں، رکھتا ہے۔ وہ لوگ جب تک اپنے ارمان نہ نکالیں گے ہرگز وداع نہ کریں گے۔ خلیل خاں نے کہا اچھا ایک ہفتہ۔ کریمن بولی جناب الف خاں صاحب کا سیدھا کرنا کوئی کھیل تو نہیں یوں تو ظاہرا دیکھنے میں سیدھے ہیں لیکن اصل میں بڑے ٹیڑھے۔ آپ جملہ آدمیوں میں اوپر ہی رہتے ہیں۔ کام کاج میں آندھی اور مینہ۔ اللہ نے اُن کی ذات متحرک بنائی ہے۔ ہاں اپنی طرف سے تو بہت کچھ پٹی پڑھاؤں گی، بہت کچھ سمجھاؤں گی آپ مجھے خوب جانتے ہیں۔ میں بھی تو ایک پرکالۂ آفت ہوں۔

بند

خلد سے حوروں کو باتوں میں لگالاتی ہوں
پردۂ قاف سے پریوں کو اُڑا لاتی ہوں
چرخ سے توڑ کے مہتاب و سُہا لاتی ہوں
کام بگڑے ہوئے ایک دم میں بنا لاتی ہوں
شام کو شام سحر کو نہ سحر سمجھتی ہوں
میں تو اُڑتی ہوئی چڑیا کے بھی پَر گنتی ہوں

ہاں! الف خاں کو شیشے میں اُتاروں گی، بہت کچھ سبز باغ دکھاؤں گی، اپنی کرنی میں کسر نہ کروں گی آگے تقدیر۔ خلیل خاں نے صندوقچہ منگا کر ایک اشرفی نکالی اور کہا یہ تو لو اور اس کام کو شروع کرو۔ کریمن نے اشرفی لے کر سلام کیا اور دعائیں دیتی ہوئی روانہ ہوئی۔

الف خاں ایک شریف مقتدر اور نہایت لائق آدمی ہیں اور ان کے دو بچے ہیں ایک کا نام مقصود علی خاں ہو اور دوسرے کا نام محمود علی خاں۔ یہ دونوں لڑکے کسرتی جوان، جمیع فنون سپہ گری یعنی بنوٹ، جھنکڑی، پھلیا، ناگ سوز، بن توڑ دھارانی، بکیتی، کرچی، بانک، پٹا، جنوتی، لجوتی، رستم خوانی، کرتا نک، لکھیتی، شیر بکر، شیر در، علی مدد وغیرہ سے واقف، سو پچاس دشمنوں میں گھر کر نکل جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ ایک روز محمود علی خاں

اور مقصود علی خاں اور الف خاں زنانہ مکان میں بیٹھے ہیں کہ کریمن نے آ کر سلام کیا اور دعا دے کر بیٹھی۔

الف خاں نے کریمن سے کہا۔ آج کدھر کی ہوا چلی، کیوں کر راستہ بھول کر آ گئیں۔ کریمن نے عرض کی سرکار کیا گزارش کروں آج کل گوڑ ازمانہ مہلت ہی نہیں دیتا۔ کچھ اپنی اپنی ایسی پڑی ہے کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔

الف خاں نے کہا ہاں سچ کہتی ہو۔ دنیا کی راہیں بہت پیچیدہ ہو گئی ہیں اور ہمارا ملک اُن سے بے خبر ہے۔ خیر دنیا کے دھندے یوں ہی زندگی کے ساتھ چلے جائیں گے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ آج کل کیسی بسر ہوتی ہے۔ کوئی تازہ شکار بھی پھنسا ہوا ہے یا نہیں۔ کریمن نے عرض کی۔ حضور شکار کیسا اس کا تو موسم ہی جاتا رہا۔ واری جاؤں اس وقت ایک عرض کرنے آئی ہوں اگر ناگوار نہ معلوم ہو۔ الف خاں نے فرمایا کہ بی اوّل تو انسان کو مناسب ہی نہیں کہ ایسی بات جو کسی کو ناگوار گزرے زبان سے نکالی جائے لیکن میں تم کو اجازت دیتا ہوں جو چاہو سو کہو۔

کریمن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ میرے سرکار! میں ایک بات لائی ہوں صاحبزادی کے واسطے۔ خاندان اچھا، عادتیں شریف، لڑکا پڑھا لکھا، دو روپے والا غرض کسی سے بات دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اولاد نہیں ہے اس وجہ سے شادی کرتے ہیں کہ بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ الف خاں نے تھوڑا سکوت کر کے کریمن سے پوچھا لڑکے کا نام کیا ہے۔ کریمن نے عرض کی خلیل خاں، الف خاں نے دریافت کیا کون سے خلیل خاں۔ کریمن نے عرض کی جو خسیس بازار اور مکھی چوس کی گلی میں رہتے ہیں۔ اللہ رکھو گھر کے کئی جہاز، بنک ذاتی، خود سوداگر، روپیہ ہر وقت پڑا ابجتا ہے اور دینا لینا تو ایسا ہے کہ بقول کسی کے ہاتھ میں ہڈی نہیں۔ الف خاں نے پوچھا اُن کی دکان کہاں ہے۔ کریمن بولی اے ایک جگہ ہو تو عرض کروں جگہ جگہ شہروں میں گماشتے کام کرتے ہیں۔ خود تو گوشہ نشیں ہیں روپیہ اتنا کھانے والا کوئی نہیں اس جھورے میں خود بھی نہیں کھاتے۔ ہیں تو جوان لیکن فکروں نے بڈھا بنا دیا دوسرے نل کا پانی، میل کا گھی، رشوت کے پردے کا گوشت میں نے خود دیکھا ہے کہ اکثر زرد دُبلا بڈھے بکرے کا گوشت لیکن جس میں سوائے بلغم کے کچھ نہیں، اب ہمارے شہر والوں کے چہروں پر رونق آئے تو کیوں کر۔ محمود علی خاں بولے جناب وہ گھورے جن کا نام صبح کو نہیں لیتے۔ میں جانتا ہوں جن سے حضور نے کیست جوڑی تھی اور انھوں نے نہایت بدمعاملگی کی تھی۔ الف خاں نے کہا جن کو بچے بان بٹنے کا چرخہ کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ بُرا مانتے ہیں اور چڑتے ہیں۔ محمود علی خاں بولے۔ ہاں، ہاں وہی۔ یہ سُن کر الف خاں کا رنگ سُرخ ہو گیا لیکن غصے کو ضبط کر کے یہ خیال کیا کہ جو شخص اپنے گھر آئے اُس کی دل آزاری شرافت سے بعید ہے لیکن خلیل خاں نے کیا سمجھ کر میرے ہاں یہ پیغام بھیجا۔ اُن کو جب تک سزا نہ ہو گی نہ مانیں گے اور اس سزا سے اوروں کو بھی سبق مل جائے گا۔ یہ سوچ کر کریمن سے کہا کہ بی تم کل آنا میں غور کروں گا۔ کریمن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ واری جاؤں میں خلیل خاں سے شرط کر کے آئی ہوں میری لاج حضور کے ہاتھ ہے۔ الف خاں نے کہا

تم گھبراؤ نہیں، فیصلہ تمھاری رائے کے مطابق ہوگا۔ کریمن نے خوش ہو کر کہا اللہ ہمارے سرکار کی عمر ہزار سالہ کرے اور دن دونا رات چوگنا مرتبہ بڑھائے۔ گھڑی گھڑی کی بلائیں دور ہیں۔ اب حضور میں آداب عرض کرتی ہوں۔ الف خاں نے کہا اچھا جاؤ۔ کریمن تو یہ کہہ کر گئی اور مقصود خاں بولے کہ حضور نے یہ کیسا وعدہ فرمایا وہ روپے والے ہیں تو اپنے گھر کے، کروڑ پتی ہیں تو ہم کو کیا۔ الف خاں نے مقصود خاں سے کہا کہ بیٹا تم کیا جانو کہ میں نے کیا کہا۔ بیٹا وعدہ ایسا ہے کہ جب اُس وعدے کا راز کھلے گا اُس وقت تم کو لطف آئے گا۔ ان شاء اللہ ایسی شادی کروں گا کہ جو سُنے ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔ مقصود خاں بولے کہ حضور کیا ہوگا۔ الف خاں نے کہا کہ اس کا اظہار ابھی مناسب نہیں ہاں جلدی ہی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ مقصود خاں تو یہ سُن کر چپ ہو گئے اور الف خاں نے اپنے خیال کے پہلوؤں کو بہ نظر غور دیکھا اور جو جو اسقام تھے اُن کو نکالا۔

یہاں بی کریمن خوش خوش میاں خلیل خاں کے مکان پر آئیں اور خلیل خاں کو جھک کر سلام کیا۔ خلیل خاں بولے کہو بی کریمن کیا کر آئیں۔ کریمن نے عرض کی کہ حضور مبارکباد لے کر آئی ہوں۔ اب تو حضور میرا منھ میٹھا کرائیے جب گزارش کروں گی۔ خلیل خاں نے کھانستے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا اور گردن سے اشارہ کیا ہاں لیکن کھانسی کی شدت نے اتنی مہلت نہ دی کہ زبان سے کچھ کہیں۔ رنگ چہرے کا لال ہو گیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بچارے نے اُگال دان اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے ناک پکڑ کر ایک لمبا سانس باہر نکالا جس سے بہت بڑا بھمبیا زردلیس دار اُگال دان کے کنارے پر پڑا اور کچھ حصہ کلّے کی انگلی اور انگوٹھے میں لپٹا رہا۔ خلیل خاں نے انگوٹھے اور انگلی کو اُگال دان کے کنارے سے پونچھا اور چٹکی کو اپنی ران سے اور ہتھیلی سے ناک کی نوک کو اوپر کی طرف رگڑ دیا۔ کریمن نے عرض کی حضور میں کام بنا لائی لیکن الف خاں بڑی مشکل سے سیدھے ہوئے ہیں۔ میرا قول تو یہ ہے:

کبت

میں تو سوں کہوں سُن من موہن انت بتاوو پکھرواڑوں
جل میں تھل میں پہاڑ میں ندی پٹ پر ناؤ چلا دیکھ لاؤں
کاگج کی سوری آگر جھاگر وارو کے کنج میں آگ چھپاؤں
جن تربن نے آنکھ نہ دیکھی میں واکو نکارہ بجاتی لاؤں

اب تو الف خاں کو ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ شیطان بھی پڑھائے تو نہیں بھولیں گے لیکن حضور جو کچھ ہو جلدی ہو، ایسا نہ ہو کہ دراندازی کر بیٹھیں اور بنی بنائی بات بگڑ جائے۔ خلیل خاں نے دریافت کیا کہ پھر کیا کرنا مناسب ہے۔ کریمن نے عرض کی کہ پہلے جو قاعدہ ہوتا ہے اسم نویسی کا رُقعہ جائے ہر طرح سے اُن لوگوں کا

دل ٹھک جائے گا تو وہ آپ کو بردکھوہ بلائیں گے تو آپ تشریف لے جائیں۔ خلیل خاں نے کہا کہ سنو بی کریمن مجھ کو ہمیشہ سسرال جانے سے نفرت رہی۔ شادیاں تو وہ کم میں کیسی پر سسرال جانے میں شرم ہی آئی۔ کریمن نے کہا کہ میاں، اللہ رکھو ان کی اکلوتی بچی آسودہ گھر، اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ کیا کچھ نہ کریں گے وہ تو ہر طرح سے اپنے ارمان نکالیں گے اور حضور کو شرم کیوں آئے۔ اللہ نے صورت، شکل، جوانی، خوب صورتی، قد و قامت، جامہ زیبی، بچپن میں اپنی ایڑی دیکھوں، حضور کے سر پر گوڑی سادی ململ کی دو پلڑی ٹوپی کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ لاکھ لاکھ بنا دیتی ہے اور ہاتھ پاؤں تو ایسے ہیں کہ بایدوشاید اور وواری مرد کا کیا بڈھا کیا جوان، ساٹھا سو پاٹھا مشہور ہے۔ اس نزلے گوڑے نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تو ایسا زمانہ آگیا ہے کہ جوانی بڑھاپا ساتھ ہی آتا ہے۔ میرے آگے کے بچے ہیں اور بال سفید۔ اے میں دور کیوں جاؤں۔ میرا نواسہ دیکھو تو بڈھا پھونس نظر آتا ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، جو بچے جوانی کی ترنگ میں غلط کاریاں بے سوچے سمجھے کر بیٹھتے ہیں وہ اسی طرح سر پر ہاتھ دھر کر روتے ہیں، خلیل خاں نے کہا بی کریمن ہم نے کیا کچھ نہیں کیا لیکن اپنے کو لیے دیے رہے۔ جب اب تک یہ حال ہے اور دو پلڑی ٹوپی کو سر سے اُتار اور اپنے تانبڑے پر ہاتھ پھیر کر کریمن کے آگے سر جھکا کر کہا لو دیکھو بال سب نزلے نے سفید کر دیے اور ہاتھ سے سر ٹٹول کر انگلی سے ایک سفید چٹھا دکھا کر کہا۔ اس چوٹ نے دماغ کا چورا کر دیا اور ایسا کمزور کیا کہ ایک بال تک نہ رہا۔ کریمن نے جو جناب کے سرِ اقدس پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ کھوپڑی نہیں۔ فرخ آباد کے تانبے کی کوری پتیلی کا اوندھا ہوا پیندا ہے۔ خلیل خاں نے اپنی تھوڑی پر ہاتھ رکھ کر منہ کھول دیا اور کہا کہ میں گھوڑے سے منہ کے بل گر گیا تھا جب سے دانتوں پر ایسا صدمہ آیا کہ اب صرف دو دانت ہیں باقی سب ندارد ہیں لیکن میں ان سے بھیسے کی نلی توڑ لیتا ہوں۔ کریمن نے جو دیکھا تو ایک دانت نیچے کا اور ایک نچلی اوپر کی وہ بھی ایسے، بات کرتے میں ہلتے ہیں، جس پر میل چڑھ کر زرد اور سبز اور لال لکیریں پڑ گئیں۔ جب آپ بات کرتے ہیں تو دانت اور ہونٹ میں لیس دار تار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب خلیل خاں نے بائیں آنکھ دکھا کر کہا کہ یہ آنکھ سیتلا سے خراب ہوگئی ہے سوا سے بھی کبھی کبھی دھوپ چھاؤں دیکھ لیتا ہوں اور پرسوں تو وہ پہر دن کو مطلع صاف تھا۔ دو تارے سورج کے قریب دیکھے تھے اور اس کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا لیکن داہنی آنکھ سے وہ کام کرتا ہوں کہ دونوں آنکھوں والے عاجز رہ جاتے ہیں۔ کیسی ہی اندھیری رات ہو، میں ہزار قدم سے شکل و صورت کا تو ذکر ہی کیا ہے، باریک سے باریک بال۔ گن لیتا ہوں اور کسی بال کی نوک پھٹی ہو تو بتا دیتا ہوں۔ ایک دن جامع مسجد کے مینار سے قطب کی لاٹھ پھلال چیونٹیوں کی قطار دیکھ کر اس کی چیونٹیاں۔ گن لی تھیں۔ سترہواں نسخہ گزرے میں نے خطِ غبار پڑھا تھا، پڑھتا گیا اب بھی پڑھ لیتا ہوں۔ کریمن نے عرض کی اے اللہ رکھو، حضور کا ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔ خلیل خاں یہ سُن کر کھڑے ہوگئے اور دونوں ہاتوں کو جھٹکا دے کر پھیلایا۔ پہلے

داہنی ٹانگ کو جھٹکا دے کر پھیلایا لیکن ڈگمگائے اور پھر بائیں ٹانگ کو جھٹکا دیتے تھے کہ گاؤ تکیے پر گرے اور سر دیوار سے اس زور سے ٹکرایا کہ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا اور سر میں گلگلا سا کنپٹی پر ابھر آیا۔ بیچارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے، رنگ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر چپ رہے اور کہا بی کریمن میں گرتا نہیں پر کیا کروں تین برس سے چوتھیا آتا ہے۔ اب جمعرات جمعرات آٹھ دن ہوئے کہ تپ نے مفارقت کی ہے اس وجہ سے ضعف ہے ورنہ مجھ میں اچھی طاقت ہے اور یہ کمزوری عارضی ہے جہاں چند روز کھایا پیا اور قوت آئی۔ تیاری تو بازار میں بکتی ہے اچھا اب تم جاؤ اور تیسرے پہر آنا میں مان سنگی کاغذ پر کسی خوش نویس سے رُقعہ اور مصوّر سے لوح اور جدولیں، بین السطور میں موش وغیرہ اس مطلّا بنوا رکھوں گا اور رومال کشمیری میرے پاس ہے جو دادا قبلہ نے پانسو روپے کو خریدا تھا۔ نوکروں کی غفلت سے اس میں ایسا کیڑا لگ گیا تھا کہ تو ان باندھنے کا بھی دم نہ تھا۔ میں نے رفوگر کو بیس روپے دے کر رفو کرایا لیکن رفوگر نے بڑا ہی رفو کر کے ایسا بنا دیا ہے کہ کیسا ہی نظرباز ہو شناخت نہیں کر سکتا کہ کہاں رفو ہوا ہے۔ کریمن نے کہا کیوں نہیں حضور کی شان کے لائق ایسا ہی رومال مناسب ہے۔ خداوند اجازت ہو کہ گھر جا کر ٹکیہ سینکوں گی تو کھاؤں گی۔ اب تو بھوک کے مارے منہ سے بات تک نہیں نکلتی۔ خلیل خاں نے نوکر کو آواز دی کہ کھانا لاؤ اور کریمن سے کہا کہ میرا تو پرہیزی کھانا ہے۔ تم سے کیا کھایا جائے گا صرف مرغ کے چوزے کا شوربا کہ جس میں نمک نہ مرچ چوگوشتہ پلاؤ جس میں باورچی سیر چاولوں میں سولہ سیر گھی کھپاتا ہے اور سوا سیر بادام کا حریرہ جس میں جواہرات اور کشتہ جات ہوتے ہیں علاوہ اور مفرحات اور مقویات کے اور قورمہ صرف ایک سیر کا سوا سیر گھی اور دہی کی جگہ بالائی برابر کی ہوتی ہے اور ڈھائی سیر آٹے کی روٹی، وہ آٹا دودھ اور گھی میں گندھا ہوا ہوتا ہے یہ سب چیزیں صرف میرے ہی قابل ہیں۔ ہاں اس غذا میں سے تو مجبوراً نہیں چھوڑتا اور اس کے سوا دس سیر دودھ اور سیر بھر بالائی کھاتا ہوں اور دو سیر قلاقند بس اور کچھ نہیں کھایا جاتا۔ کریمن نے اپنے دل میں کہا کہ اتنا ٹھونسنے کے بعد کیا اپنا آپا کھائے گا۔ خلیل خاں نے کہا کہ اب تو جاؤ اور روٹی کھا کر سیدھی چلی آنا اور کہیں نہ بہہ جانا۔ کریمن نے ہر چند پاؤں پٹے کہ کھانے کی صلاح کریں گے۔ لیکن خلیل خاں کے کان پر جوں تک نہ چلی۔ کریمن تو جل بھن کر چلی گئی اور خلیل خاں نے چھوداروغہ کو آواز دی۔ جب چھو آیا تو کہا کہ میاں چھو تم بازار سے ایک عمدہ کاغذ ستا سا لا دو اور روشن رقم خاں پاس جا کر میرا اسلام کہنا کہ بطور نمونہ پرُزہ رقعہ ہمارے سرکار نے لکھوایا ہے اس کا تو کچھ نہ دیا جائے گا ہاں میاں اپنی سوانح عمری لکھوائیں گے اس میں جو کچھ دیں گے اور کریمن سے میں نے یونہیں کہہ دیا ہے تم تو نمونہ والوں میں جا کر ایک ٹکڑا خرید لاؤ اور مضمون میں لکھے دیتا ہوں۔ غرض خلیل خاں نے کھانا کھا کر رقعہ لکھنا شروع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العلمین و العاقبۃ للمتقین و الصلوۃ علیٰ رسولہ و آلہ اجمعین برحمتک یا ارحم الرّاحمین۔

امابعد۔ نام بندے کا خلیل خاں ولد گلزار خاں ولد آتش خاں ولد مرزا شعلہ بیگ ولد شیخ انگارہ بدن ولد سید روشن علی ولد ہابیل برادر قابیل ولد حضرت آدم ساکن بہشت حال وارد دنیا اور جو بھولے بسرے ہوں اُن کی معافی چاہتا ہوں اور نام بندے کے نانا مرحوم کا دُھواں دھار بیگ ولد سلگو ولد گرم سواب مردانہ سلسلہ یہاں سے ایسا مفقود ہے کچھ پتا نہیں چلتا اس لیے عورتوں کے نام لکھے دیتا ہوں کہ بات پردے میں رہے۔ گرمو بنتِ سوختہ خانم چنگی بنتِ کلا بنتِ اخگر نسا، بنتِ چنگاری خانم بنتِ سلگتی بیگم بنتِ آگ بگولا بیگم اب عورتوں کا بھی نام معلوم نہیں اس وجہ سے بنتِ نمبر ایک بنتِ نمبر دو بنتِ نمبر تین بنتِ حضرت حوا ساکن فردوس حال وارد جہنم۔ قوم شریف پنشن خوار سرکار پیشہ خانہ نشینی کرتا ہوں۔

عمر بندے کی کاغذات گم ہونے کی وجہ سے معلوم نہیں کیا ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب دہلی کے چاوڑی بازار میں شاہ بولا صاحب کا بڑ بویا گیا تھا تو بندہ آٹھ برس کا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں وہی ہیں جو بچپن میں تھے اور بندے کا چال چلن آپ بیرم جان طوائف سے دریافت کر لیجیے کہ ایک زمانے میں میرا اُن سے تعلق رہا ہے اور اُن سے زیادہ اُن کے طبلے والے زغالو بن چنگو جو اس وقت اُستادِ زمانہ ہے اور انگلیاں طبلے پہ ایسی چٹختی ہیں کہ سننے والے سر دھنتے ہیں۔ فقط

راقم

عبدِ ذلیل یعنی میاں خلیل

یہ رُقعہ خلیل خاں صاحب نے لکھ کر چنو دار وغہ کو دیا اور فرمایا کہ جلد اس کو تیار کرا کے لاؤ۔ الغرض چنو نے خوشخط لکھوا کر مصور سے لوح بنوا خلیل خاں صاحب کو لا کر دیا۔ خلیل خاں نے آدمی بھیج کر کریمن کو بلوایا۔ جب کریمن آئی تو خلیل خاں نے وہ رُقعہ ایک لال ململ کی دجّی میں لپیٹ کر کریمن کے حوالے کیا اور کہا لو بی آج کی تاریخ نہایت مبارک ہے شام نہ ہونے پائے کہ یہ رُقعہ الف خاں صاحب پاس پہنچ جائے۔ کریمن رُقعہ لے کر الف خاں صاحب کے مکان پر آئی تو اس وقت الف خاں صاحب اپنے مردانے مکان میں بیٹھے ہیں اور کئی

دوست الف خاں صاحب کے پاس بیٹھے ہیں کہ کریمن نے آ کر سلام کر رُقعہ حوالے کیا۔ الف خاں نے وہ رُقعہ لے کر دوسری برابر کی کرسی پر رکھ لیا اور کریمن سے کہا کہ تم کل صبح کو آنا۔ جیسا مناسب ہوگا جواب دیا جائے گا۔ کریمن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی خداوندا اب اس میرے سفید چونڈے کی شرم حضور کے ہاتھ میں ہے۔ چاہے سیاہ کرو یا سفید۔ الف خاں صاحب نے کہا ہاں ہاں تم اطمینان رکھو۔ جو کام ہوگا وہ خلیل خاں صاحب اور تمھاری مرضی کے موافق ہوگا۔ کریمن سلام کر کے گھر آئی اور دوسرے دن صبح ہی کو پھر الف خاں کے مکان پر پہنچی۔ الف خاں نے کریمن کو بلا کر پاس بٹھایا اور کہا کہ ہم نے رُقعہ دیکھا۔ خلیل خاں قدیم سے بھلے مانس اور نئے خاندانی ہیں مجھے ہر طرح منظور، شرافت اُن کے گھر کی لونڈی آدم سے اس دم تک سلسلہ نسبی چلا آتا ہے۔ ننھیال ددھیال آفتاب اور ماہتاب لیکن اُن سے کچھ باتیں دریافت طلب ہیں۔ ایک تو مہر ہمارے خاندان میں مقرر ہے اُس سے کم نہ ہوگا۔ دوسرے پاندان کے دو ہزار روپے ماہوار ہوں گے جو ہر مہینے پہلی تاریخ کو ادا کر دیئے جائیں۔ تیسرے کنبہ قبیلہ میں شادی تھی جب ہوگی لڑکی جائے گی علاوہ اس کے کبھی طعن وتشنیع سے زبان کو آشنا نہ کریں اور بیس لونڈیاں دولھن کے ہمراہ رہیں گی۔ جن کے کھانے کپڑے کا عمدہ بندوبست کرنا پڑے گا۔ اور دونوں وقت ہوا خوری کو آندھی ہو مینہ ہو لڑکی جائے گی اور اخلاق جو آج کل کی لڑکیوں کے ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ اور جب ہمارے یہاں لڑکی کو وداع کرتے ہیں تو چھنگلی میں باندھنے کو ڈورا بھی نہیں دیتے۔ تم اپنے کپڑے لاؤ پہنا کر لیجاؤ۔ ابھی چونکہ بچپن ہے اس وجہ سے لڑکی نہایت ہٹ ہٹھست ہے اگر آپ کے یہاں کسی کو مار بیٹھیں تو بُرا نہ مانیں۔ کریمن نے عرض کی میں ان تمام باتوں کو جا کر کہے دیتی ہوں۔ جیسا جواب وہ دیں گے حضور سے آ کر عرض کر دوں گی۔ لیکن حضور مہر کیا ہوگا؟ الف خاں نے فرمایا کہ صرف پچیس لاکھ روپے سے ایک چھدام کم نہ ہوگا۔ اگر یہ تمام شرطیں اُن کو منظور ہیں تو خیر ورنہ ما نخیر وشما بسلامت۔ کریمن یہ سن کر سلام کر کے چاہتی ہے کہ جائے۔ الف خاں نے کہا کہ میں کلیا میں گڑ پھوڑ نا نہیں چاہتا یہ تصویر لیجاؤ اور اُن کو دکھا کر یہ کہہ دو کہ آپ کی سو دفعہ خوشی ہو تو شادی کریں۔ کریمن یہ تصویر لے کر روانہ ہوئی اور خلیل خاں کے پاس آ کر یہ شرطیں بیان کیں۔ خلیل خاں صاحب نے یہ شرطیں سن کر کہا کہ نابی کریمن نا۔ یہ شرطیں بہت کڑی ہیں۔ اول تو مہر شاید بادشاہوں کا بھی اتنا نہ ہوگا۔ دوسرے پاندان کے دو ہزار جو مہینے کے مہینے دینے رنگ لائیں گے اس پر بیس لونڈیاں کہ ایک طوفان گھر میں آ جائے گا۔ خیر بد مزاجی اور لینا دینا دیکھا جائے گا اور میں ہوں تو جوان لیکن وہ مار بیٹھیں کسی دن تو میں نازک مزاج آدمی نہیں۔ بی کریمن نہیں مجھے کسی طرح منظور نہیں۔ کریمن نے عرض کی کہ حضور مالک ہیں۔ کسی اور جگہ شادی ٹھہرا دیتی ہوں۔ لیکن الف خاں صاحب نے یہ تصویر دی ہے۔ حضور دیکھ تو لیں کہ میں سچ عرض کرتی تھی یا جھوٹ۔ خلیل خاں صاحب نے کہا کہ میں دیکھوں۔ کریمن نے دوپٹہ کا آنچل کاندھے سے اُتارا اور چھوٹا سا

چوکھٹہ جس پر سنہری بیل نہایت آبدار بنی ہوئی تھی پیش کیا۔ خلیل خاں نے چنو داروغہ کو آواز دے کر کہا کہ ہماری خوردبین لاؤ۔ چنانچہ چنو نے خوردبین لا کر پیش کی۔ خلیل خاں نے ایک ہاتھ میں تصویر اور دوسرے ہاتھ میں شیشہ لے کر گھٹا بڑھا کر محل نظر درست کیا۔ بس اب کیا تھا۔ مصرع:

وہ نظر تھی کہ جی کی آفت تھی

خلیل خاں نے دیکھا گورا رنگ اور اُس میں جوانی کی سُرخی رسیلی آنکھیں پیشانی سے نور ٹپکتا ہے۔ کتابی نقشہ ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، صراحی دار گردن، ایک ہاتھ میں تازیانہ چتون پر غضب، ایک لونڈی ہاتھ باندھے سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ اُس پر تازیانہ اُٹھا رکھا ہے۔ خلیل خاں صاحب نے جو تصویر کو دیکھا تو خود نقش دیوار بن گئے۔ بیساختہ زبان سے نکلا۔ سبحان اللہ کیا صورت اللہ نے عنایت کی ہے (کریمن نے دل میں کہا پڑا اتا گدھا پھنسا) خلیل خاں نے کہا بی کریمن لو دیکھو اس وقت مزاج میں غصہ ہے۔ طبیعت بگڑی ہوئی ہے لیکن وہ بگاڑ بھی لاکھ لاکھ بناؤ دے رہا ہے۔ سچ ہے کہ خوب صورتی عجیب دولت ہے کہ ہر ادا اُس کی خوب صورت ہوتی ہے۔ کریمن بولی کہ ابھی حضور نے صاحب تصویر کو نہیں دیکھا۔ میں دیکھ چکی ہوں۔ یہ تصویر دولہن کی صورت کے آگے خاک ہے۔ خلیل خاں نے کریمن سے کہا کہ بی اب تو دل نہیں مانتا۔ تم جس طرح ہو سکے الف خاں صاحب کو راضی کرو اور مہر اور پاندان سے جو رقم ٹوٹ سکے توڑو اور الف خاں نہ مانیں تو خیر۔ مہر کون دیتا کون لیتا ہے اور پاندانی کا جو خرچ ہوگا وہی ہوگا۔ لونڈیوں کو بیچ ڈالیں گے ورنہ دمڑی میں کام ہو جائے گا۔ کریمن بولی حضور وہ دمڑی کیا قارون کا خزانہ ہوگی۔ خلیل خاں بولے تم سمجھیں نہیں خیر سمجھا دیں گے۔ اچھا اب تم سنو جب میں اُن کے تمام حقوق کو مدِ نظر رکھ کر ہر طرح سے آرام دوں گا تو وہ اپنے آرام کے واسطے میری خود حفاظت کریں گی اور مجھے راضی رکھیں گی۔ وہ دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ کریمن نے عرض کی حضور میں پھر جاتی ہوں اور کہہ سن کر راضی کرتی ہوں۔ خلیل خاں بولے تم جاؤ اور خدا کے واسطے راضی کرو۔ اگر راضی ہو جائیں گے تو کل نہیں تو پرسوں وداع کرا لائیں گے۔ کریمن نے کہا کہ وداع کر کے لانا کیا منہ کا نوالہ ہے۔ حضور تو ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں اُن کی لاڈلی بچی ہے پہلے منگنی کی رسم ادا ہوگی پھر مائیوں بٹھائیں گے کہ کنوار تیل اُترے۔ پھر مہندی سانچق پھر بعد نکاح اور اس کے بعد وداع چوتھی چالے۔ یہ سب کچھ ہوگا آپ تو گھبرائے جاتے ہیں۔ خلیل خاں نے کہا کہ میں گھبراتا نہیں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے وداع کر دیں پھر سانچق چالے ہوتے رہیں گے۔ یہ رسمیں فضول ہیں ہاں عورتوں کا سمجھانا ایک امر دشوار ہے کہ اُن کی سمجھ میں جو کچھ آتا ہے وہ نہیں نکلتا۔ کریمن نے کہا کہ حضور تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں کہ وداع پہلے نکاح بعد۔ خلیل خاں نے کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ بے نکاح ہاں نکاح چپ چپاتے ہو جائے اور وہ گھر میں آ جائیں کہ اپنی شادی کا بندوبست وہ اپنے ہاتھ سے کریں۔ لینا دینا رکھنا ڈھکنا

مہمانوں کی آؤ بھگت وہی کریں گی۔ اور میرے ہاں ایسا ہمدرد کون بیٹھا ہے اور کسی کو کیا پروا کہ میرے پیسے کو درد اور سلیقہ سے صرف کرے گا۔ کریمن نے کہا کہ تو حضور میں جاتی ہوں اور الف خاں کو راضی کر کے کوئی تاریخ ٹھہراتی ہوں۔ خلیل خاں نے کہا کہ اچھا بسم اللہ کرو جاؤ۔ کریمن روانہ ہوئی اور الف خاں کے مکان پر پہنچی۔ اُس وقت صبح کا وقت ہے۔ الف خاں زنانہ مکان میں بیٹھے ہیں۔ سردی پڑ رہی ہے دالان کے پردے چھوٹے ہوئے ہیں۔ الف خاں کے آگے بڑی سینی میں روسی پیتل کا بڑا سماوار رکھا ہے جس کی جالی سے سُلگتے ہوئے کوئلوں کی سُرخی چھن رہی ہے اور پانی میں جو اچھی طرح اُبال آ گیا ہے تو بھاپ کسی کسی جگہ سے زور کر کر کے کبھی کبھی ڈھکنے میں سے نکل رہی ہے اور ایک بڑی کشتی میں سوئی جسے چاء دانی کہتے ہیں پچی سرخ غلاف جس پر شکر پارہ کا غلاف ڈھکا ہوا۔ دودھ دانی میں دودھ بھرا طشتریوں معہ چینی کی پیالیاں نہایت خوب صورت نقش و نگار کی منجھی دھولیں نظر فریب رکھیں۔ شکر دانی قند روسی بھرا چمچے چاندی کے۔ دوسری کشتی میں حلوا سوہن۔ گاجر کا حلوا جس پر چاندی کا ورق لگا ہوائی پستوں کی چھڑکی انگور سیب انار ولایتی بسکٹ رکھے۔ بچے کوئی مدرسہ کی کتاب لیے دیکھ رہا ہے۔ چھوٹے بچے کوئی بچہ ایک میوہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر الف خاں سے کہہ رہا ہے آبا اُوں۔ عورتیں کوئی اخبار لیے دیکھ رہی ہے۔ کوئی کتاب لیے بیٹھی الف خاں کے بیٹے محمود علی خاں اور مقصود علی خاں اور ان دونوں کی بیویاں الگ الگ بیٹھیں۔ کریمن نے الف خاں کو جھک کر سلام کیا۔ الف خاں نے کریمن کو دیکھ کر خندہ پیشانی کہا۔ آؤ بی کریمن اس وقت یہ کیسی ہوا کا جھونکا آیا جو آپ کو یہاں لے آیا۔ کریمن نے عرض کی حضور زمانے کی سرد مہریوں سے اب تو جب خیال آتا ہے دل کانپ جاتا ہے۔ بچے تو خیر بچے ہی ہیں اے بڈھے بڈھے سر پر سفید برف سے بال اور ایسے افعال بس حضور بس قرب قیامت ہے۔ الف خاں نے کہا کہ خیر تمھیں زمانے کی کیا پڑی وہ اپنی اپنی آپ بھریں گے۔ سردی میں آئی ہو لو گرم گرم چاء پیو جو گرما جاؤ۔ الف خاں نے پیالی چاء کی دے کر کہا اس وقت کہاں سے آنا ہوا۔ کریمن نے عرض کی حضور وہیں سے الف خاں نے کہا کہ کیوں آج کل لڑکے کا مزاج کیسا ہے۔ کریمن نے کہا حضور آج کل نگوڑی سردی نے ناک میں دم کر دیا ہے اور اُن کو زکام برسوں سے ہے جاتا ہی نہیں اور کھانسی تو ایسی لگی ہے کہ تمام محلے والے تمام رات ٹھوں ٹھوں کی آواز سے سخت پریشان ہیں اور یوں تو رعشہ برسوں سے ہے۔ آج کل بہت ہے (بڈھے کا رعشہ اور جوان کو دق اگر عمر تیس برس سے کم ہے تو نہیں جاتی) چار روز سے سینے میں درد ہے کہ کسی پہلو، کسی کروٹ آرام نہیں، جب کھانسی اُٹھتی ہے تو سینے کے درد سے تڑپ جاتے ہیں۔ گردہ کا درد تو جان کے ساتھ ہی ہو گیا ہے۔ الف خاں نے کہا کہ پھر علاج کس کا ہے۔ کریمن بولی علاج سے تو سخت نفرت ہے آج کل کے نوخیز لڑکے نسخے کس کی ہیں۔ ویسا ہی خمیازہ اُٹھاتے ہیں۔ ہاں اب محلے میں ایک بڑھئی رہتا ہے چرخو نام (کا) وہ علاج کرتا ہے اُس نے کہا ہے کہ میں چار روز میں سارے مریضوں کو گھڑے کے بدن کا ڈول نکال دوں گا

وہ کوئی دوا شیشم کے برادہ میں بھوں کے گا۔ اُس نے آٹھ سو من شیشم کا خشک برادہ مانگا ہے۔ سو میاں خلیل خاں بن خریدنے کو کہہ رہے ہیں۔ اب سرکار کیا ارشاد ہوتا ہے کہ اس معاملے میں مجھے کیا جواب عنایت ہوتا ہے۔ الف خاں نے کہا مجھے منظور ہے۔ لیکن ہماری شرطیں۔ کریمن نے عرض کی کہ حضور وہ اپنی ذات کے واسطے تیز ہی سہی۔ لیکن معاملات ایسے سیدھے کہ کسی بات میں عذر نہیں کیا۔ الف خاں نے کہا۔ بس تو اُن سے کہو کہ ہمارے کنبے والے خاں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر کر کے مجھے اطلاع دو۔ کریمن بولی حضور تاریخ کیا اُن کو تو جلدی ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہو جلدی ہو۔ حضور فرمائیں تو آج ہی اُنھیں لے آؤں۔ الف خاں نے فرمایا کہ اچھا آج شام کو آٹھ نو بجے وہ آ جائیں۔ کریمن چاہ پی کر خلیل خاں کے پاس آئی اور کہا کہ الف خاں آپ کو آج آٹھ نو بجے شام کو بر دکھوا بلایا ہے۔ خلیل خاں نے کہا کہ بس یہی بات میری مرضی کے خلاف ہے۔ خیر قہر درویش بجان درویش۔ اچھا تم کب کے واسطے کہہ آئی ہو۔ کریمن بولی کہ واہ حضور واہ بندگی ایسی ہو اور اُس کا انعام ایسا ہو۔ اے حضور کو جلدی ہے میں تو شام کو آج ہی کہہ آئی ہوں۔ خلیل خاں بولے کہ بی تم بھی ساتھ ہی چلنا۔ شام کو سویرے سے کھانا اپنے گھر سے کھا آنا۔ اور پان آج میرے یہاں کم آئے ہیں تم دو تین ٹکڑے زیادہ ہوا لانا شاید ضرورت پڑے۔ کریمن یہ سن کر بہت دل میں جلی اور بڑبڑاتی ہوئی اپنے گھر گئی۔ اور خلیل خاں نے پچو داروغہ کو آواز دے کر کہا۔ داروغہ جی خضاب جلد تیار کرو اور اُس میں کچھ اجوائن ڈال دینا کہ آج بہت سردی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تیل کی سردی نقصان کرے اور وہ مٹیلے اور تھپ وال او بلے جن کو بیکار سمجھ کر تم نے باورچی خانے میں نہیں ڈالے۔ میری چوکی کے گرد سلگا دو کہ گرم رہوں اور میرا افاختی چغہ جو ہمارے پردادا کے والد کا تبرک ہے نکال دو اور گلنار پاجامہ ریشمی اور کالا انگرکھا زر بفتی اور کمربند لاہوری زرد اور کمر پٹکا گلابی۔ کرتہ کوسیلا پھٹا ہوا ہے نیچے پڑا رہے گا کون دیکھتا ہے۔ میں نیفے میں اُڑس لوں گا اور وہ جوتا جس پر اُوگی جوانی میں ہوائی تھی گو پرانی ہو گئی ہے لیکن ہائے ایسے کاریگر اب کہاں ہیں۔ اور قرمزی گاچ کی ٹوپی جس پر پتلی دوہری لیس ہے اور گھوڑے کا ساز ملمع والا نکالو اور سائیسوں سے کہو کہ گاڑی دھوئیں اور ہاں ایک پٹی بالشت بھر چوڑی چھ سات گز لمبی سستی نہیں سکھ کی یہ سارا سامان تیار کر دو اور ہماری جھولے والی کرسی منگل سائیس کو حکم دو کہ ہماری سسرال یعنی الف خاں صاحب کے مکان پر پہلے سے پہنچ جائے۔ پچو داروغہ نے کہا کہ خداوند یہ سب سامان تو ہو گا لیکن پٹی اور کرسی کیا ہو گی۔ خلیل خاں نے غصے سے کہا کہ تم کون جو دخل در معقولات ہوتے ہو۔ جاؤ نہ پوچھو جو چاہا بک دیا۔ جو منہ میں آیا بے دھڑک کہہ دیا۔ آدمی یہ تو سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ تم نے ٹوک کر ہزاروں وہم ڈلوا دیے۔ پچو اپنا سا منہ لے کر چپکا ہو گیا اور جو جو حکم خلیل خاں صاحب نے دیے تھے اُس کی تعمیل کر دی اور الف خاں نے مکان کو درست کرایا اور زنانہ مکان میں کہلا بھجوایا کہ آج شام کو پردہ کا بندوبست کر لینا اور تم سب برابر والے مکان میں چلے جانا۔ اتفاقاً الف خاں کے ایک

دوست جو شہر کے تھانہ دار ہیں یہ مردانے مکان میں بیٹھے الف خاں صاحب سے باتیں کر رہے تھے یہ سن کر تھانہ دار صاحب نے الف خاں سے دریافت کیا کہ کیا جناب نے کہیں صاحبزادی کی شادی کہاں قرار دی۔ الف خاں نے کہا جناب ابھی تو کہیں نہیں تھانہ دار صاحب نے متعجب ہو کر کہا کہ یہ پھر کس کی شادی کا اہتمام ہے۔ الف خاں نے جواب دیا کہ شادی کیسی یہ ایک مذاق ہے۔ تھانہ دار صاحب بولے یہ کیسا مذاق ہے اور کیا ہے۔ الف خاں نے کہا کہ آپ نے خلیل خاں مسخرے کی حرکت سُنی۔ نوے برس کا سن۔ مرنے کے دن گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ رنڈی گھر میں اور مجھ سے اور میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں اور میرے یہاں آپ نے پیغام بھیجا ہے۔ ماشوگلقند نے یہ نہ سوچا کہ میں کہاں پیغام بھیجتا ہوں انجام کیا ہوگا۔ انسان کو مناسب ہے کہ جب چالیس سال سے عمر بڑھ جائے تو کنواری لڑکی سے شادی مناسب نہیں۔ جب آپ اس شادی کے حال سے واقف ہوں گے تو تمام عمر ہنسی آئے گی۔ آپ آج شام کو غریب خانہ پر ضرور تشریف لائیں اور دو چار دوستوں کو بھی ہمراہ لائیں۔ تھانہ دار صاحب نے کہا کہ جناب میں ضرور حاضر ہوں گا اور کوتوال صاحب کو بھی ہمراہ لاؤں گا لیکن کس وقت حاضر ہوں۔ الف خاں نے کہا رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے۔

اور یہاں میاں خلیل نے پردے دالان کے چھڑوا جھپ اس اوپلے لعیچے گردسلگانے حکم دیا حجام نے خضاب گرم کیا اور بڑا اٹھا ہوا نیلا گلو بند دوہرا گلے میں خلیل خاں نے باندھا حفو کرنے ایک آئینہ بے چوکھٹے کا جس کا ایک سرا ٹوٹ کر تکونا رہ گیا ہے اور قلعی جگہ جگہ سے اڑ گئی ہے تو خلیل خاں آئینہ کو بندر کی طرح ایک آنکھ کے سبب سے آڑا سیدھا کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ رجو نے وہ آئینہ خلیل خاں کے ہاتھ میں دے دیا۔ حجام نے منگیا سنگیا کر لگانا شروع کیا۔ خلیل خاں نے کہا کہ دیکھو کوئی بال باقی نہ رہے۔ غرض تمام دن خلیل خاں اسی دھندے میں رہے شام کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر لباس پہنا اور داروغہ کو آواز دی وہ بیچاری وہ تین جھنی بچھیٹ لیتا۔ داروغہ نے جھنی لا کر حاضر کی۔ خلیل خاں نے داہنے پاؤں کے ٹخنے سے چڑے تک چست لپیٹ اور حکم دیا کہ منگل سے کہو کہ کرسی لے کر چلا جائے اور کوچوان کو حکم دو کہ گھوڑوں پہ ساز ڈلوائے اور رجو اور انچھو دونوں خدمت گار الف خاں کے مکان پر پہنچیں۔ چنانچہ داروغہ نے ایسا ہی کیا۔ خلیل خاں گاڑی میں سوار ہوئے اور کرسی گاڑی کے پیچھے بیٹھ گئی۔ یہاں الف خاں کے دیوان خانے میں چند ان کے معقول اور معزز دوست بیٹھے ہیں اور کوتوال صاحب ان کے علاوہ دو تین تھانہ دار بھی آ گئے ہیں کہ اس عرصے میں ایک خدمت گزار نے آ کر اطلاع دی کہ جناب خلیل خاں صاحب کے ہاں سے ایک سائیس ایک آرام کرسی پرانی لایا ہے، باہر کھڑا ہے۔ ہم نے اُس سے ہر چند کہا کہ اندر چل لیکن وہ گلی میں کھڑا ہے اور کہتا ہے میاں منع کر دیں ہم تو ہیں آوت ہیں۔ الف خاں صاحب نے سن کر تھانے دار صاحب سے کہا ملاحظہ ہو وہ حماقت شروع ہوئی۔ کیا میرے ہاں کرسی نہ تھی جو آپ اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ اس

عرصے میں رجو اور انچھو نے آ کر سلام کیا اور کہا کہ میاں آتے ہیں۔ تھانہ دار صاحب نے انچھو سے پوچھا کہ تمھارے میاں کتنی دیر میں آئیں گے۔ میاں رجو بولے جناب میاں پاخانہ گئے ہیں اگر جلدی نکل آئے تو دو ڈھائی گھنٹے میں اور نہیں تو صبح سے شام وہیں کرتے ہیں۔ اکثر کھانا بھی وہیں کھالیتے ہیں۔ انچھو نے کہا نہیں میاں کھانا دوسرے تیسرے کھاتے ہیں۔ ہاں چاہ کی کہو کہ وہ تو دونوں وقت کی وہیں پیتے ہیں۔ ایک خوش طبع نے کہا کہ بھائی تم اتنی گرم چاہ کیوں دیتے ہو کہ بیچارہ کو پھونکنی پڑتی ہے۔ اس عرصے میں بگھی کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور دروازہ پر رُکی اِدھر خلیل خاں نے رجو اور انچھو کو آواز دی۔ یہ دونوں پہنچے تو خلیل خاں نے منگل کو اشارہ کیا کہ کرسی لاؤ اور رجو سے کہا کہ مجھے گود میں لے کر کرسی پر بٹھا دو۔ رجو نے بگھی سے اُتار کر کرسی پر بٹھایا۔ خلیل خاں نے اپنا بندھا ہوا پاؤں پھیلا دیا اور منہ کو رومال سے ایسا چھپایا کہ صرف ایک آنکھ داہنی نظر آتی ہے۔ دونوں سائیس اور دونوں خدمت گار کرسی اُٹھائے اندر آئے الف خاں نے دیکھا کہ آپ تھیجا جھولی بنے ہوئے چلے آتے ہیں۔ الف خاں کو ہنسی تو آئی مگر ضبط کر کے آواز دی کہ لڑکے کی کرسی مسند کے قریب لے آؤ۔ چنانچہ کرسی مسند کے قریب لاکر رکھی۔ خلیل خاں نے رجو سے کہا کہ مجھے کرسی سے اُتار کر مسند پر بٹھا دو۔ غرض رجو نے خلیل خاں کو مسند پر بٹھایا اب خلیل خاں ایسے شرم سے جھک کر بیٹھے کہ سر زمین سے کبھی سجدۂ شکر کی نقل اُتارتا ہے اور کبھی یوں ہی سا اُٹھ جاتا ہے۔ الف خاں صاحب بولے کہ دیکھو شرافت ایسا جوہر ہے کہ اپنی جھلک نہیں چھوڑتا۔ میاں صاحبزادے ایسی بھی شرم کیا ہے ذرا تو سر اُٹھاؤ اور تھانہ دار صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ صاحبزادہ ابھی نو عمر ہیں لیکن خاندانی بوجھ سر نہیں اُٹھانے دیتا۔ پچو خلیل خاں کی پس پشت کھڑا ہوا رومال جھل رہا تھا اُس نے جواب دیا کہ ہمارے میاں کو ایسی شرم ہے کہ کبھی دونوں آنکھیں ملا کر دیکھتے ہی نہیں اور اگر دیکھتے بھی ہیں تو ایک ہی آنکھ سے۔ شرم سارے جہان کی ہمارے ہی میاں کے حصے میں آئی ہے۔ شام سے صبح اور صبح سے شام اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ کسی کسی وقت جھک کر اس سے بھی زیادہ بیٹھے رہتے ہیں کہ زمین میں چار چھ انگل گڑھا پڑ گیا ہے اور فرش بھی گھس گیا ہے۔ کوتوال صاحب نے کہا کہ آپ اگلے زمانے کے ہیں اُس وقت بھلے مانس شریف ایسا ہی لحاظ کرتے تھے۔ خلیل خاں صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں فرمایا کہ بڑھاپے کا راز کھُلے گا۔ ایک ہاتھ سے تو منہ چھپائے رہے اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر ہاتھ سے کہا کہ نہیں میں اگلے زمانے کا نہیں ہوں بلکہ اسی وقت کا ہوں۔ کریمن نے ہاتھ باندھ کے عرض کی کہ جناب چوروڈھور سامنے ہیں جو جو شکوک ہوں مٹا لیجیے کل کلاں کو کوئی بات ہو۔ ہاں الف خاں نے فرمایا نہیں بی کریمن نہیں ہم کو کچھ شک اور شبہ نہیں اب ہم عقد کی تاریخ مقرر کر کے اطلاع دیں گے۔ خلیل خاں کو تاب کہاں تھی۔ رجو کا پاؤں ہاتھ سے دبا کر اشارہ کیا کہ سُن۔ رجو نے اپنا سر زمین پر رکھ کر اپنا کان خلیل خاں کے منہ سے ملا دیا۔ خلیل خاں نے ذرا اُبھر کر رجو سے کہا کہ کہو اطلاع دینی کیسی آج ہی سہی۔ یہ کہتے تھے کہ رال منہ میں دم

سے تیع تھی مسند پر اس طرح سے اُگلی جیسے مرغی کچا انڈا دے۔ خلیل خاں اس حرکت کو رفع کرنے کو کھنکارنے ہی تھے کہ کھانسی اُٹھی اور کھانسی کے ہر جھٹکے کے ساتھ سر زور زور سے زمین سے ٹکرانا شروع ہوا۔ کوتوال صاحب نے بڑھ کر تکیہ سر کے نیچے رکھ دیا اور کہا کہ بچپن کی ناتجربہ کاری خدا جانے کیا کیا الا بلا کھا لیتے ہوں گے جو کھانسی تپ دق کی بیخ ہے روگ کا گھر کھانسی۔ جب دیر تک کھانسی نہ رکی تو الف خاں نے کہا صاحبزادے صاحب اپنا علاج نہیں کرتے۔ چھنو بولا کہ جناب ایک علاج ہو تو اُس کا ذکر کیا جائے۔ طبیب، ڈاکٹر، وید، فقیر اور جوتشی بھی کسی نے کوئی سب ہی کچھ کیا۔ مجھے تو چالیس برس کا عرصہ گزرا۔ میں تو رات دن یہی مصیبت دیکھتا ہوں اور میری نوکری سے پہلے والد مرحوم فرماتے تھے کہ مجھے تیس برس ہوئے کہ برابر کھانسی دیکھتا چلا آیا ہوں۔ خلیل خاں نے غصے سے چھنو کی طرف دیکھا کہ چھنو ڈر گیا اور کہا جناب میں بھولا۔ یہ میاں کا ذکر نہیں ہے۔ ہمارے میاں کو تو جس روز سے مینہ برسا ہے اُس روز سے برابر کھانسی ہے۔ الف خاں نے کہا مینہ تو پرسوں برسا تھا۔ چھنو نے کہا جی ہاں لیکن پرسوں کی کھانسی برسوں کی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ ایسی جھوجل ہے کہ میاں گھنٹوں تڑپتے ہیں لیکن کم بخت جانے کا نام نہیں لیتی۔ اس عرصے میں ایک عورت نے آواز دی کہ لڑکے کو اندر بھیجو۔ الف خاں نے کہا کہ پردہ کرا دو۔ اُس عورت نے کہا کہ پردہ ہے۔ خلیل خاں کو جو شدت سے کھانسی اُٹھی تو جہاں آپ بیٹھے تھے وہاں سے مسند بھیگ گئی۔ رجو نے قریب آ کر چاہا کہ خلیل خاں کو اُٹھائے لیکن خلیل خاں نے منع کیا اور چھنو داروغہ کو اشارے سے قریب بلایا اور کان میں کہا کہ جب میں اُٹھوں تو تُو میری جگہ بیٹھ جائیو مگر پہلے مجھ کو پانی پلا دے۔ چھنو نے آواز دی آب رساں لاؤ۔ انچھو جو جست کی صراحی ساتھ لایا تھا اُس میں سے پانی گلاس میں بھر کر خلیل خاں کو دیا۔ خلیل خاں کا اتنا ہاتھ کانپا کہ گلاس ہاتھ سے گر گیا۔ چھنو نے جو جھپٹ کر چاہا کہ پانی مسند سے گلاس میں اُٹھا لے۔ اتفاق سے مراد آبادی اُگال دان جو صرف نجیبوں کا محتاج ہوتا ہے کچھ تو خلیل خاں کا بلغم کچھ پانوں کی پیک سے بھرا ہوا تھا وہ اوندھ گیا کہ خلیل خاں کا چغہ، انگرکھا، پاجامہ سب پیک اور تھوک اور بلغم میں شور بور ہو گئے۔ الف خاں نے کہا کہ گھبراؤ نہیں کیا مضائقہ ہے گر گیا گر گیا۔ ایک صاحب نے مسکرا کر یہ تو آپ کے تمغے بھی ہے۔ دوسرے صاحب بولے وہ تو میاں، چوتڑ سب لتھ پتھ ہیں۔ تیسرے صاحب نے فرمایا کہ یہ کمبخت کھانسی ایسی اژدنگی اور وحشی بیماری ہے کہ اس کے صدمے سے جوان ہو تو بڈھا نظر آتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں تھرتھری پڑ جاتی ہے اور گھٹنوں رعشہ رہتا ہے اور اکثر بچوں کا پیشاب نکل جاتا ہے۔ یہ تو ماشاءاللہ ایسے ہی طاقت دار ہیں جو اتنی دیر روکا ورنہ بچوں کا پائجامہ خراب ہو ہی جاتا ہے۔ خیر کچھ ہرج نہیں دُھل جائے گا۔ انچھو نے کہا میاں کو رعشہ تو بہت برسوں سے ہے کھانسی بیچاری کا نام ناحق بدنام ہے۔ میں نے تو اکثر دیکھا ہے کہ موت زبان سے نکلا تھا کر دیتے کہنے کو تھا کہ خلیل خاں نے اُس کو اشارے سے کہا چپ رہ۔ الف خاں نے فرمایا کہ میاں کے کپڑے اُتار کر دھلوا لو کیوں کہ سردی کا موسم ہے ایسا نہ ہو کہ

شوربیت اور سیل سے داد پیدا ہو جائیں کیوں کہ آپ نہایت نازک مزاج ہیں۔ خلیل خاں نے اس کا جواب گردن ہلا کر انھیں دیا۔ کوتوال صاحب بولے کہ سیلابچی لا کر دامن اور ذرا اونچا کر کے چوتڑ وغیرہ دھولا دو ورنہ جہاں آپ بیٹھیں گے داغ پڑے گا۔

الغرض الف خاں کے آدمی سیلابچی لائے اور آفتابے سے چغے اور انگرکھے کے دامنوں کو دھویا۔ پاجامے کو میلے چیتھڑے سے پوچھا۔ ادھر تو دامن تر دوسرے انگرکھا، چغہ اور پاجامہ نیچے سے تر ہو گیا ہے۔ سردی کا وقت خلیل خاں کے بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ دانت تو تھے ہی نہیں جو دانت سے دانت بجتا۔ ان کے منہ سے بے ساختہ یہ یہ یہ جلدی جلدی نکلنا شروع ہوا۔ غرض رجو نے کولی میں خلیل خاں کو لیا اور انچھو نے بندھی ہوئی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں پر رکھا۔ چنو نے بغلوں میں ہاتھ دیے اب جو لے کر چلے تو پاجامہ اور انگرکھے کے دامنوں کا رنگ پیشاب کی شوربیت سے کٹ کر بدرنگ، بوندیں فرش پر ٹپکتی ہوئی چلیں۔ ایک عورت نے دروازے کا پردہ اٹھایا۔ خلیل خاں اس شان سے اندر داخل ہوئے عورتوں نے جو دولھا کی یہ گت دیکھی کہ مصرع:

پا بہ دست دگر دست بدست دیگرے

تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ رجو نے جو کولی میں لیا تھا تو آپ کی میلی پرانی جھانجی گاج کی ٹوپی بھوں پر آتی آئی کہ ایک آنکھ ڈھنک گئی اور اسی آنکھ سے دکھائی دیتا تھا۔ خلیل خان نے کہا ابے اندھو آنکھ تو کھولو۔ چنو نے کہا تم سب کے سب اندھا دھند کام کرتے ہو یہ نہیں سجھائی دیا کہ چوندا بگو میاں کے ہر وقت کام کی تھی بقول شخصے:

پھوٹی آنکھ کا ایک ہی دیدہ
اسی پر گھٹا ٹوپ ڈال دیا

چنو نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن دل میں خیال آیا میاں بُرا نہ مانیں پھر یہ سوچا کہ ہنسی بات میں کیا بگڑیں گے اب چاروں ملازم الگ الگ رفتار سے چل رہے ہیں تو خلیل خاں جھٹکے کھاتے جھنجھولی ہوتے گھر میں داخل ہوئے اور صحن چبوترہ پر چڑھتے ہوئے رجو نے ٹھوکر کھائی بھو تیرا سنبھالا لیکن نہ سنبھلا گیا آخر چبوترے پر آ کر گرا نیچے خلیل خاں اور اوپر نوکر۔ دھڈی میں خلیل خاں کی ایسی چوٹ لگی کہ سانس رُک گیا اور بیساختہ پوپلے منہ سے نکلا۔ ابے ابے مر گیا، مر گیا، مر گیا۔ ہائے مار ڈالا۔ وہ عورتیں جو بازاری خانگیاں اور آوارہ الف خاں صاحب نے صرف دولھا کی آؤ بھگت کے لیے بلائی تھیں وہ گرد جمع ہو گئیں۔ ایک بولی ارے بڑے میاں کو لگ جائے آگ گرا دیا ہے۔ اس گوڑی سردی میں کیسی چوٹ لگی ہو گی چوتڑ تو پھٹ گئے ہوں گے۔ دوسری نے کہا اری اندھی سیڑھی کی جگہ گھسی ہے۔ تیسری بولی لہو نکل آیا ہو گا تیرے لگتی تو جگہ سے پھٹ جاتی وہ تو ایسے ہی بڑے بوڑھے ہیں جو پی

کر چپکے رہ گئے۔ ایک بولی اری کرمو دیکھ تو سہی دولھا میاں میں کیسی شرم ہے کہ سر نہیں اُٹھاتے۔ ایک نے کہا خالہ، ادھر دیکھ دولھا میاں کی کیسی بھولی صورت ہے پچپنا برستا ہے۔ یہ کس نے کہا تھا کہ خلیل خاں بڈھے اور کانڑے ہیں۔ ان کے تو دونو دیدے چشم بٹیھے کی طرح پڑ پڑ کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں خلیل خاں کو پھر کھانسی اُٹھی کہ پیشاب کر دیا اور ادھر پیشاب پھر دوبارہ کچھ نکلا اور پاجامے سے ابھی ٹپکنا بند اچھی طرح سے نہیں ہوا تھا کہ پھر تلتلی بندھی اور کھانسی کم بخت اس شدت سے اُٹھی چوتڑوں کو سہارا نہیں ادھر لٹک رہے ہیں اس وجہ سے کھانسی کی ہر کھر بُر بُر کا جواب ملنا شروع ہوا، رجو نے آواز روکنے کو جلدی سے ہتھیلی لگائی۔ اِدھر ٹپکتا ہوا پاجامہ اُدھر ہتھیلی روک۔ پیشاب ہتھیلی کے دباؤ سے چوتڑوں کی جھرّیوں سے دب دب کر دفعۃً دفعۃً جس میں پاجامہ کا رنگ کٹ کر ملا ہوا تھا، جھٹکوں کے ساتھ چاروں طرف پچکاریوں کی صورت اُڑنے لگا۔ ایک عورت بیوہ سفید ڈوپٹہ اوڑھے قریب کھڑی تھی اُس کے ڈوپٹے پر افشاں ہونے لگی۔ اس بیچاری نے ڈوپٹے کا آنچل ہاتھ میں لے کر کہا لگ جائے آگ میرا تو نمازی دوپٹہ خراب ہو گیا۔ کریمن نے تھوڑی دیر تو راہ دیکھی کہ اب بھی کھانسی رُکے لیکن یہ کم بخت کب رُکتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر رجو سے کہا کہ میاں کو قدیم ذرا نہ اُٹھا آئے اور کپڑے گندے نہ ہو جائیں کیوں کہ کھانسی شدت سے اُٹھ رہی ہے۔ رجو نے خلیل بنانی کو کھانستے ہوئے گود میں لیا اور باہر آ کر گاڑی میں سوار کرایا۔ خلیل خاں گھر آئے، گاڑی سے اُترے۔ خدمت گزاروں کے کاندھے پر ہاتھ رکھے مسند کے قریب آئے۔ بیٹھے جب سانس قائم ہوا تو چھٹو داروغہ کو بلا کر کہا۔ کیوں میاں یہ آپ سے کس نے پوچھا تھا جو آپ نے یہ فرمایا کہ میں چالیس برس کا ملازم ہوں اور میاں کو تیس برس پہلے سے کھانسی ہے۔ چھٹو نے جواب دیا کہ حضور میں نے تو یہ خیال کیا تھا کہ میں اس سرکار میں اتنے دنوں کا ملازم ہوں اور گھر میں ایک نہ ایک کو کھانسی ہے۔ خلیل خاں نے کہا کھانسی کا بچہ۔ بیچارہ چھٹو تو پیچھا چھڑوا کر کھسکا اور خلیل خاں نے رجو سے مخاطب ہو کر کہا۔ کیوں جی میاں رجو صاحب ذرا آپ یہاں تو کرم فرمائیں۔ کیا میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ عام موقعوں میں میرا کچا چٹھا بیان کریں اور کپڑے گندہ کوئی ہر وقت تو کھانسی سے میرا دست نکلتا ہی نہیں۔ صرف دس بارہ دفعہ دن کو اور بیس پچیس مرتبہ رات کو سو وہ بھی بوجہ نزاکت مزاج ایسا ہوتا ہے کوئی ہر وقت تو میں ایسا نہیں کرتا۔ رجو نے عرض کی کہ حضور میں نے کوئی غلطی تو کی ہی نہیں منہ سے نکل گیا خیر یہ قصور تو سرکار میرا معاف فرمائیں۔ آئندہ ایسا کروں تو حضور کو اختیار ہے جو جی چاہے کریں۔ اب کریمن سے کہا واہ بی واہ۔ آپ میری بڑی ہمدرد نکلیں جو آپ نے دورے کا حال کہا۔ خیر ذرا میری کھانسی کا حال کھل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ میاں کھانستے میں موت دیتے ہیں تو پھر تم سب ہو اور میں۔ اب تم سب ایکا کر کے جو چاہو سو کرو۔ میں بھی اپنے نام کا خلیل خاں ہوں۔ میرا خدانخواستہ لاکھ روپیہ بھی صرف ہو جائے پروا نہیں پر میں بھی یہیں کروں گا مجھ کو بھی ضد ہے پھر کچھ بھی ہو کریمن نے عرض کی کہ حضور میں ان تمام

باتوں کو اُن کے دل سے بھلا دوں گی۔ آپ اپنی طبیعت پر کچھ ملال نہ لائیں۔ خلیل خاں نے کہا پی کریمن رجو کی طرف اشارہ کر کے آپ بڑے خیر خواہ کہ دوڑ کر ہتھیلی لگائی، جس کی وجہ سے چوگنی آواز بڑھ گئی خیر جو ہوا سو ہوا اب تم سب کان کھول کر سُن لو کہ شادی سے پہلے جو تم سے میری عمر کے متعلق دریافت کرے تو سولہ برس چار مہینہ ایک ہفتہ دو دن بیان کرو۔ غور سے سنو اِس سے کم تو خیر زیادہ ہرگز نہ کہنا اور الف خاں سے جا کر کہو کہ میاں کا مزاج نہایت نازک ہے اِس وجہ سے کچھ زک نہیں سکتا اور نہ طاقت اچھی ہے ہاں نزاکت کی نہ پوچھو۔ اگر کوئی پڑوس میں دس گھر فاصلے سے بھی لیموتراشے تو میاں کو ہزاروں چھینکیں آکر ایسا نزلہ ہوتا ہے کہ پھر جانے کا نام نہیں لیتا۔ ایک دن گرمیوں میں تربوز کا چھلکا گاڑی کے پہیے کے نیچے مرجھایا ہوا سا آ گیا تھا، تیرہ مہینے تک ناک بجتی رہی کہ ناک پونچھتے پونچھتے ناک میں دم آ گیا اور برابر ناک بجتی رہی۔ اس وجہ سے دولھا پالکی میں سوار ہو کر تشریف لائیں گے اور باجا برات کے ساتھ نہ ہوگا۔ باجا تو ایک طرف اگر میاں کے کان کے قریب دس گز کے فاصلے سے بھی مچھر دن کو بھی بولتا ہے تو میاں کو چھ چھ مہینے رات کو نیند حرام ہو جاتی ہے اور سر میں درد رہتا ہے۔ ہاں بعد شادی کے الف خاں کے مکان پر ایک سال رات دن برابر باجا بجوا دوں گا۔ کریمن نے عرض کی بہتر ابھی میں تو یہ پوچھتی ہوں اگر دولھا پالکی میں سوار ہو کر جائے تو الف خاں صاحب کا کیا نقصان ہے اور دولھا ٹٹو پر سوار ہوگا تو کسی کا کیا ہرج ہے۔ کوئی مذہبی تو رسم ہے ہی نہیں میں جا کر کہے دیتی ہوں۔ یہ بات ہی کیا ہے۔ اچھا حضور اب تو یہ ارشاد فرمائیں کہ مبارک باد کا رُقعہ اللہ رکھو کب جائے گا۔ خلیل خاں نے بگڑ کر کہا کہ کل صبح کو اور کب۔ کریمن نے عرض کی کل کس وقت، خلیل خاں بولے صبح ہی کو چار بجے رُقعہ چھ بجے مہندی آٹھ بجے ساچق دو پہر کو برات ایک بجے، نکاح دو بجے، وداع تین بجے، چوتھی چار بجے، ایک چالا، غرض تینوں چالے سات بجے شام تک ہو جائیں تا کہ آٹھ بجے تک ہم آ کر اپنے وقت پر سو رہیں۔ کریمن بولی کہ بہتر۔ خلیل خاں نے کریمن سے کہا کہ اب تو تم اپنے گھر جا کر کھانا کھاؤ اور ساڑھے تین بجے سے پہلے چلی آنا کہ زیور گہنا پھولوں کا جوڑہ مصری کا کوزہ صرف ایک ہوگا۔ بس اسی میں سات ڈلیاں ہو جائیں گی اور مٹھائی میں ساتھ نہ کروں گا کیوں کہ مٹھائی جب گئی آپس میں شکر رنجی ہوئی اور رُقعے کی تھیلی میں جو اشرفیاں ہوں گی وہ تم کو واپس کر دینی ہوں گی کیوں کہ میں تم کو پہلے ہی ایک اشرفی دے چکا ہوں۔ اُس میں آٹھ آنے تمھاری بات ٹھہرانے کے اور ایک آنہ آنے جانے کا اور ایک آنہ خرچ کا اور آدھ آنہ انعام کا اور ایک پیسہ ہماری طرف سے تم کو دیا جاتا ہے۔ غرض یہ پونے گیارہ آنے ہوئے اور باقی انیس روپے سوا پانچ آنے مجھ کو واپس دے دینا۔ کریمن نے جل کر دل میں کہا واہ حضور۔ مصرع:

بندگی ایسی ہو اور اُس کا انعام ایسا ہو

بھر پائے۔ خلیل خاں نے کہا ایک میں ہی تو نہیں دلہن والے بھی تو ہیں اُن سے لو کہ اُن کے گھر سے خرچ کم

ہوا اور مجھ کم بخت کے ہاں تو خرچ بڑھ گیا اور اگر اللہ نے بچے امروز فردا میں ہو وے ہی گا تو تم سمجھو کیا کچھ نہ دوں گا۔ دوسرے ہمیشہ کے واسطے یہ تمہارا گھر ہو گیا۔ آؤ جاؤ، بیٹھو اٹھو، چلی جاؤ میں اپنی وضع کا پورا پابند ہوں۔ حقہ تو پیتا ہی نہیں اور پان آج تک تو کسی کو دیا نہیں۔ میں آج کل کا پنچھی رو لونڈا تو نہیں ہوں۔ گو سن بہت کم ہے لیکن میری تعلیم اعلیٰ درجے کی ہے۔ میں صرف بیاہ کو حرام جانتا ہوں اور دارو غہ بنو سے کہا کہ تم گلاب فروش سے کہہ دو کہ تمام پھولوں کا گہنا سوائے سہرے کے اسی وقت بنا لائے اور وہ جوڑا جس میں سلمہ کا دوپٹہ اور محرم کرتی پاجامہ اسی میل کا ہے اُس کو چاندی کی کشتی میں لگا کر ابھی رکھ دو اور ایک زربفت کی تھیلی میں رُقعہ مبارک باد کا اور ایک سو ایک اشرفیاں کھوٹی جن پر ملمع سونے کا تازہ کرا کر ڈال دو یہ وہاں تو کوئی لے گا نہیں واپس آ جائیں گی اور چنگیر منجھوا ڈالو اور ایک مصری کا قوزہ جو لالہ گھڑی مل ہمارے مسل کے دن لائے تھے اُن میں سے لے لو اور خرچ میں لکھ دو اور سات لچھے پان کے بنوا رکھو لیکن دیکھو پہلے کشتی میں کچھ بچھا لینا کہ وہ ٹوٹی ہوئی ہے دکھائی نہ دے اور ہماری بہن کو بلا دو۔ دارو غہ نے عرض کی حضور کی بہن کون سی۔ خلیل خاں نے کہا کہ بھائی رشتہ کون سا جال تو عورتیں ہی خوب جانتی ہیں۔ ہاں ان بہن کا رشتہ تو خوب مجھے یاد ہے کہ ہمارے والد کے جو سالے تھے اُن کی چچی کی بھاوج کی جو سمدھن تھیں اُن کی پوتی کی سلج کی جو نگی پھوپی کی سالی کی جو بہن تھیں اُن کی دادی کی کنیز بنی میری بہن ہیں تو یہ ایسا دور کا رشتہ نہیں جو نسیان بھول جائے اور باقی محلے والیاں گنا سیا اور گیدو کی پھوپی جو بیلوں کا ٹھیلہ ہانکتے ہیں، لیکن یہ کام میرے سوتے میں انجام پا جائیں کہ یہاں سے چار بجے چل کر سوا چار بجے الف خاں کے مکان پر پہنچ جائیں اور پانچ بجے واپس آ کر ساڑھے پانچ بجے سانچق چلی جائے اور وہاں سے پونے چھ بجے واپس ہو کر میں یہاں تیار رہوں گا۔ چھ پر پانچ منٹ آئیں کہ برات روانہ ہو کر سوا چھ بجے پہنچیں۔ ساڑھے چھ بجے نکاح، پونے سات پر وداع، سوا سات پر چوتھی ساڑھے سات پر ایک چالا پونے آٹھ پر دوسرا چالا، آٹھ پر تیسرا چالا، سوا آٹھ پر چوتھا اور گرمیوں میں دعوت کروں گا جاڑے میں تو ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے ہیں نہ کھانے کا مزا نہ پینے کا اور بی کریمن یہ دینا ہمارا الف خاں سے نکاح ہی تک ہے جب تک ہمارا ہاتھ ٹھٹھرتے ہے اور جب نکاح ہو جائے گا تو تُو کون میں کون۔ اگر محنت کر کے روٹی کھائیں اور مجھے بھی کھلائیں گی تو خیر ورنہ خیر اور بعد نکاح کے ہم نے بڑے بڑے دختروں کو کچے گھڑے پانی بھرتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے۔ کریمن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ہاں سرکار بیٹی کا دامن ہی بڑا ہے۔ خلیل خاں نے کہا لو میاں بنو میں تو سوتا ہوں۔ تم تمام باتوں کا بندوبست کر کے ساڑھے تین بجے مجھے جگا دینا، میں کچی نیند میں ہوتا ہوں تو کسی کا جگانا سخت ناگوار ہوتا ہے لیکن کام ہو تو مجبوری ہے۔ کیوں بی کریمن ایسا وقت جو میں نے مقرر کیا ہے ٹھیک ہے نا۔ کریمن نے کہا بجا ہے۔ جب ایک کام ہی کرنا ٹھہرا تو اس میں لیت و لعل کیوں ہو۔ خلیل خاں بولے بی کریمن تمہارے بچے جئیں۔ لو میں تو سوتا ہوں یہ کہہ کر خلیل خاں تو سو گئے

اور کریمن نے داروغہ سے کہا کہ اچھے داروغہ جی میں تم سے ایک بات پوچھتی ہوں میں نے امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ، چھوٹے بڑے سب ہی دیکھے ہیں لیکن یہ کہیں نہیں دیکھا کہ کوئی چیز دے کر پھر واپس لیں۔ چنو بولے ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ہاں اب سابقہ تمھارا ہمارے سرکار سے پڑا ہے۔ تم کو ہمارے سرکار کا دینا لینا کھل جائے گا۔ مجھے تو اس بات کا تعجب تھا کہ اتنے روپے سرکار نے تم کو کیوں کر دیے اور چپ ہیں۔ میں تو پہلے ہی رجو سے کہہ چکا ہوں کہ ان روپیوں کا سرکار کو نہایت قلق ہوگا اور خدا خیر کرے دیکھیے کہ کس کس پر نزلہ گرے، کس پر جرمانہ ہوتے ہوں گے میں یا درچی خانہ اوندھا رہے اور گے دن سرکار کو نیند نہ آئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ جلد لیکھا سول برابر ہوگیا۔ غرض کریمن بولی خیر داروغہ میں تو ایک پیسہ واپس نہ دوں گی۔ خیر بقول کسی کے:

بندگی ایسی ہو اور اُس کا انعام ایسا ہو

واہ واہ واہ گوڑے آنے جانے میں میری تو جوتیاں ٹوٹیں اور جب نکاح ہو جائے تو ہاتھ جھاڑ کر خالی ہاتھ چلی جاؤں۔ اگر خلیل خاں نے مجھ سے ایک پیسہ بھی واپس لیا تو میں یہ دیکھ لینا کہ اپنے حرجانہ کی نالش اس دھوم دھام سے کروں گی کہ اس شادی کے پھیرے میاں کو کچہری کے کرنے پڑیں گے۔ میرا نام کریمن ہے۔ میں میاں کا سب کچھ نکال دوں گی۔ میں نے ایسے بہت سیدھے کیے ہیں۔ خلیل خاں بہت یاد کریں گے اپنے ان کو نکوں کو اور میاں چنو سنو! ابھی ہوا ہی کیا ہے بات تو میرے ہاتھ ہے۔ ٹھہرو میں ابھی جا کر الف خاں صاحب سے کہے دیتی ہوں کہ میاں میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ مجھے تو اس وقت معلوم ہوا کہ دولھا پڑھا، نکا نزا، سر سے گنجا، کنجوس، مکھی چوس، بدزبان، بدمزاج، بے رحم، خود غرض۔ مصرع:

اچھی باتیں غرض جم ہی جم ہیں

چنو نے کریمن سے ہاتھ جوڑ کر کہا بی کریمن ہم تو سب مر جائیں گے یعنی ابھی ایسا غضب نہ کرنا کہ نالش کر دو پھر تو سارے گھر میں کھل بلی پڑ جائے گی۔ ہاں جو تم کہو گی ہم سب چندہ کر کے تم کو خوش کر دیں گے۔ کریمن تو یہ باتیں کرتی کرتی سو گئی اور داروغہ نے جوڑہ و زیور کشتیوں میں لگایا اور پھولوں کے گہنے کے واسطے چنگیر درست کی غرض تمام رات اسی سر پچر میں تمام ہوئی۔ تین بجے گلاب پھولوں کا گہنا لایا۔ چنو نے چنگیر میں سجایا۔ گلاب نے کہا کہ میاں داروغہ جی اس کا انعام، چنو بولا کہ سرکار ہمارے بیدار ہوں تو دلوا دوں گا ابھی ابھی تین بجے ہیں۔ ساڑھے تین بجے چنو نے خلیل خاں کو جگایا۔ خلیل خاں ایک ہی آواز میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے اور چنو سے کہا کہ داروغہ جی کہو تم نے کیا کیا۔ چنو بولا کہ سب سامان درست کر لیا اور بکن آپ کی آ گئیں اور محلے والیاں تیار ہیں۔ سواریاں دروازے پر حاضر ہیں اور گلاب پھولوں کا گہنا لایا ہے اور انعام کے لیے بیٹھا ہے۔ خلیل خاں نے کہا بڑا بے صبرا ہے، بے ایمان ہے۔ اتنی سی بات کے واسطے مرا جاتا ہے۔ گلاب قریب ہی تھا اپنا نام سن کر بولا۔ میاں مرا

نہیں جاتا۔ میرے سارے گھر نے تمام رات سہرے پر محنت کی ہے۔ رات کے بارہ بجے دیکھو اور ایسی سردی میں باغ جا کر پھول توڑنے دو تین مالیوں کو بٹھا کر لے دے کر کے گہنا تیار کیا۔ خلیل خاں بولے اچھا چھنو یہ بتاؤ پھولوں کا بھاؤ کیا ہے۔ گلاب نے عرض کی سرکار بھاؤ سے کیا سروکار ہے۔ ہماری محنت اور سرکار جو انعام دیں۔ خلیل خاں نے کہا یہ تمہارا کام ہے اس میں انعام ہی کا کیا کام ہے۔ اچھا چھنو تم نے زیور تولا وزن میں کتنا ہے۔ چھنو نے کہا سب ملا کر کوئی دو سیر ہوگا۔ خلیل خاں بولے ڈورے بھی دو سیر میں ہیں نا۔ چھنو جی ہاں۔ خلیل خاں بولے ڈورے اور بے ایمانی۔ پانی بھی خوب چھڑکا ہوگا یہ سب الا بلا ملا کر ڈیڑھ سیر کے قریب ہوگا۔ باقی پھول رہے ہی کیا۔ چھنو نے کہا جناب میرے خیال سے تو اس سے زیادہ۔ خلیل خاں نے کہا تو صاف کھو چبا کر کیوں کہتے ہو۔ چھنو نے کہا میں تو صاف صاف عرض کر رہا ہوں۔ کل ہی کا ذکر ہے ایک صاحب کے واسطے ان کا ملازم تازہ پھول لایا تھا دمڑی کم دو پیسے سیر اور وہ ملازم بیوقوف سا ہے منہ مانگے دام دے کر آیا تھا۔ خلیل خاں نے کہا بس تم نے حساب کر کے دے دیا ہوتا۔ تم بڑے نالائق ہو مجھ تک یہ جھگڑا آنے ہی کیوں دیا۔ اچھا تم پر چار آنے جرمانہ۔ آدھی کم ایک پیسہ ہوا۔ اس سے کوڑیاں لے کر پیسہ دے دو اور پونے چار آنے جمع کرا دو۔ خیر یہ کہتا ہے میں نے تمام رات محنت کی ہے، کچھ کام تو ایسا مشکل نہ تھا پھولوں کا پرونا بھی کچھ بات ہے لاؤ مجھے دو میں پرو دوں خیر یہ مراہی جاتا ہے اور امیر انعام بھی دیا کرتے ہیں۔ دھیلا انعام ڈھائی دمڑی اور ساڑھے تین آنے مجھے دے دو۔ گلاب نے کہا واہ میاں واہ میں نے ایسا انعام پایا کہ پیٹ بھر گیا۔ اب میرا زیور پھیر دو۔ خلیل خاں نے غصے سے کہا لے اب بھی تجھ کو کچھ کسر باقی ہے تو اللہ ہی حافظ ہے۔ بھاؤ سے زیادہ منہ مانگی مراد دے دیا اور اُس پر انعام معقول۔ اچھا دارو غہ ادھی اور دو ڈیڑھ پیسہ کی۔ اب مجھے اپنے دادا جان کی قسم ایک دام اسے زیادہ نہ دوں گا۔ گلاب بولا میاں ایسی ایسی رقمیں تو میں آپ پر سے تصدق کر کے پھینک دوں میاں میں نے سب کچھ پایا۔ میرا گہنا دے دو۔ خلیل خاں نے ہنس کر کہا۔ اچھا تو خوش رہ چھنو باقی کا دھیلا بھی دے کر اس بلا کو بھی ٹالو۔ گلاب نے کہا نہیں جناب نہیں مجھے گہنا دے دو۔ میں اسے اُدھیڑ کر بیچ ڈالوں گا۔ خلیل خاں نے کہا تجھے جتنا دیتے جاتے ہیں تو اور پاؤں پھیلائے جاتا ہے۔ اچھا انچھو سے کہو کہ اس گستاخ کا کان پکڑ کر نکال دو۔ انچھو سوتا تھا خلیل خاں کی گرم آواز سے اُس کی آنکھ کھلی اور یہ کہتا ہوا اُٹھا کہ اے اُلو ٹونے کا بے کار و لا مچایا چل بے چل ورنہ ایسے گردنے کی آؤں گا کہ گرد ابادکر دوں گا اور کھوپڑی گھو کھاتی پھرے گی۔ گلاب نے کہا اچھا میاں اچھا میں اپنا گہنا لیلوں تو چلا جاؤں آپ خفا نہ ہوں۔ انچھو نے جواب دیا اچھا میاں کا بچہ۔ اے تیرے زیور اور تیری ایسی تیسی ٹھہر جاتا کہاں ہے اُلو کے پٹھے یہ کہہ کر کان پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لایا اور کان چھوڑ کر ایک لات ماری کہ گلاب گر پڑا اور روتا ہوا باہر چلا گیا۔ خلیل خاں کان لگا کر سنتے رہے، جب گلاب چلا گیا تو خلیل خاں نے چھنو سے دریافت کیا کہ گلاب گیا۔ چھنو نے کہا ہاں گیا۔ خلیل خاں بولے اے اُس نے

تیرے جرمانے کے چار آنے سُن لیے ہیں اس وجہ سے پاؤں پھیلائے ہیں اچھا دمڑی اور دو اور اس پر نہ مانے تو کہہ دو عدالت کھلی ہے ہمارے نام کی نالش کر۔ چھٹو نے باہر آ کر گلاب کو آواز دی کہ گلاب بھائی یہاں آ گلاب نے روتے ہوئے روکھے لہجے میں کہا بس میاں بس سرکار نے دیا اور میں نے لیا اب جو خدا دلائے گا لیں گے ورنہ خیر۔ چھٹو نے واپس آ کر کہا وہ نہیں لیتا تو خلیل خاں بولے بس جمع کرا دو۔ چھٹو نے عرض کی بہتر۔ اس رد و کد میں چار بجے محلے والیاں لباس پہن پہن کرا پنے اپنے گھروں سے آ کر جمع ہو گئیں۔ چھٹو نے سوار کرانا شروع کیا۔ آخر میں خلیل خاں کی بہن سوار ہوئیں۔ چھٹو نے کشتیاں سائیسوں کے سروں پر رکھوائیں اور جوڑہ اور زیور کی خدمت گاروں کے سروں پر، تھیلی اشرفیوں کی اپنے پاس رکھی۔ خلیل خاں بولے چھٹو جلد جاؤ۔ اندھیرا ہے دیکھو کوئی چیز اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ غرض چھٹو رات کا وقت روشنی ساتھ نہیں، بہزار خرابی ٹھوکریں کھاتے الف خاں کے مکان پر آئے تو سوائے پہرے والے کے سب سوتے ہیں۔ دروازہ بند چھٹو نے آ کر آواز دی کہ دروازہ کھولو پہرے والے نے کہا کہ کون۔ چھٹو نے کہا ہم خلیل خاں کے مکان سے آتے ہیں ذرا سرکار کو جگا دو۔ پہرے والا کون کھلیل کھاں ہم کسی کھلیل بلیل کو نہیں جانتے ہم کو وردی نہیں دی گئی۔ چلو چلو جاؤ غل نہ مچاؤ چھٹو نے جواب دیا کہ بھائی تم جا کر سرکار سے عرض تو کرو۔ پہرے والے نے کہا اب جائے گا یا نہیں یا اور طرح سے خبر لیں۔ اتنے میں چوبدار کی آنکھ کھل گئی اس نے پہرے والے سے پوچھا کیا ہے۔ پہرے والے نے کہا کوئی بدمعاش ہے جو رات کو آیا ہے۔ چھٹو نے یہ سن کر کہا میاں میں خلیل خاں صاحب کا داروغہ ہوں۔ چوبدار تو روانہ ہوا اور الف خاں کو جگا کر کہا کہ چھٹو خلیل خاں کے یہاں سے آیا ہے کیا حکم ہے۔ الف خاں نے نیند میں کہا کہ ہمارا دروازہ ساڑھے آٹھ بجے کھلے گا اب تو تم جاؤ نو بجے آنا۔ تم نے صبح ہی صبح کس کمبخت کا نام لیا کہ دیکھیے آج کھانا بھی ملتا ہے یا نہیں۔ چھٹو بولا میاں زنانی سواریاں تو اُتروا دو۔ چوبدار نے کہا ابھی گاڑیاں گاڑیوں کے اڈے میں لے جاؤ۔ جاؤ کہہ دیا اور غل نہ مچاؤ۔ اگر تمہارے غل سے سرکار کی آنکھ کھل گئی تو آفت ہی آ جائے گی۔ چھٹو مجبور ٹھہر ا رہا اور منگل سائیس کو دوڑایا کہ جا کر سرکار سے عرض کرو کہ جناب دروازہ وہ نہیں کھولتے۔ اب جناب جیسا کہ حکم دیں ویسا کریں۔ منگل نے آ کر خلیل خاں سے سارا حال بیان کیا۔ خلیل خاں نے سن کر کہا خیر یار زندہ صحبت باقی اگر الف خاں سے اس کا اچھی طرح بدلا نہ لیا تو نام خلیل خاں نہ پایا۔ اچھا جاؤ چھٹو سے کہو کہ ہمارے مقررہ وقت میں تو خلل آ گیا خیر ٹھہرے رہو جب دروازہ کھلے جانا۔ منگل نے آ کر کہا چھٹو ٹھہر ا رہا۔ اب ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلا۔ چھٹو نے دروازے پر آ کر کہا بھئی اب تو جا کر اطلاع دو کہ رسم کے واسطے آئے ہیں۔ چوبدار نے کہا کیسی رسم اور کس کی اے بھائی تو گھر بھول گیا اور ہم کو ناحق آ کر ستایا۔ جا بھائی جا ورنہ اچھا نہ ہوگا چھٹو نے کہا اچھا بھائی تم جا کر کہو تو سہی کہ سواریاں رسم کے واسطے آئی ہیں۔ چوبدار نے کہا کہ اچھا بھائی میں چلا لیکن اُن کا نام نہ لینا جہاں سے تم لوگ آئے ہو۔ یہ کہہ کر

جلدی سے چوبدار گیا اور تھوڑی دیر میں آ کر کہا کہ چلو داروغہ جی آپ کو سرکار بلاتے ہیں۔ پچو اندر آیا الف خاں کو سلام کیا اور کہا کہ جناب میں چار بجے سے حاضر ہوں۔ الف خاں نے بہ تجاہل عارفانہ غصّے میں آ کر کہا کہ پہرے پر کون تھا بلا کر لاؤ۔ پہرے والا آیا۔ الف خاں نے بگڑ کا کہا تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ پہرے والے نے عرض کی کہ حضور مجھ سے کسی نے نہیں کہا۔ الف خاں نے چوبدار سے کہا کہ تم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ دروازہ کھول دینا کیوں نہیں کھولا۔ چوبدار نے عرض کی کہ حضور ان کے آدمیوں نے وہ غل مچایا کہ عقل ٹھیک نہیں رہی میرا کیا قصور ہے اور حضور نے فرمایا تھا۔ الف خاں نے کہا کہ میں نے تو نیند میں خبر نہیں کیا کہہ دیا تم نے تو خیال کیا ہوتا۔ الف خاں نے پچو سے کہا کہ داروغہ جی مجھے معاف کیجیے گا۔ ارے گھر میں جا کر اطلاع دو کہ سواریاں آئی ہیں اور تم اچھی طرح پردے کا انتظام کرو اور سواریاں اُتروا ؤ اور یہ کشتیاں اندر بھجوا دو۔ پچو نے الف خاں کے روبرو کشتی پوش اُتار کر جوڑہ اور زیور دکھایا عورتیں یہ کشتیاں لے کر اندر روانہ ہوئیں الف خاں نے جو چند عورتیں بازاری اسی کام کے واسطے بلا رکھی تھیں وہ سب زیور سامان سے بن سنور کر جو بیٹھیں اور دروازے کو دیکھ رہی ہیں کہ پہلے ایک عورت پچیس برس کا سن، کالا رنگ، بھدا نقشہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پیشانی صرف ڈیڑھ انگل اور اندرو حبشی بھویں پھیلی ہوئیں، موٹے موٹے بال، ناک شکوی اور اس پر اورنگ زیبی پھنسی جس پر میلے کھرنڈ جو کئی جگہ سے چھَج گئے ہیں تو لال لال گوشت نظر آتا ہے۔ اس پر مکھیوں کا گرد گھیرا ہوا اور ناک کی نوک پھنسی کی وجہ سے اتنی اُٹھی ہوئی ہے کہ بانسہ رطوبت سے تر نظر آتے ہیں، ہونٹ جیسے گردہ پر کھرا چاقو لگایا ہوا اوپر نیچے پلٹے ہوئے، نیچے کا ہونٹ اتنا متورم ہے کہ تھوڑی کی پردہ پوشی کر رہا ہے، سر پر مینڈھیاں دو مہینے کے عرصے سے گندھی ہوئیں جن کے بلوں میں میل گرد و غبار، کچھ بیلوں کی سمائی کرتے ہوئے جو سر کھجایا ہے تو بھو سے کے تنکے لپٹے ہوئے، سر پر میلا لال قند کا دوپٹہ جس میں دو انگل چوڑی سبز گوٹ جس میں کئی جگہ گوبر کے دھبے، گلے میں سردی کا زمانہ اور نینو کا نیا اکھرا گرتا جس میں سرخی گوٹ لگی اور کالے کالے چندے کا عکس جھلکتا، ٹانگوں میں سوسی کا پاجامہ سیدھا نیلا پنڈلیوں پر موٹے موٹے ٹانکے لگے جو پنڈلی موٹی ہونے کی وجہ سے چر گئے ہیں۔ پاؤں میں ادھوڑی کی چرھواں جوتی لمبے پنجے اور اُلٹی نوک کی جس پر سوت کی کڑیاں بنی ہوئیں، کانسی کی بانک پاؤں میں، ہیچ رنگے سوت کا گٹھا ہوا کمر بند جس کے پھندنے گھٹنوں پر لٹک رہے ہیں۔ پانچ برس کا بچہ گود میں گلے سے ننگا، سر پر میلی ٹوپی جھجھی کوڑیوں کی کنٹھی اس کے گلے میں، بیا اپنے ہاتھ سے گرتہ اٹھائے بچے کو دودھ پلا رہی ہیں۔ کالا کالا پیٹ اور اس پر اُلٹی ہوئی ناف لیکن پیٹ کے رنگ سے کچھ زردی مائل اُبھری ہوئی دکھائی دیتی ہے اور بچہ دودھ پی رہا ہے۔ ان کے کانوں میں سناری تین تین پھول کی چاندی کی چکٹ سے اَٹی ہوئی بالیاں، گلے میں کانسی کی موٹی ہنسلی اور چہرہ شاہی روپیوں کا گھسا ہوا ہار، ہاتھوں میں لاکھ کی چوڑیاں جن کی پوتھیں اُکھڑ کر ان کی جگہ آٹا بھر گیا ہے۔ اس کے پیچھے دوسری گندمی رنگ،

گول چہرہ، ایک آنکھ بند اور دوسری کھلی ہوئی، ناک میں نتھ کانوں میں بالیاں، سر پر گاڑھے کا عنابی دوپٹہ جس پر ٹی کے گول گول شیشے نُسرے لگے ہوئے اور کہیں کہیں مور، گھوڑا، ہاتھی، چڑیا کے نیچے اونٹ، شیر، ہرن غرض تمام نہایت بھدّے جن کو انھوں نے اپنے خیال میں شکارگاہ بنایا ہے۔ پان جو اتفاق سے آج ہی کھایا ہے تو تمام ہونٹ اور باچھیں، کچھ تھوڑی بھی لال ہے اور اُجلے کرتے پر پیک کے گیلے دھبّے پڑے، ٹانگوں میں مرچ کی چھینٹ کا لہنگا، ننگے پاؤں دروازہ میں گھس کر بھنّا بکّا ہو کر دیکھنے لگیں۔ اب ریلا دے کر غول دروازے سے اندر آیا۔ کوئی چیختی، کسی کا بچہ روتا، ایک ایک سے کہتی نپوتی میرا سارا پاؤں کچل گیرا، کوئی بڑھی، کوئی جوان، میلے کچیلے کپڑے، سر جھاڑ، منہ پھاڑ آپس میں غل مچاتیں ہوئیں آ گئیں۔ ایک اری شبراتن آ کبھلو کی بہو کو دیکھیں۔ دوسری نے جواب دیا وہ تو مہینے دو مہینے میں ہی شادی کرے ہے۔ تیسری اری تائی ذالدی چلیو میرا تو اوا بنے بغیر پڑا ہے اری دولھا کی بہن کو بلاؤ کہ جو کرا دا کرنا ہے وہ کر کے چلیں۔ چوتھی اری دولھا کی بہن پاؤں اٹھا کر چل تُو تو مرے مرے پاؤں دھرے ہے۔ کچھ کھانے کو بھی ملے یا بھوکی مرے ہے۔ خلیل خاں کی بہن دل ہی دل میں گھٹ کر چپ ہیں۔ دو لڑکیاں ایک ایک کے گلے میں باہیں ڈالے ہنستی ہوئیں چمن میں جا کر کچے پکے پھل پھول توڑنے لگیں اور گودیوں میں بھرنے شروع کیے۔ نجو اری اَلّو کی پٹھی چھوری عیدو کو ساتھ لیتی آئیو۔ ایک بولی اری بھگو اِدھر آ اور شبراتی چھوری کے باپ سے کہہ دے کہ روٹی پر کھڑا رہے۔ خلیل خاں کی بہن نے آہستہ سے کہا کہ غل نہ مچاؤ۔ اس کے جواب میں ایک ان میں سے چیخ کر بولی اری چاچی دیکھو اس بڑھی کی باتیں دیکھے تاکیسی اِتراوے ہے۔ یہ لگے کون ہے کھلیل کی جو ایسی مٹکے ہے۔ میں تو ایسی جگہ کھڑی موتوں بھی نہیں۔ میں تو جاؤں ہوں جاری جا گاڑی والے سے کہو کہ گاڑی لائے مجھے تو ناج پیسنا پڑا ہے۔ یہ بڑھی تو ایسی مٹکے ہے جیسے اس کے لعل لٹک رہے ہیں۔ الف خاں صاحب نے جن عورتوں کو بلایا تھا وہ یہ باتیں سن کر ہنسی کے مارے لوٹی جاتی ہیں کہ آج یہ مثل صادق آئی۔ مثل: کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ اس سے معلوم ہوا کہ میاں خلیل خاں صاحب کسی ذلیل قوم کے آدمی ہیں۔ اب سمدھنیں صحن میں آئیں کسی نے آفتابے کو دیکھ کر سینے پر ہاتھ مار کر بولی اری بھدّو دیکھے تا یہ کیا اُوٹ پٹانگ چیز ہے۔ میرے یہاں ایسے بیسیوں پڑے ہیں اس کو بھولوا کہے ہیں۔ جاڑے میں یا میں تیل بھر کر جلائے ہیں۔ یا کی بڑی سوتی روشنائی ہووے ہے۔ دوسری بولی نا ری نایا میں روشنی کون اندھا کرے ہے یا میں تو کھیر پکائے ہیں۔ ایک بولی چل گھوڑی یا میں تو سب مل کر موتے ہیں۔ اب یہ باتیں کرتی ہوئیں آگے آئیں۔ ایک نے تو آدھی انگنائی میں جوتی اُتاری۔ دوسری فرش پر جوتی پہنے بیٹھ گئی۔ ایک نے چراغ کا تیل جوتی میں ملا ہے تو پاؤں چکٹ ہو گئے ہیں۔ اس نے جو اُجلی چاندنی پر پاؤں رکھے تو پورے نقش قدم کے چھاپے لگے۔ ایک

نے ایرانی قالین کا کونہ پکڑ کر اُٹھایا اور کہا اری دیکھ او ڈومنیوں کا ناٹ، بچھا دیا ہے۔ ان کے گھر کی لوگائیوں کو کچھ اکل نہیں۔ غریب ہیں نا یہ جانے ہی کیا ہیں، ایک اپنے بچے کو لے کر قالین پر جا بیٹھی۔ اتفاقاً بچے نے موت دیا اُس نے چلّو میں سمیٹ لیا اور دوڑ کر چلی تو ایک سے الجھ کر گری کہ سارا موت اس غریب کے نمازی کپڑوں پر گرا۔ ڈومنیوں نے ان کے بیٹھتے ہی گانا شروع کیا۔

ساجن آئے۔ ساجن آئے
چار طرف کے آئے لگائے
ساجن آئے ساجن آئے
ذات پات کا نہیں ٹھکانہ
کوئی ہے اندھا کوئی ہے کانا
جن کا تماشہ دیکھے زمانہ
ساجن آئے ساجن آئے

اب کئی عورتیں شربت پلانے کو کھڑی ہوئیں ایک نے گلاس اور پیالی ہاتھ میں اُٹھائی۔ دوسری نے ولیی شیشہ شربت بھرا ہوا لیا۔ ایک نے رومال منہ پونچھنے کو لے لیا۔ پہلے شربت خلیل خاں کی بہن کو دیا۔ خلیل خاں کی بہن نے ایک ٹکا تھالی میں ڈالا۔ رومال والی نے منہ پونچھا اب ان سمدھنوں میں سے ایک کو شربت دیا اُس نے شربت پی کر گلاس بڑھایا اور کہا لا ری اور دے۔ اچھا ہے سو ہے پیاس بھی بڑی دیر سے لگ رہی تھی۔ شربت پلانے والی نے شرماشری اور تھوڑا سا دیا وہ اُس نے اپنے بچے کو پلا دیا اور کہا ہری تاجسی نہ کر اور دے۔ خلیل خاں کی بہن نے دلہن والیوں کی نظر بچا کر اشارہ کیا کہ یہ دستور نہیں ہے، اُس نے غصے سے کہا اری تو کیا کھلیل کی بائیں پسلی کی نکلی ہے جو نخرہ کرے ہے۔ تو اُس کی لگے کیا ہے جیسے ہم ویسی تو۔ یَہ ہم ایت دار نہیں۔ روپے میں پیسے میں کس بات میں کم ہیں۔ گھر کے دو دو ک ٹھیلے دو جوٹ بلد چار روپے روز ادے ہیں۔ ہم کوئی کسی کا دینا دھرا تے ہیں۔ لے ری اپنا گلاس تھام موکونہ چاہیے۔ الف خاں کی معنوی پھوپی نے شربت پلانے والی سے کہا کہ اور دو، چنانچہ شربت والی نے گلاس بھر کر اور دیا اُس نے پی کر ڈکار لی اور کہا لا ری اور دے، بھر کر دے غرض سات گلاس پی کر گلاس دے دیا اور لہنگے کے گھیر کو الٹ کر منہ پونچھا۔ شربت پلانے والی ٹھہری کہ شاید دستور کے موافق کچھ تھالی میں ڈالیں گی یہاں ٹھمر کو جو تک کب لگی تھی یکو کر شربت پلانے والی سے کہا چل ری آگے بڑھ آگے اب دوسری کا دور آیا اس نے تو گلاس پیے۔ ڈومنیوں نے ہر چند گایا بجایا، گالیاں دیں غرض ہر چند پاؤں پیٹے کہ کچھ دیں لیکن ان میں سے ایک نہ کیچی۔ آخر انھوں نے گانا بند کیا۔ اب جس عورت کی تصویر الف خاں صاحب نے بھیجی تھی اُس کو دلہن

ہٹا کر مسند پر بٹھایا۔ الف خاں کی بیوی نے کہا کہ جناب آپ دلہن کو دیکھ لیں۔ اس وقت تک کے تو ہم ذمے دار تھے اور کل کلاں کو صورت و رنگت میں کچھ فرق ہو یا آپ یہ کہیں کہ دلہن بڈھی ہے تو ہم اس کا ذمہ نہیں لیتے۔ خلیل خاں کی بہن بولیں کیا ضرورت ہے۔ الف خاں کی بیوی نے کہا کہ بی تم تصویر منگا کر مقابلہ کر لو۔ غرض رجو کو تصویر کے واسطے دوڑایا۔ جب تصویر آئی تو کریمن نے دلہن کا گھونگٹ اُلٹ کر دکھا دیا۔ خلیل خاں کی بہن نے دلہن کو پہلے بدھی پہنائی پھر کرن پھول چمپا کلی دھگدھگی پٹکا، بازو بند، پھر ہاتھ میں گجرے، بعد زیور کانوں سے شروع کیا۔ اب مصری کی سات ڈلیاں لے کر ایک ایک ڈلی دلہن کو دینی شروع کی۔ منگو کا بچہ مچل گیا اور منگو کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا اسری مجھے بھی مصری دے میں بھی کھاؤں گا۔ منگو نے خلیل خاں کی بہن سے کہا کہ لاری کہ ایک ڈلی چھورے کو دے۔ ایک عورت بولی واہ یہ شگن کی چیز ہے اس میں سے کیوں کر دے دیں اس لڑکے نے منع کرنے والی کو ایک گالی دی اور کہا چپ رہ ری اُلو کی جام میں تو لوں گا۔ اس عورت نے کہا واہ رے لڑکے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ منگو نے کہا اسری کے ایسے جوتے کی دوں گی دیکھو میرے چھورے ہی کو کچھ نہ کہیو۔ ہمارا چھورا دن میں بیس ڈلیاں گڑ کی ہاتھ میں مل کر پھینک دے ہے۔ پرسوں باپ پیسے کا گڑ لایا تھا چولہے پر آفورہ میں دھرا ہے چاہے تو جا کر دیکھ لے۔ غرض اب رقعہ تو الف خاں کی عورتوں نے لے لیا اور تھیلی اور اشرفیاں کریمن کو دے دیں۔ اب سمدھنوں نے غل مچایا کہ گڈیاں لاؤ۔ چنانچہ پردے کا انتظام کیا گیا اور دولھا والیاں سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ جب یہ مراسم ختم ہو چکے تو الف خاں کو یہ خیال آیا کہ رخصت کا کیا بندوبست کیا جائے لیکن جو کچھ ہوا ایسا ہو کہ جو سنے ہنستے ہنستے لوٹ جائے اور خلیل خاں پھر شادی کا نام نہ لیں اور اگر کوئی شادی کے متعلق کہے تو خلیل خاں یہ جواب دیں کہ بھائی اب خلیل خاں فاختہ اُڑا چکے اب شادی کی تو جان باقی ہی نہ رہی۔ یہ مسئلہ الف خاں نے اپنے دوستوں سے بیان کیا ایک صاحب بولے جناب میں بتاؤں رات کو وہ بڑھیا جو فاختہ کی ٹھمری گاتی پھرتی ہے لیکن لے سُر تال سے خوب واقف معلوم ہوتی ہے اور وہ ڈھلتی رات کے سناٹے میں اس کا چھوٹی چھوٹی مرکیاں لے کر یہ کہنا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ٹھمری یہ ہے۔

میری فاختہ ری تو نے طوق گلے کیوں ڈالا!
کوا تیرا چچا بنا ہے وچیل ہے تیری خالہ!
مکڑی تیری جنم کی نانی جو پورے ہے جالا
میری فاختہ ری بیری میں تو جھونجھ بنالے تنکا تنکا اٹھا
آئے کوا میں ماروں گی اللہ ہے رکھوالا!
میری فاختہ ری جیو جنتر اور پرش استری سب کا دینے والا

آج صبح سے بھوکی مروں ہوں ایک ایک دے دو نوالہ

میری فاختہ ری تو نے طوق گلے کیوں ڈالا!

الف خاں صاحب نے فرمایا کہ مشورہ تو ٹھیک ہے لیکن کچھ زیادہ لطف کی یہ بات نہیں کچھ اور بھی سوچا جائے۔ دوسرے صاحب بولے کہ جناب میرے محلے میں ایک عورت نہایت جوان دنگلی گھوڑا پچھاڑ نامی رہتی ہے لیکن بہت آوارہ ہے۔ اکثر اکھاڑوں میں لڑنت کرتی ہے۔ پہلوان اس سے کشتی لڑتے کنیاتے ہیں۔ اس گھوڑا پچھاڑ کو دلہن بنا کر رخصت کر دیجیے پھر وہ خلیل خاں تو ایک طرف دو چار کے بس کی بھی نہیں ہے۔ وہ پہلی ہی رات کو خلیل خاں کو ایسا سیدھا توک دم کر دے گی کہ خلیل خاں اپنے پچھن بھول جائیں یہ سن کر اکثر صاحب بول اٹھے کہ بس جناب صلاح وقت یہی ہے۔ الف خاں نے کہا کہ آج رات کو ان دونوں کو بلواؤ تاکہ کچھ سمجھا دیں۔ الف خاں کے دوست میاں باتو خاں بولے جناب میں دونوں کو لاؤں گا۔ غرض باتو خاں اپنے گھر آئے بلایا۔ گھوڑ پچھاڑ لنگوٹا باندھے، کرتہ میلا چکنا گلے میں، سر پر ڈوپٹہ لپیٹے پان کھائے، مسی لگائے، ان کا گندمی رنگ، طباق سا چہرہ، چپٹی ناک بھنگ کے نشے میں دھت، آنکھیں چندھیائیں، جھومتی جھامتی باتو خاں پاس آئیں اور سلام علیک کہہ کر بیٹھ گئیں اور نشے کی گھڑ ائی ہوئی آواز سے کہا خاں صاحب آپ نے کیوں بلایا ہے۔ میاں باتو خاں بولے ذرا ٹھہرو، دم لو، گھوڑا پچھاڑ بولیں دم دم تو ابھی لگا کر آئے ہیں۔ کام بتاؤ کام جو جلد کر کرا کر جاؤں۔ میاں باتو خان نے کہا کہ تم کو الف خاں صاحب نے آج رات کو بلایا ہے، تم سے بڑا ہی ضروری کام ہے۔ گھوڑا پچھاڑ بولی ہمارے میاں الف خاں نواب صاحب، باتو خان نے کہاں، گھوڑا پچھاڑ بولی کے بجے باتو خاں نے کہا نو بجے۔ گھوڑا پچھاڑ بولی یار تو چل دیے۔ سلام علیک کہہ کر روانہ ہوئی اور باتو خاں نے فقیرنی بڑھیا کو بلوایا۔ گھوڑا پچھاڑ کے بعد یہ آئی۔ اس کو سب فاختہ کہتے ہیں۔ اس کی اسی برس کی عمر قد اتنا جھکا ہوا ہے کہ دوہرا معلوم ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں بانس کی پرانی لکڑی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی جس کو میلی پرانی دھجیوں سے باندھ رکھا ہے، لکڑی کے ٹکتے ہوئے سرے پر بانس کے ریشے الٹ کر کچھا سا ہو گیا ہے۔ سر پر چار چار انگل چھدرے چھدرے بال جن میں سے چندیا کی کھال جھلک رہی ہے۔ میلا دوپٹہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا سر پر، کان کی لویں جوانی میں بالیوں کے وزن سے چر کر جھالری بن گئی ہیں، جوانی میں گورا رنگ تھا اب نہایت بدنما ہو گیا ہے۔ تمام چہرے پر جھریاں، آنکھیں اندر کو دھنسی، دونو گلے جبڑوں سے جھولے ہوئے اور دانت نہ ہونے سے اندر دھنسی ناک کی نوک اتنی جھک آئی ہے کہ جب بی فاختہ کچھ پلپلاتی ہیں تو ناک کی نوک ہر دفعہ ٹھوڑی سے ٹکراتی ہے، گردن جھکی، گلے کے پٹھے تنے ہوئے، میلا کرتہ سوتی ململ کا پہنے شانوں پر گریبان اور اس کے بند ٹوٹے۔ ایک سوتی چھینٹ کا آٹھ انچ لمبا چوڑا بٹوہ جس میں پٹوہ کے ہاتھ کا ڈورہ پڑا ہوا، بٹوے میں پانوں کا گلبرہ۔ چھوٹی سی پن کٹی اور کچے ڈوروں کی چھالیہ، چھوٹا سا بے

کمائی کا سروتہ جو پرانا ہو کر پتا ہو گیا ہے۔ ایک مٹی کی کلیا میں سڑا ہوا چونہ برسرد کا سوکھا ہوا کتھا پانس کی چیچیاں کچھ کوڑیاں ، ٹوٹا ہوا بٹن ، پیتل کا چھلا ، قد دہرا ہونے کی وجہ سے ہٹو وہ کبھی گھٹنے سے ٹکراتا ہے اور کبھی ٹھٹھر کی پن گئی کے بوجھ سے ہاتھ کی لکڑی سے ٹکراتا ہے۔ پاؤں میں تنگ موری کا پیوند لگا ہوا میلا پاجامہ جس کی موریاں لمبی ہونے کی وجہ سے ایڑیوں سے اتر کر آدھے تلووں تک آ گئی ہیں اور بی فاختہ کو جو پسینہ آ کر خشک ہوا ہے تو پاجامے پر سفید لکیریں جیسے خوشنویس قطعوں کے بین السطور موش دنداں بناتے ہیں نمایاں ہیں۔ پاؤں میں پرانی جوتیاں گھس گھس کر آدھی رہ گئی ہیں ، جوتی ایک سلیم شاہی دوسری گول پنجے کی ، ہاتھوں میں شیشے کی ایک ایک لال چوڑی جن کی جلا گھس کر دھندلی اور سن ہو گئی ہیں۔ یہ بیچاری ہانپتی کانپتی سر ہلاتی آئی اور دعائیں دے کر کہا حضور نے کیوں لونڈی کو بلایا ہے۔ باقو خاں نے کہا کہ کام کے واسطے۔ بی فاختہ بولیں واری وہ کام کیا ہے اور میں کس کام کے لائق ہوں۔ بڈھی کی کیوں ہنسی اڑاتے ہو ، باقو خاں بولے اڑاتے نہیں گھر بساتے ہیں۔ فاختہ نے کہا میاں گھر کیسا گھر کو اجڑے بچھڑے مدت ہوئی اب وہ گھر اس قابل نہیں جو بسے گا۔ میاں تم بچے ہو کیوں اڑاتے ہو۔ کچھ دیتا ہے تو دو ورنہ سلامت رہو آباد رہو۔ باقو خاں نے کہا کہ تمھارا اس میں بڑا فائدہ ہے اتنا کچھ مل جائے گا کہ باقی عمر آرام سے کٹ جائے گی میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ تم کو نواب محمد الف خاں صاحب نے بلایا ہے۔ میں تم کو ڈولی منگا دیتا ہوں تم سوار ہو کر چلی جاؤ۔ فاختہ نے کہا کہ آج کی رات مانگنے سے رہ جاؤں گی تو صبح کو فاقہ ہے۔ باقو خاں نے ایک روپیہ دیا اور کہا بس اب تو حرج نہ ہوگا۔ فاختہ نے کہا ہاں میاں اب اطمینان ہو گیا جو کہو گے کروں گی اچھا ڈولی منگا دو اور مجھے روانہ کر دو۔ باقو خاں نے ڈولی منگا کر فاختہ کو روانہ کیا۔ کہاروں نے الف خاں کے مکان پر اُتارا یہ اتر کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اب الف خاں صاحب کھانا کھا رہے تھے کھانے سے فارغ ہوئے اس عرصے میں گھوڑا پچھاڑ بھی آ گئیں اور کچھ دوست بھی الف خاں کے دیوان خانے میں جمع ہو گئے۔ اُس وقت الف خاں نے ایک ملازم سے کہا کہ وہ دونوں عورتیں جو آئی ہیں اُن کو بلاؤ غرض یہ دونوں آ گئیں۔ گھوڑا پچھاڑ نے آتے ہی سلام علیک کی اور الف خاں صاحب سے کہا کہ حضور ارشاد ہو لونڈی کو کیوں یاد فرمایا ہے ، لونڈی حاضر ہے۔ الف خاں نے کہا کہ بی تم کو اس واسطے بلایا ہے کہ خلیل خاں کو تم جانتی ہو ، گھوڑا پچھاڑ نے کہا کون خلیل خاں۔ خلیل خاں تو کئی ہیں۔ الف خاں صاحب نے جواب دیا جو بھنگی دروازے میں رہتے ہیں۔ گھوڑا پچھاڑ نے کہا وہ بڈھے پھونس کنجوس مکھی چوس جو ہر مہینے شادی کرتے ہیں اور خسیس اتنے کہ شام کو شادی کر کے لائے اور صبح کو انھوں نے اپنی جورو سے کہا کہ میری تم سے شادی ہوئی ہے میں بھی اپنی کمائی کھاتا ہوں تم بھی اپنی کمائی کرو اور دروازے سے باہر نکال دیتے ہیں اور تاکید کر دیتے ہیں کہ سویرے سے آ تا میرا کھانا پکانا ہوگا۔ الف خاں نے کہا بس وہی ہیں ، آج اس بڑھیا فاختہ سے اُن کی شادی ہوگی تم دلہن کے ساتھ جانا اور جب تخلیہ ہو خلیل

خاں کی ایسی گت بناتا کہ پھر شادی کا نام نہ لیں۔ گھوڑا پچھاڑ نے کہا کہ میں اس گدھے کو ایسا ٹھیک بنادوں گی کہ تمام عمر کان نہ ہلائے اور بھول جائے اپنے کونکوں کو۔ الف خاں صاحب نے کہا بس میں ایسا ہی چاہتا ہوں جب تم ٹھیک کردو اس کے بعد اس بڑھیا کو اس کے محلے میں پہنچا دینا اور میرے پاس آنا میں تم کو سو روپے دوں گا اور فاختہ سے کہا کہ بڑی بی تم نہ گھبرانا تمھارے ساتھ گھوڑا پچھاڑ ہے۔ جہاں تک تم سے بھی ہو سکے تم بھی کمی نہ کرنا۔ فاختہ بولی حضور میں اکیلی ہی بہت ہوں میں تو بھڑوے کی ڈاڑھی کا ایک ایک بال کر دوں گی، میری گلی میں بھی اس نے دو عورتوں کو کر کے چھوڑ دیا ہے۔ میں مدت سے خار کھائے بیٹھی ہوں۔ الف خاں نے کہا کہ اس کے بعد تم میں ہوں یا نہ ہوں آ کر داروغہ سے انعام لے لینا۔ غرض اب فاختہ اور گھوڑا پچھاڑ اندر زنانے میں گئیں اور یہاں پچو نے آ کر سواریاں اُتروا کر خلیل خاں کے پاس آیا، سلام کیا۔ خلیل خاں نے کہا داروغہ جی اب تم سانچق کا بندوبست کرو۔ بازار سے نُقل، میوہ، قرص کلاوہ، مہندی، بادام فرید کا پُڑا، سہاگ کا عطر، موتیا کا عطر، تیل، مسی، سرمہ، سہاگ پُڑا، ٹھلیاں دو چاندی کی گھر میں ہیں اور سو اسو ٹھلیاں مٹی کی بھوڈل پھری اچھی رنگین ہوں اور کمہار سے کہنا کہ ہم سب واپس کر دیں گے۔ پچو نے کہا وہ تو وہیں رہیں گی۔ خلیل خاں نے کہا تم اپنے نام سے مانگ لینا اور جو گھڑی آرائش والے سے بنے بنائے تھوڑی دیر کے لیے پچھوڑے کر لے آؤ اور گھر آ کر چوتھی کا جوڑا اور بیت کا جوڑا انگوٹھی اور سر سے پاؤں تک جڑاؤ زیور ہمارے نام سے کہیں سے مانگ لاؤ اور تھہ، یہ سب بہن کو دے دینا یہ سب بندوبست جلد کرو اور چڑھاوا چڑھا کر جلد آؤ، میں یہاں دولھا بنا ہوا تم کو بٹھا رکھوں گا اور تمھارا منتظر رہوں گا تم آئے اور میں چلا۔ پچو نے عرض کی اتنی عجلت مناسب نہیں، خلیل خاں نے غصے سے کہا کہ میں عجلت کو دیکھوں یا اپنی ضرورت کو۔ پچو نے کہا بہتر میں جاتا ہوں اور یہ سب سامان لاتا ہوں۔ الغرض پچو گیا اور ساڑھے بارہ بجے دن کے یہ سارا سامان لایا۔ سانچق درست ہوئی اب پچو نے عرض کی کہ سرکار عورتیں جائیں گی یا نہیں۔ خلیل خاں نے کہا صرف بہن کو لے جاؤ۔ پچو خلیل خاں کی بہن کے پاس آیا اور کہا جناب سوار ہو جائیں، خلیل خاں کی بہن نے دریافت کیا کہ اور عورتیں بھی جائیں گی، پچو بولا صرف آپ ہی جائیں گی، خلیل خاں کی بہن بولیں پھر میں اکیلی جا کر کیا کروں گی بس مرد ہی لے جائیں۔ رہا چڑھاوا انگوٹھی، چھلا، پھولوں کا گہنا سو دلہن والے آپ پہنا لیں گے مجھے تو گھر کا کام کاج اتنا ہے کہ اس سے فرصت ہی نہیں ملتی، وہ بھی بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا جو چلی گئی تھی۔ پچو نے خلیل خاں سے آ کر کہا کہ حضور وہ تو نہیں جاتیں۔ خلیل خاں بولے تو پھر کیا کریں، پچو نے عرض کی جیسا مناسب ہو خلیل خاں نے حکم دیا کہ تم جا کر اللہ رکھی جو گلی کی دکان میں رہتی ہے اور اس کے پڑوس کے گھر میں بھولی رہتی ہے اور اس کی تین لڑکیاں ہیں ان کو راستے میں سے سوار کر لینا لیکن پہلے ان کو کہلا بھیجو کہ تم تیار ہو جاؤ اور جو پڑوس والیاں پہلے گئی تھیں میں نے سنا ہے کہ انھوں نے بڑی بے ربطیاں کیں جس سے میری سخت بدنامی ہوئی۔

چھٹو نے عرض کی حضور رنڈیاں جو سوار ہو کر جائیں گی اور بازار والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ خلیل خاں نے کہا میاں کام چلاؤ کام، اگر کوئی کہے کہ تمھارے منہ پر ناک بھدی ہے تو کیا میں کٹوا ڈالوں گا۔ اب چھٹو نے انچھو سے کہا کہ ایک گاڑی کرائے کی لے جاؤ، خلیل خاں بولے نہیں۔ جب وہ کپڑے پہن لیں تو گھنٹوں کے حساب سے دے دینا، اب چھٹو نے کشتیاں درست کیں، چوگھڑوں میں ٹھلیاں درست رکھیں، ایک سینی میں سہاگ پڑا، مہندی، بابا فرید کا پڑا اور اس پر سہاگ پٹارا ڈھانک دیا اور ایک کشتی میں نیچے ریت کا جوڑا اوپر چوتھی کا جوڑا، کھیلتی بوتی اور اس میں عطر کی شیشیاں مسی، مسّرے کی پڑیاں، چوکھونٹی، دو کنگھیاں رنگین لال سبز، تیل کی کُپی جس کے منہ پر تمامی کا کپڑا بندھا ہوا اور اسی کشتی میں گلاب اور کیوڑے کے دیسی شیشے جن پر سرخ اور زرد بند روم کا جال بُنا ہوا، شیشوں کے منہ پر زردوزی کپڑا ریشم اور کلابتوں کے ڈورے سے بندھا اور ڈوروں کے سروں پر بادلے کے پھندنے، اوپر کشتی پوش گوٹا، جس میں کلابتونی جھالر لگی ہوئی تھی ڈال دیا، ایک کشتی میں جڑاؤ زیور اور ایک سینی میں چنگیر پان دان، اس میں پھولوں کا گجرا اور اسی سینی میں چاندی کا خاص دان جس میں سات تھیاں سنہرے روپہلی ورق جن پر لگے، ایک سینی میں پانوں کے بیڑے، ایک میں پھولوں کے ہار اور پانچ قند سرخ کی تھیلیوں میں نقل اور ان پر گوٹہ لپٹا ہوا، میوے کی پانچ سینیاں، اب چاندی کی ٹھلیوں کو چوگھڑے میں رکھا تو ایک ٹھلیا میں تھوڑا سا سادہ پانی میں گھول کر ڈال دیا اور باقی میں تھوڑا تھوڑا شربت اور گلوں میں چاندی کی ٹھلیوں میں چاندی کی مچھلیاں باندھ کر اور چاندی کی طشتریاں ڈھانک دیں اور مٹی کی ٹھلیوں میں آٹے کی مچھلیاں باندھ کر اوپر سرپوش رکھ دیے اور رجو سے کہا کہ تو انچھو سے کہہ کہ دونوں خانگیوں کو سوار کرے اور خلیل خاں کی بہن کو چھٹو نے منت سماجت کر کے سوار کرایا، راستے میں خانگیوں کی گاڑی ہمراہ ہو گئی، اب یہ سامان الف خاں کے مکان پر پہنچا۔ سواریاں اُتروائی گئیں۔ چھٹو الف خاں کے پاس آیا۔ سواریاں اُتریں، ڈومنیوں نے طبلے پر تھاپ دی۔ گانا شروع ہوا خلیل خاں کی بہن اُتریں اور ان کے ساتھ خانگیاں۔ شربت پلایا گیا اب دلہن کو بلوایا، خلیل خاں کی بہن نے دولہن کو پہلے پھولوں کا گجرا اس کے بعد زیور پہنایا، اس کے بعد دلہن کے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی اور انگوٹھی کے آگے چھلا، اب خیال آیا کہ دلہن کے ہاتھ میں دینے کو روپیہ تو لائی نہیں کیا کروں، چھٹو کو بلواتی ہوں تو طول عمل ہے اس وجہ سے اپنے کان کی چاندی کی چٹکی ہوئی بالی اُتار کر دلہن کو دے دی اور کہا بیٹا روپیہ گھر جا کر بھجواؤں گی اور بالی منگوا لوں گی۔ دلہن والوں میں سے ایک عورت نے کہا جناب بالی کی کیا ضرورت ہے، خلیل خاں کی بہن نے کہا واہ تو واہ وا میرے بھائی کی شادی ہے میں بدشگونی کیوں کرنے لگی، تم اس میں نہ بولو یہ چٹکی ہو رہی، تھوڑی دیر میں چھٹو نے آ کر دروازے پر آواز دی کہ سوار ہو جاؤ پھر واپس آتا ہے۔ ادھر چھٹو نے سواریاں سوار کر کے روانہ کیں اور ادھر میاں خلیل خاں نے وہ جوڑا جو الف خاں نے بھیجا تھا حمام کر کے منگایا، سر پر کلاہ جس کی چوٹی پر سور کی دُم کے کتر یہ پروں کی کلغی اور اس پر لال

سیلا جھونے کلا بتوں کا گلے میں، جامہ کلیدار تاش کا جس کے گھیر پر دہرا جھوٹا سفید گوٹہ چوڑا ٹکا ہوا اور گلی ورگلی جھوٹی دھو ئیں سے رنگی ہوئی دھنک، کمر طوئی پر چار انگل پیلی اور پرانی نواڑ کی پیٹی اور اوپر اس کے لپیٹنے کو سفید ململ کا دوپٹہ جس پر شہاب سے افشاں اور جھوٹی ململ کا ڈھیلا کلیدار پاجامہ جس کا ایک پائنچا سفید، دوسرا نیلا بے گوٹ کا گھیتلا جُوتا چکی کے کام کا جس میں پیتل کے گھنگرو، دونوں طرف نوک سے ایڑی تک ٹکے ہوئے صرف ایک جُوتی میں، دوسری جُوتی سادے میٹھ کی، ہاتھ میں ہلدی کا رنگا ہوا رومال جس کے چاروں کونے سفید اور دو گز لمبی لوہے کی سلاخ جس کے سرے پر لال کلاوہ اور جنجی کوڑیاں لپٹیں۔ خلیل خاں نے جوڑے کو دیکھ کر کہا کہ یہ جوڑا میرے واسطے آیا ہے، خدمت گار بولے ہاں جناب، اُن کے ہاں کی رسم۔ خلیل خاں نے کہا یہ رسم بڑی واہیات ہے۔ غرض خلیل خاں نے یہ سب سامان زیب بدن کیا، پھر پھولوں کا گہنا پھر بدھی اس کے بعد طرّہ بائیں طرف سہلے میں لٹکایا اور سر پر سہرا پھولوں کا، اُس پر بادلے کا، پھر روئی کا۔ اس کے بعد خلیل خاں نے کہا کہ بھکّو کہاروں کے جمعدار سے کہو کہ ہمارے دادا صاحب والی پالکی جو میں نے اُس کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر اُسی صورت سے رکھا ہے کچھ رنگ روغن نہیں کرایا ہے اس واسطے کہ ہمارے دادا صاحب کے پردادا نے رنگوایا تھا، تیار کرو۔ غرض ملازم نے بھکّو کو آواز دی، کہ بھکّو پالکی لاؤ۔ غرض بھکّو نے پالکی کو جو ڈیوڑھی کی چھت میں بندھی ہوئی تھی، مندلی لا کر اُتارا اُس کے گھن کو جھاڑا، جگہ جگہ رسیوں سے باندھا اور کھٹولا جو ٹوٹ گیا تھا پالکی میں اُس کی جگہ تختے بچھائے، ان پر ایک تو شک ڈال دی، پشت کی طرف گاؤ تکیہ اور دونوں طرف گول تکیہ اور چھوٹی سی قالین پرانی جس کو خلیل خاں نے حکم دیا کہ اس کو تہ کر کے رکھ دو تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ قالین بھی ہے، بچھائی نہیں، اب جمعدار نے پالکی کے گرپ (۱) اور تھوپ (۲) کے ڈنڈوں میں گدیاں ڈالیں اور پالکی مردانہ مکان میں لا کر رکھی۔ خلیل خاں نے کسی کو اپنی شادی کی اطلاع اس وجہ سے نہیں دی تھی کہ کوئی جا کر الف خاں سے یہ نہ کہہ دے کہ خلیل خاں بڈھے ہیں، باورچی خانے میں خلیل خاں نے کچھ نہیں پکوایا کہ دلہن کے ساتھ جوڑے کا کھانا آئے گا وہی کافی ہوگا، اس عرصے میں رات کے آٹھ بجے اور چھٹو نے آ کر سلام کیا اور کہا کہ جناب حضور کے اقبال سے تمام کام خادم انجام دے آیا۔ خلیل خاں نے کہا کہ بس تو پالکی لاؤ۔ یہ کہہ کر خلیل خاں لکڑی پکڑ کر اٹھے لیکن بہ تمکنت جس طرح پہلے لپیٹ لیا تھا اب پھر اسی طرح سے لپیٹا اور پالکی میں سوار ہوئے، کہاروں نے پالکی کاندھوں پر اٹھائی، پالکی نے ہر قدم پر چرچوں چرچوں کرنی شروع کی جمعدار نے تھوپ کے کہار یعنی اگلے کہاروں سے کہا بولتے چالتے چلو، آگے کے کہاروں نے کہنا شروع کیا دھمک ہے، ہیرا ہے، چوماسہ ہے، ٹھوکر ہے بھائی، قدم قدم پر آواز دینی شروع کی، ایک راستے میں سخت کیچڑ تھی، ایک کہار کا پاؤں پھسلا اور جھٹکا لگ کر ایک تختہ نکلا اور پچھلا ڈنڈا گرپ کا ٹوٹا خلیل خاں کیچڑ میں گر کر لتھ پتھ ہو گئے۔ ملازموں نے دوڑ کر اُٹھایا، خلیل خاں بڈھے آدمی، سردی کا زمانہ ابر چھایا ہوا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سرسراتی

ہوئی اوپر سے چوٹ سخت، یہ بیچارے کانپنے لگے، قریب ہی ایک حلوائی کی بھٹی سلگ رہی تھی، بازار کے لوگ تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے، حلوائی نے آواز دی کہ دولھا میاں کو بھٹی کے پاس لے آؤ کہ ذرا سینک لگ جائے خلیل خاں سردی سے کانپتے کیچڑ ٹپکتی بھٹی کے سامنے کھڑے ہوئے، حلوائی نے موٹے موٹے دو تین کیکر کی جڑوں کے کندے اور بھٹی میں ڈال دیے گھنٹے بھر میں کپڑے بھربھرے ہوئے۔ ادھر کہاروں نے دوڑ کر پرانی سال کی پٹی پچھلے ڈنڈے میں باندھ دی۔ خلیل خاں سوار ہوئے، اب پھر برات چلی یہاں الف خاں صاحب نے برات کے واسطے مردانہ مکان درست کر لیا تھا اور اپنے دوستوں کو تماشا دکھانے کے لیے بلوا لیا تھا اور یہ خیال تھا کہ میاں خلیل خاں معقول برات لائیں گے، جب برات آئی تو چار خدمت گار چار کہار ایک جمعدار اور دولھا کی پالکی جس کے گرپ کے ڈنڈے میں سال کی پرانی پلنگ کی پٹی بان کی رسی سے بندھی۔ مشعل ساتھ نہ پہنچی، بقول شخصے "میں اور میرا بھائی حجام اور نائی۔" الف خاں نے آواز دے کر کہا کہ لڑکے کی پالکی اب فرش لے آؤ، کہاروں نے لب فرش پالکی کو رکھا، رجو نے اور انچھو نے دوڑ کر دولھا کو اتارا، الف خاں کے مہمانوں نے دیکھا دولھا کی ایک شق کیچڑ میں لت پت اور دوسری طرف بھی دھبے لگے ہوئے ہیں، دولھا ٹانگ پھیلا کر مسند پر بیٹھے، تھوڑی دیر میں قاضی صاحب تشریف لائے اور دو گواہ، نکاح نامہ پہلے ہی سے لکھ لیا گیا تھا، اب دولھا کو اندر بلایا گیا۔ قاضی صاحب دس منٹ کے بعد باہر آئے اور خلیل خاں صاحب کے کان میں چپکے سے کہا قدسین النسا عرف فاختہ بنت الف خاں زیرآلو کو بالعوض پچیس لاکھ روپے کے آپ نے اپنی زوجیت میں لیا اور قبول کیا۔ خلیل خاں بولے تو نہیں لیکن ہوں کردی اور دل میں خوش ہو کر کہا کہ خلیل خاں اس فاختہ کو جلدی اڑا کر لے چلو اور اس مثل کو لوگوں کے دلوں سے بھلا دو کہ اکثر یہ مشہور کرتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا جو خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے، تم اڑا کر دکھا دو اور کہہ دو کہ اڑتے نہ تھے بلکہ اڑا لایا کرتے ہیں۔ نکاح ختم ہوا اور شہدوں نے کھڑے ہو کر ایک آواز دی کہ سازگاری ہو۔ سب نے مل کر کہا الٰہی آمین، ایک بولا الٰہی سونے کی سہرے بیٹا ہو، پھر سب نے مل کر کہا الٰہی آمین، خلیل خاں نے چنو کو بلا کر کان میں کہا کہ ان کو ایک ایک پیسہ پہلے دو۔ اگر نہ مانیں تو خیر دو پیسے دے دینا کہہ دو کہ اب تو چپ چاپ چلے جاؤ جب بیٹا پیدا ہو گا تو تم کو ایک آنہ دے دیں گے۔ چنو دو پیسے لے کر گیا۔ اور شہدے کے ہاتھ میں دو پیسے دے کر کہا لو اب تو خوش ہو جاؤ تم کو انعام مل گیا۔ شہدے نے روشنی میں پیسوں کو دیکھ کر کہا لو میاں ان کا تمباخو لا کر مہمانوں کو پلا دو۔ چنو نے براتیوں کو لاگتے بھلا لگتے کہا بھائی جان تم میں سے کسی کو نہیں بلایا شہدوں نے کہا ہماری طرف سے یہ رقم منہ دکھائی میں دے دینا، خلیل خاں نے یہ سن کر کہا نکال دو ان گستاخوں کو، اور سب رقم واپس لے لو، شہدے نے یہ سن کر مسند کے قریب پیسے پھینک دیے اور کہا لو او دھنی جی لو یہ رقم۔ گن لو اور ہمارا اچھاڑا ابھی لے لو کام آئے گا۔ غرض شہدے تو کوستے ہوئے روانہ ہوئے اور چنو نے چھواروں کی جگہ اتفاقاً ایک تر کھجور کا درخت گھر میں ہے، اس میں

سے جنتی کھجوریں بچی کچی کانزی کھدری گری ہیں، خلیل خاں نے پہلے ہی جمع کرا رکھا ہے جو برسوں کی ہیں جن میں سوائے گٹھلی اور خشک چھلکے کے کچھ نہیں، وہ بھی سوا سیر تول کر خلیل خاں کے حکم سے رومال میں باندھ لی تھیں، ان کو چاروں طرف پھینک دیا۔ جس بچے نے منہ میں اٹھا کر رکھی تو تھوک دیا۔ اس عرصے میں شربت آیا اور گلاس دولھا کے آگے رکھا، دولھا نے گلاس اُٹھا کر پینا شروع کیا، پچو سمجھا کہ دولھا اپنا جھوٹا شربت گلاس میں چھوڑ دے گا جب پچو نے دیکھا کہ دولھا نے گلاس خالی ہی کر دیا۔ ہر چند اس نے اُوں ہُوں کی لیکن خلیل خاں ذرا اونچا بھی سنتے تھے، سب پی گئے۔ پچو نے اشارے سے پوچھا کہ جناب نے شربت نہیں چھوڑا۔ خلیل خاں نے کہا کہ دلہن کے واسطے اور بنا دو، اب شربت پلانے والا منتظر رہا کہ دولھا شربت پلانے کا کچھ تھالی میں دے گا۔ خلیل خاں نے شربت پی کر ایسی نیچی نظر کی کہ سر نہ اُٹھایا الف خاں صاحب نے شربت پلانے والے کو کہا کہ ہٹ جاؤ۔ اب تھوڑے عرصے میں آواز آئی کہ دولھا کو اندر لاؤ۔ انچھو نے گودی میں اُٹھایا۔ الف خاں صاحب سے کسی کمبخت نے یہ کہہ دیا کہ دولھا کی ٹانگ اچھی ہے۔ صرف یہ جو کچھ کرتے ہیں عذر لنگ ہے۔ الف خاں نے انچھو سے کہا کہ بھائی ہمارے گھرانے کا یہ دستور ہے کہ دولھا بے کسی کے سہارے ایک ٹانگ سے جائے خیر یہ عزت دار ہیں دونوں ٹانگوں سے سچ اور درد ہے تو خیر نکاح تو ہو لیا جب ٹانگ اچھی ہو وداع جب ہو گی۔ خلیل خاں کو تاب کہاں تھی انچھو سے کہا پکڑ کر بٹھا دو اور پچو سے کہا ہماری لکڑی لاؤ۔ پچو جانتا تھا کہ میاں تو گودی میں جائیں گے اس وجہ سے میاں کی لکڑی ساتھ نہیں لایا، اب پچو گھبرایا اور خلیل خاں کو غصہ آیا اور پچو سے کہا تو سخت نمک حرام ہے، اچھا ہماری پالکی کے کہاروں سے لکڑی لے آؤ۔ رجو یہ سُن کر دوڑا اور موٹے سے بانس کی پھٹی ہوئی میلی لکڑی جو کئی جگہ سے لوہے کے تار اور پردار کیڑے کے گھر سے بندھی ہوئی اور سر پر لکڑی کے کاٹ کی پھٹی ہوئی چڑیا تھا لا کر دی۔ خلیل خاں لکڑی کے سہارے کانپتے رعشے سے تھرّاتے کئی دفعہ ہمت کر کے ایک ہاتھ لکڑی پر دوسرا ہاتھ زمین پر زور دے کر اُٹھے اور پھر چوتڑوں کے بل بیٹھ گئے۔ ادھر سردی، اُس پر غصہ، سونے میں سہاگہ، علاوہ اس کے الف خاں صاحب نے جو جامہ بھیجا تھا وہ ٹخنوں سے بھی نیچا۔ اب خلیل خاں صاحب جو جھک کر چلے تو جامہ پاؤں کے نیچے آیا اور خلیل خاں اُس میں اُلجھ کر گرے، اتفاقاً ایک گنجا جس کا سر گنج بجایا ہوا اور بارش کی وجہ سے کچھ رطوبت بہ رہی ہے، پانچ چار کھرنڈ کھجانے سے اُکھڑ کر لال لال گوشت چندیا کا نکل آیا ہے اور خون بہہ رہا ہے، اور پر زخموں کے مکھیاں محال کی طرح سے سر پر لپٹی ہوئی بھنبھنا رہی ہیں، جب یہ ہاتھ سے اُڑاتا ہے تو سر کے گرد چکرا کر پھر آ بیٹھتی ہیں، یہ بچارا ٹوپی اُتارے اپنا گنج کھجا رہا تھا کہ خلیل خاں کا منہ اُس کے گنج پر پڑا اور کچھ کھرنڈ اس صدمے سے اُکھڑ کر خلیل خاں کے منہ اور گلوں پر لگ گئے اور ایک کھرنڈ ان کی باچھ پر چپکا۔ انھوں نے جو زبان سے کھرنڈ کو ٹٹولا تو وہ کھرنڈ ضعیفی کی لیس دار رطوبت سے اور کچھ پیپ کی وجہ سے زبان پر چپکا۔ خلیل خاں نے چاہا کہ تھکار دیں یہ خیال

کر کے جو زبان منہ کے اندر کی تو کھرنڈ منہ میں جس کا سلونا سلونا مزہ جیسے کچوری کی جلی ہوئی کھرچن کا ہوتا ہے جس سے تمام منہ سلونا ہو گیا تو ان بیچارے نے کھرنڈ کو ہاتھ سے نکالا اور غصے میں آ کر چٹکی میں خوب رگڑ کر ملا اور جھٹکے سے پھینکا تو ایک صاحب کسی سے بات کرتے تھے ان کے دانت پر جا چپکا، اب لوگوں نے خلیل خاں کو اٹھایا لیکن دونوں دانت اس صدمے سے حلق کی طرف جھک گئے۔ اب دونوں طرف سے اور براتیوں نے ان کے بازو پکڑے اور زنانی ڈیوڑھی تک لائے اور پردے کے اندر داخل کیا، اندر زنانے میں خلیل خاں کی بہن ان کی منتظر دروازے کے قریب کھڑی تھیں سر پر بخاری ابرے کی دو سیر روئی کی رضائی تھی، اُسی کا آنچل اُن کے سر پر ڈالا اور ایک محلے کی جلاہی جو مبارک باد کے رُقعے کے ساتھ آئی تھی اُس کے سر پر میلی رضائی سیر بھر روئی کی تھی، جس کا موٹا گاڑھا اور اُس پر لال بنکیاں کا لا حاشیہ تھا اُس نے بھی حق ہمسایہ ماں کا جایا سمجھ کر پلّہ کیا آدھی سے زیادہ رضائی ڈال دی اب تو وہ نقشہ ہو گیا "مرتے کو ماریں شاہ مدار" خلیل خاں بوجھ سے اور بھی جھک گئے۔ لکڑی کا سرا سر سے اونچا ہو گیا اور دونوں رضائیوں کے پلّے لکڑی کے سرے پر آ گئے۔ اب خلیل خاں کا ادھر تو بوجھ سے بُرا حال یہ ہوا بند سانس رُکنے لگا اور اُس پر طرّہ یہ کہ جلاہی کی رضائی پر رات ہی کو چھچھوندر پھر گئی ہے، اس وقت عجب لطف نظر آیا، ادھر تو رعشے سے ہاتھ کانپ رہا تھا جس کی وجہ سے لکڑی اور ادھر سر کی حرکت دائیں بائیں اور لکڑی کی حرکت آگے پیچھے، اُدھر خلیل خاں کے چوڑ سرے کچھ اونچے جو قدم بڑھانے میں اونچے نیچے ہو رہے تھے مہمان عورتوں نے جو یہ شان دولہا کی دیکھی ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ خلیل خاں نے جو ہنسی کی آواز سُنی تو اپنی بہن سے پوچھا یہ عورتیں کیوں ہنستی ہیں۔ انھوں نے کہا اے چھچھوری لڑکیاں ہیں۔ خلیل خاں بولے انھیں منع کرو اور یہ بتاؤ وہ جگہ جہاں ہم جا کر بیٹھیں گے کتنی دور ہے کیوں کہ منہ ڈھکا ہوا ہے اُس پر رضائیاں خلیل خاں اپنی بہن کے اشارے پر چلے جاتے ہیں۔ جب صحن چبوترہ سے گزر کر دالان کے صدر میں آئے جہاں پردے کے پیچھے دلہن تھی خلیل خاں کی بہن نے اُن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا یہ بیٹھتے تھے کہ گھوڑا پچھاڑ نے خاص دان کا ڈھکنا ان کے چوتڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ خلیل خاں جو بے فکری سے بیٹھے تو ڈھکنے کا ٹنڈا ان کے چوتڑوں میں گھس گیا یہ ہائے کہہ کر کروٹ کے بل ہو گئے۔ ایک عورت نے ان کے چوتڑوں میں سے ڈھکنا نکالا اور کہا ہے ہے یہ ڈھکنا کس کمبخت نے رکھ دیا کہ دولہا کی بُری جگہ گھس گیا۔ گھوڑا پچھاڑ بولی واہ جی واہ کمبخت کیوں کہتی ہو دولہا کوئی کا نرا اندھا تھا جو ٹٹول دیکھے نہ ٹھکانا چوتڑ دے مارے اور پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ کیا نتاں کا گھر سمجھا تھا۔ غرض ایک ڈومنی پردے کے پاس آ کر بیٹھی اور دلہن کے دونوں ہاتھ باہر نکال کر اُن میں نہایت پرانی شکر جو تیج ہو گئی تھی اور کالے تل رکھ کر خلیل خاں سے کہا کہ لو منہ جھکاؤ دولہا، اور ادھر ڈومنیوں نے گانا شروع کیا۔

کھانڈ چاٹ لے بنے کھانڈ

اے جوں جوں بنا کھانڈ چاٹے دوں دوں بنی پوت جنے

کھانڈ چاٹ لے بنے کھانڈ

خلیل خاں نے منہ جُھکا کر کھانڈ چاٹی، ڈومنی نے جو دلہن کے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو کالے تل اور شکر جو ان کی رال سے تر ہو گئی تھی وہ تمام داڑھی اور گلوں، ناک کے نتھنے اور پلکوں پر لپٹ گئی۔ خلیل خاں نے منہ داڑھی اور پلکوں کو رومال سے پوچھا، اب دلہن کو تو اندر کوٹھڑی میں لے گئے۔ اب خلیل خاں نے زنانی محفل پر نظر ڈالی تو اس وقت کا سماں، وہ آدھی رات جس کی شام کو مہاوٹ کا مینہ برسا ہے، بادل پھٹ کر آسمان صاف دُھلا نکل آیا ہے اور بادل کے ٹکڑے چاند کے قریب آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں اور کہیں کہیں سے جو بادل پھٹ گیا ہے تو تارے جھلملاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں، یہاں صحن میں مکان کے چمن اور اُس کے بیچ میں سنگِ مرمر کا حوض جس کے چاروں طرف نہریں جن کی لبِ گرداں سے پانی چھلک رہا ہے اور روش اور پٹریاں جن کے اوپر فواروں اور ہزاروں کی ہلکی ہلکی پھوار سے تر ہیں۔ ان میں چاند کا عکس اور قریب کے درختوں کے سائے نظر آتے ہیں، چھوٹے چھوٹے پودوں میں پھول کھلے، پانی جو بارش کا کیاریوں میں بھر گیا ہے۔ اُس میں دالانوں کی روشنی کا عکس اور درختوں کے سایہ آہستہ آہستہ حرکت کرتے عجیب لطف پیدا کر رہے ہیں، آسمان سے زمین تک نور، نہروں اور پٹریوں کا پانی، در و دیوار سفید، جگہ جگہ دیواروں میں گلاس اور کنول روشن، غرض زمین نور کی آسمان نور کا اور دالانوں، سہ دریوں اور کمانچوں، صحنِ چبوترہ، شہ نشین، وہ باشموں میں مہمانوں کا ہجوم شادی کی دھوم دھام، پان دانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے کھٹاکے۔ چوڑیوں اور پازیب اور جھانجھوں کی جھنکاریں، وہ اُن کے بناؤ۔ شعر

مہمانوں کا وہ بناؤ سنگار
عالمِ حُسن کی وہ اُن کے بہار

غرق سب موتیوں کے زیور میں
غوطہ زن بحرِ آبِ گوہر میں

چوٹی گندھواتی تھی کہیں کوئی
مسّی ملتی تھی ناز سے کوئی

بند محرم کے کوئی کسواتی
کوئی جوڑے کو اپنے بسواتی

کوئی کہتی کہ روشنی لاؤ
کوئی کہتی کہ پالکی منگواؤ

کوئی کہتی کہ بھلا بی آتے ہیں
کوئی کہتی کہ پان کھاتے ہیں

کوئی کہتی کہ سمدھنوں آؤ
رتھ کھڑے ہیں سوار ہو جاؤ

کوئی لونڈی پر اپنی جھنجھلاتی
کہ گوڑی یہاں نہیں آتی

کوئی کہتی کہاں گئی سنبل — کوئی کہتی کہ نوج ایسا غل
بالا خانے سے کوئی ماہ جبیں — کہتی تھی کیا ہُوا چلو گی نہیں
تم تو بے فکری سے کھڑی ہو یہیں — ابھی چلنا بھی ہے کہیں کہ نہیں
کوئی بولی اری جہاں آرا — خالہ لتاں کو جا کے جلدی لا
چہلیں آپس کی وہ شباب کے دن — کوئی اُن میں جواں کوئی کمسن
چلبلا پن طبیعتوں میں بھرا — باغِ حُسن و جمال سب کا ہرا
دل میں ایک ایک کے حسرتوں کا ہجوم — ایک عالم میں اُن کے حُسن کی دھوم

دالانوں میں قالین ایرانی کا فرش اور روشنی کا سامان جھاڑ۔ فرشی، بلوری، سنگی، ہانڈی، ہنڈے، قندیل، دیوار گیری، محرابی، سردیواری، گلاس۔ قمقمہ، شفق، چادر، فانوس، مردنگ، لالہ، کنول، سروچراغاں یکے حباب، گلابیاں، مع شمع ہائے موی وکافوری روشن۔ مبارک سلامت کا غل اس عرصے میں ریت کا پاجامہ آیا اور کمر بند ڈومنی نے ڈالا اور خلیل خاں نے انگلی سے کمر بند کھینچا، پاجامہ اندر گیا۔ دولہن کو پہنایا۔ اب غل ہوا دلہن کو لاؤ چنانچہ دلہن کو گود میں لے کر ایک عورت نے خلیل خاں کے پاس بٹھایا، دلہن کچھ تو قدرتی جھکی ہوئی تھی ہی کچھ شرم کے بوجھ سے اور بھی جھک گئی، ادھر تو دلہن کا سر رعشے سے اقراری ہلتا ہوا یعنی ہاں ہاں اور اُدھر دولھا کا سر دائیں بائیں ہلتا ہوا نہیں نہیں، اس وقت کا لطف کچھ وہی نگاہیں لے سکیں جو شریک تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دو طوطے کے چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے آمنے سامنے بیٹھے ایک ایک سے دانہ مانگ رہے ہیں۔ دونوں سہروں کی لڑیاں لگاتار حرکت سے فرش پر لوٹ رہی ہیں۔ مہمانوں کی یہ حالت ہے کہ ایک ایک ہنسی کے مارے پیٹ پکڑ پکڑ کر فرش پر بچھی جاتی ہے۔ اب ڈومنیوں نے غزل شروع کی۔

جب او گلی میں سر دیا اقرار کیا انکار کیا
جب آپھنسے تب آپھنسے اقرار کیا انکار کیا

اب ایک ڈومنی نے ایک ڈلی مصری کی لے کر دلہن کے داہنے شانے پر رکھی اور خلیل خاں سے کہا لو ڈلی کھاؤ۔ خلیل خاں نے جو منہ سے مصری کی ڈلی اُٹھانی چاہی تو دانت نہ ہونے کی وجہ سے رال منہ کی اور تمام شانہ دلہن کا تر ہو گیا لیکن دانت کس کے لائیں جو چبائیں، ہر چند بلبلایا لیکن ڈلی کب نگلتی تھی، ڈومنی نے دوسری ڈلی دوسرے شانے پر رکھ کر کہا لو میاں کھاؤ، خلیل خاں نے اشارہ کیا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ڈومنی بولی کیا میاں دانت نہیں جو ڈلی چبائی نہ گئی، گھوڑا بچھاڑ نے کہا دولھا گوڑا اتنا ننھا سا ہے کہ ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں نکلے۔ بیویوں اللہ رکھو تھیلیاں رکھ رہا ہے، ابھی بیہوشی کا زمانہ ہے آخر بچہ تو ہے ہی، مردانے میں بیٹھے بیٹھے مُوت دیا۔ یہ

ان کی بہن ساتھ ہیں، ان کو مناسب تھا کہ پاؤں پر بٹھا کر سلام کر لیتیں، ہاتھ کا اشارہ کرکے کہا دیکھو ساری میانی تر ہے ڈومنی جو پاس بیٹھی تھی اس نے پھیلی ہوئی ٹانگ کو اتنا او نچا کیا کہ اُدھڑی ہوئی گیلی میانی اور نکھر یائے ہوئے چوتڑ سب نے دیکھے، ایک بولی بچپن کی وجہ سے اللہ رکھو میانی ابھی نہیں لگائی جاتی، دوسری بولی کہ لاؤ دولھا کا پاجامہ اُتار دو کہ طویلے کے الاؤ پر سوکھ جائے گھوڑے کے چوتڑ سیل " سے سب ہنگوی بیر بن گئے۔ یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خلیل خاں نے اس ڈلی کو منہ میں رکھ کر چاہا کہ دوسری ڈلی کو اٹھالوں لیکن پہلی ڈلی رال میں لپٹی ہوئی دلہن کے آگے گر پڑی، غرض اسی طرح سات ڈلیاں اُگل نگل کر کھائیں اب سہاگ پڑا اور سل بٹا آیا۔ سروج پیسنے کو سہاگ پڑے سے ڈومنی نے مصالحہ نکال کر دیا۔ دولھا نے پیسا پہلے دلہن کی مانگ میں لگایا، دلہن کو رعشے اور دولھا کا ہاتھ کانپتا ہوا بجائے مانگ کی دولہن کی آنکھ میں انگلی گئی۔ لیکن دلہن کی آنکھ اتنی دھنسی ہوئی ہے کہ انگلی آنکھ کے ڈھیلے تک نہ پہنچی، اب سات سہاگنوں کو بلایا، دولھا نے سب کی مانگ میں سروج لگایا، کئی کنواری لڑکیوں کی چوٹیاں کھولیں اب آرسی مصحف کا وقت آیا تو ان کے جہیز کا پلنگ تھا ہی نہیں اس وجہ سے الف خاں صاحب کے پلنگ پر تجویز ہوئی کہ اس پلنگ پر دلہن کو آرسی مصحف کے واسطے لے آؤ اور دولھا سے کہا کہ دلہن کو گود میں اُٹھا کر پلنگ پر لے چلو۔ خلیل خاں نے کہا کہ میری کمر میں درد ہے اس وجہ سے سیدھا نہیں ہوا جاتا اس وجہ سے میری چڈھی یعنی کمر پر بٹھا دو، غرض خلیل خاں کی پشت پر دلہن کو سوار کرایا۔ خلیل خاں نے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ لیے اور لنگ کرتے چلے، عورتیں دلہن کو پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ ہولیں کہ گھوڑا پچھاڑ نے خلیل خاں کے پیچھے آ کر جیسے بیل ہانکنے والے بیلوں کی دُم کے نیچے رانوں میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں، گھوڑا پچھاڑ نے بھی خلیل خاں کی رانوں میں ہاتھ ڈال کر ملا اور ہنکاری دی خلیل خاں اس کے صدمے سے آہ کر کے سیدھے ہوئے تو دلہن پیٹ پر سے ایک کھلی ہوئی پٹاری پر گری، ہائے ہائے کہہ کر لوٹ گئی۔ ایک عورت نے گھوڑا پچھاڑ سے کہا واہ واہ خوب یہ تم نے کیا، گدھا سمجھا۔ گھوڑا پچھاڑ بولی تو کیا کیا جائے گھوڑا کاڈوری چلتا ہی نہیں۔ خلیل خاں نے ایک ہاتھ تو دلہن پر رکھ لیا اور بگڑ کر بولے واہ واہ واہ یہ کیسی ہنسی، ایک عورت نے ترخ کر جواب دیا کہ دولھا میاں یہ تمھارا ناحق کا بگڑنا ہے آج کل کی چھوکریاں ایسی ہی چنچل ہوتی ہیں اور سالیوں کے چھیڑنے پر بگڑو گے تو تم کو پور پور پر نچائیں گی، دوسری نے کہا اے اوئی اتنی سی بات پر بگڑنا ہی کیا تھا۔ گھوڑا پچھاڑ نے کہا یہ اوپر تلے کے ہیں ایسا ہی ہوتا ہے دولھا میاں بیر نابالغ ہیں یہ کیا جانیں انھوں نے شادیاں کی ہیں ان کا بیاہ تھوڑی ہوا، اس میں تو یہ اُلّو کا اُلّو ہے آخر بہزار خرابی دولھا دلہن کو روبرو بٹھا کر رضائی دونوں پر ڈال دی کہ بالکل اندھیرا ہو گیا اور آئینہ اور قرآن شریف بیچ میں رکھا گیا۔ دولھا نے گھونگھٹ اٹھایا ڈومنی نے سر سے سر ملایا۔ خلیل خاں نے ایک آنکھ سے ہر چند دیکھا کہ دلہن کی صورت دکھائی دے لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ نہ دیکھ سکے۔ گھوڑا پچھاڑ نے دولھا کے سر کو رضائی سے ڈھکتے ہوئے اور جلتے

ہوئے دیکھ کر ایک چپت ایسا رسید کیا کہ دولھا دلہن میں معقول تکرار ہوئی۔ خلیل خاں نے جھنجھلا کر کہا کہ یہ مار پیٹ کیسی میرے تو خیر لیکن ان کے چوٹ لگی۔ گھوڑا پچھاڑ بولی اے مردوئے عورتوں کی دھول سے چیں چیں کرتا ہے آگے تجھ سے کیا ہوگا ان کی تو بڑی ماستا ہوگئی ذرا سی دیر میں ہے ہے ہماری بچی تو ڈوب گئی۔ اب ڈومنی نے دونوں کے سر سے رضائی اُتاری اور دولھا سے کہا میاں تمھاری ساس سامنے کھڑی ہیں ان کو سلام کرو۔ الف خاں کی مصنوعی بیوی نے کہا کہ میاں تمھاری دلہن سے میرے گھر کے بڑے کام وابستہ تھے، ہمارے گھر کا کونہ خالی ہوگیا۔ اب تم کو اختیار ہے لیکن ایک پیسہ سلامی کا نہ دیا۔ اب خلیل خاں نے اپنی بہن کو بلا کر چپکے سے کہا کہ بھگو کہار سے پوچھو کہ دولھا دلہن کا بوجھ پالکی اُٹھالے گی یا نہیں ورنہ اور کچھ بندوبست کریں۔ خلیل خاں کی بہن نے چھٹو سے کہا، چھٹو نے بھگو سے دریافت کیا۔ بھگو بولا کہ جناب اس پالکی میں تو ہمیں صرف دولھا کے لے جانے میں بھی تکلف ہے نہ کہ دلہن، یہ خبر خلیل خاں کو ان کی بہن نے جا کر سنائی، خلیل خاں نے کہا چھٹو سے کہو کہ ایک پالکی کا اور بندوبست کرے۔ چنانچہ پالکی آئی اور خلیل خاں نے دلہن کو پیٹھ پر بٹھایا پالکی میں سوار کیا اور دونوں پالکیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں، خلیل خاں کو خیال آیا کہ بیس لونڈیاں سنڈیاں کھانے والی ساتھ ہوں گی اس وجہ سے سر باہر نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سڑک پر سناٹا ہے سوائے چار خدمت گاروں کے اور ایک جمعدار اور دونوں پالکیوں کے آٹھ کہار ان کے سوا کوئی نہیں، یہ دیکھ کر خلیل خاں بہت خوش ہوئے اور دل میں کہا کہ اب اگر لونڈیاں آئیں گی تو میں ایک کو بھی گھر میں گھسنے نہ دوں گا۔ غرض اس عرصے میں گھر آ گیا، باہر سواری ٹھہری اور خلیل خاں نے کہا کہ پہلے اندر جا کر روشنی کر دو اندھیرا ہے۔ رجو نے اندر جا کر روشنی کی۔ خلیل خاں اندر آئے اور یہاں گھوڑا پچھاڑ نے خلیل خاں کے مُزّے لینے کا ارادہ پہلے ہی سے کر لیا ہے اور جب اُس ارادہ کا خیال کرتی ہے تو خود ہی ہنسی کے مارے لوٹ جاتی ہے اور دل ہی دل میں کہتی ہے کہ جس وقت الف خاں کے روبرو خلیل خاں شکایت کریں گے، ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے اور وہی کیا جو سُنے گا ہنسی کے مارے بے تاب ہو جائے گا۔

پاجی پڑوس

میر باقر علی

پڑوس برابر ہی کے گھروں کو نہیں بلکہ چالیس چالیس گھر چاروں طرف ہمسایہ ہی میں داخل ہیں اور اس کے درے پرے بھی محلے کا حق ملحوظ رکھا جاتا ہے اور سب سے زیادہ اُس پڑوس کا حق ہے جس کا دروازہ اپنے دروازے سے قریب ہو اور دیوار بیچ کو ہمسایہ کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے درد دُکھ، شادی غمی میں یہی پڑوس کام آتا ہے مثلاً آگ لگے، مکان گرے علاوہ اس کے ہر قسم کا کام کاج، سودا سلف اور عزیز ان قریب یا عنقریب ان کو تو خبر بھی ہوگی کہ یہاں کام انجام پا جائے گا تو اس سے ظاہر ہے کہ عزیزوں سے پڑوس زیادہ مفید ہے اسی وجہ سے حق بھی زیادہ ہے۔ 1857ء سے پہلے جو برتاؤ پڑوس کے تھے ان کو تو مغربی تعلیم نے پرانی لکیر اور فضول ثابت کیا اور ٹھنڈے ملک کی جو جو ضرورتیں تھیں ان کو پیش کیا۔ یہاں کے مراسم یہ تھے کہ محلے کی بیٹی سب کی بیٹی، جو بڑی عمر کی عورت ہوتی نانی یا دادی کہہ کر مخاطب کرتے۔ اس سے کم کو چچی، بہنی غرض عمر کے لحاظ سے رشتہ پکارا جاتا تھا اسی طرح مردوں میں دادا، چچا کہتے تھے اور جب آمنا سامنا ہو جاتا تو چھوٹا ادب سے جھک کر نہایت ہنس مکھ اور خندہ پیشانی سے ملتا تھا کہ ملنے والا یہ سمجھ لیتا تھا کہ یہ مجھ سے مل کر بہت ہی خوش ہوا اور دلی میں یہ دستور تھا کہ جب سے بچہ مکتب یا سال میں گیا استاد نے پہلے ہی دن سے کہا دیکھو پاؤں نہ پھیلاؤ، بیجا حرکت نہ کرو، نچلے بیٹھو۔ کسی بڑے کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالو یا کرسی یا مونڈھے پر بیٹھ کر گھٹنوں کو اس طرح حرکت نہ دو جس سے کوئی یہ سمجھے کہ گھٹنوں کو حب لرزہ ہے۔ ہمارا ملک گرم ہونے کی وجہ سے یہ جلد حرکت کرنے والا ہے۔ یہاں سکون کی تعلیم ایک حد تک درست ہے اور ٹھنڈا ملک بوجہ قبض و جمود خود۔ بطی الحرکت ہوتا ہے۔ وہاں کی تعلیم اس کے خلاف ہے وہ یہ کہ تم آزاد ہو کسی کی پروانہ کرو، اپنا کام کرو تمھیں کسی سے کیا۔ یہاں فروتنی سچائی، آپس میں ہمدردی پہلا فرض تھا۔ اس تعلیم نے یہ جو ہر ہم سے الگ کر دیا جس سے ہم آزاد ہو کر کہیں کے نہ رہے۔ اب میں اصل مطلب کی طرف

آتا ہوں۔ بہادر شاہ بادشاہ او کھڑی چینٹ، گئی گذری حکومت، سلطنت محتاج، کمپنی کا راج ڈونڈی کا فقرہ۔ خلق خدا کا، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی ملکہ معظم بادشاہ زادی کا پکارا جاتا تھا لیکن اُس وقت تک بھی شہر کے رہنے والے خوشحال محلوں میں گھما گہمی۔ راجا پرجا سکھی، سیدھا (سیدھا) سادہ لباس سادی غذا جس کو معدہ ہضم کر کے جزو بدن بنا لیتا تھا۔ فرصت اتنی کہ اپنے ملک کی کسرتوں کو لازمی سمجھ کر سیکھتے تھے، وہ کسرتیں یہ تھیں۔ بنوٹ۔ پھکوی۔ بیلیا۔ ناگ سوٹ۔ بن توڑ۔ دھارانی۔ بکیتی۔ کریتی۔ بانک۔ پٹا۔ جنوتی۔ جج وتی۔ رستم خوانی۔ کرنا تک، علی مد۔ شیرر۔ شیر بیکر۔ لیلیتی۔ علاوہ ان کسرتوں کے لیزم۔ مل ڈنٹر۔ مل کھم۔ سنتولہ۔ مگدر۔ بیک۔ کریلے۔ نال۔ گود بکل۔ نالیاں۔ نال ہمارے ملک کے واسطے وہ کسرت بہتر ہے جو ایک سانس میں ہو اور بدن کو جھکانا نہ لگے۔ اس ملک میں جب بھاگ دوڑ کی کسرت ہوگی پھیپھڑوں پر ہوا کا دباؤ سانس پھولنے سے زیادہ ہوگا۔ اکثر بچے جن کو میں جانتا ہوں فٹ بال کی معرفت خون تھوکنے لگے ہیں اب کیا اچھا ہونے کی امید ہے اور ڈنٹروں کی بھی یہ صورت ہے کہ جس کی آنکھیں کمزور ہوں گی ڈنٹروں سے زیادہ خراب ہو جائیں گی اور بیٹھک لگانے والے کو مرض جریان ہو جائے گا۔ ہاں کُشتی بہتر ہے، اس سے بدن بنتا ہے اور اعضا میں قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور مالش اور چپی سے اعضا غذا بھی زیادہ حاصل کرتے ہیں۔ کسرت سے یہ غرض نہیں ہے کہ پہلوان ہو کر بادشاہی صدی بنیں کہ کھایا اور اینڈ رہے ہیں اور جب جی چاہا کسی کے پاس چلے گئے! اور کہا میاں دودھ نہیں پلواتے۔ بلا کسی حق کے مانگنے والا بے غیرت ہوتا ہے ایسے سے اللہ بچائے۔ اب زمانے کی خود غرضیوں سے ہم ایسے جکڑے گئے ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں، جیتے ہیں جیتے ہیں، مر گئے مر گئے، نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم، پہلے روپے کی بڑی قدر تھی کہ دو کوڑیوں کو دام اور دمڑی کو دام کہتے تھے اور وجہ یہ تھی کہ ایک روپیہ بھنایا بیس ٹکے آئے، ایک ٹکے میں آدھ سیر کا پراٹھا تر تراتا معہ سالن اور پکوائی کے آ جاتا کہ ایک آدمی اُسے کھاتا تھا اور بچ جاتا تھا۔ اب روپیہ اتنا سستا ہو گیا ہے کہ کچھ بھی زیادہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ دو روپیہ ماہوار اور شاہی جمعدار شادی غمی میں سینکڑوں روپیہ صرف کر دیتا تھا۔ لوگ خوش معاش نیک معاش بدمعاش سب ہی ہوتے تھے۔ ایک روز نواب کلب علی خاں صاحب رئیس رام پور کے دربار میں ذکر آیا کہ خوش معاش اور نیک معاش اور بدمعاش ان کی تفصیل کیا ہے نواب صاحب نے فرمایا کہ بھائی نیک معاش وہ ہے جو دس روپے کماتا ہے آٹھ روپے اُٹھاتا ہے اور دو جیس مانند کرتا ہے اور خوش معاش وہ ہے جو دس روپے کماتا ہے اور نو اٹھاتا ہے ایک روپیہ پیچھے ڈالتا ہے۔ ایک صاحب بولے کہ سرکار جو دس کما کر دس اٹھا دیتا ہے وہ کون ہے۔ نواب صاحب نے سُن کر فرمایا ایسے کا ذکر نہ کرو اس کو مرنا نہیں جینا نہیں شادی غمی اگر کوئی شخص ایسا ہو تو اُس سے معاملہ نہ کرو ملو جلو نہیں ورنہ گھاٹے میں رہو گے۔ میلے ٹھیلے شہر سے باہر ہوتے تھے لوگ کھلے ہوئے میدانوں میں جمع ہوتے جہاں تک نظر کام کرتی سبزہ ہی سبزہ نظر آتا، لوگ خوش پوشاک، نوجوان کسرتی بدن سبزہ زار میں

ٹولیاں کی ٹولیاں نظر آتیں۔ اکثر دکاندار کھلونے والے، پچ رنگ بھرے بساطی کچھ کاٹ کی کے کھلونوں سے اپنی اپنی دکانیں سجاتے، کہیں کچالو والے بڑے بڑے چھیپے جن میں ہرے ہرے کیلے کے پتے بچھاتے اُبلے ہوئے آلو کچالو انھیں پتوں پر چھیپوں میں رکھے، کسی طرف امرود ناشپاتی کرک نارنگیاں لگیں، قریب چھیپے کے ایک مٹی کی کوری ہانڈی جس میں نمک مرچ سفید زیرہ پسا ہوا کھٹے لیموں، ترشے سریلی آوازوں سے پکارتے آ چاٹ ہے بارہ مصالحے کی ہے۔ کہیں کبابی سیخ پسندے کے کباب جن کی سنجیں پتوں پر چڑھی، کسی طرف تِی والے گولی کلیجی سیجے کے کباب گرما گرم تلتے، کسی طرف برف والے بڑے بڑے ہنڈے جن میں ربڑی، کھرچن، پستے کی قلفیاں جمائے آوازیں لگاتے آنے والی ٹکے کو اور ٹکے والی پیسہ کو، لونگ چڑے والے لمبی لمبی کاٹ کی کشتیوں میں بیسن کی پھلکیاں، انڈے کی ٹکیاں، مچھلی کے کباب لگاتے، سیکڑوں چھڑی والے کاغذ کے پنکھے طوطے چڑیاں کاغذ کی روئی کے لنگور ابرک کے چرخے لیے، کہیں ستے کٹورہ بجاتے، ساقی حقہ پلاتے سینکڑوں فقیر مداریے جلالی زنجیریں ہلاتے، گرز بجاتے، کہیں منڈچرے سر چیر تے لہو بہاتے۔ سیکڑوں نٹنیاں کرتبیں اپنے اپنے کرتب دکھاتیں، کہیں جھولے، کہیں ہنڈولے، کڑ اکہیں مداری اپنا کھیل دکھا رہا ہے، کہیں دریا پر برسات میں تیراکی کے میلے ہوتے، تیراک بڑے بڑے کمال دکھاتے، کوئی پانی کاٹتا، کوئی ملاحی کوئی کھڑی لگاتا کوئی چت کوئی پٹ لگاتا۔ اکثر جل بانک (پانی کی کشتی) لیے غرض میلوں میں جا کر آپس میں ملتے جلتے کچھ وہاں کھاتے پیتے شام کو اپنے اپنے گھر آتے محلّے میں قدم رکھا گویا گھر میں آ گئے۔ کوئی چھوٹا بولا اُس نے ادب سے سلام کیا اور کہا چچا جان آپ آ گئے یہ سامان جو جناب پاس ہے حکم ہو تو گھر پہنچا دوں۔ چچا نے نہایت مہربانی سے کہا میاں تم سلامت رہو میں تمھارے اور تمھاری بہن کے واسطے کچھ کھلونے اور مٹھائی لایا ہوں تم گھر جاؤ میں ابھی بھیجتا ہوں۔ اب آگے چل کر ایک صاحب برابر والے سے مڈبھیڑ ہوئی سلام کے بعد کہا جناب کا مزاج اچھا ہے۔ جناب آپ کی بھاوج مجھ سے کئی بار دریافت کر چکی ہیں۔ اب آپ یہاں تک تو تشریف لے ہی آئے ہیں اور گھر ہی کے قدم ہے پان بھی کھا لینا اور اُن سے دو باتیں کر لینا۔ یہ کہہ کر جلد قدم بڑھا گھر واپس ڈیوڑھی میں مونڈھا ڈال آپ حقہ بھر لائے، اُن کی بیوی نے پان نہایت سلیقے سے تھالی میں رکھے اور چند جو کھڑا الائچیاں چکنی ڈلی بن لیکن جگر تک یک رنگ نہایت خوبی سے بنے ہوئے لائیں اور کہا بھائی بندگی بھیا تم نے آواز کو بھی ترسا دیا۔ کبھی بھولے بسرے آتے جاتے ہو جایا کرو میں تو تمھاری راہ تکتی رہتی ہوں، ہاں یہ جانتی ہوں کہ تم کو نوکری سے فرصت کہاں پھر گھر آئے تو اللہ رکھو بال بچے۔ انھوں نے دُعا دے کر کہا کہ بہن میں ضرور آتا رہوں گا ورنہ جو کام ہو میں حاضر ہوں اور گھر قریب ہے جس شے کی ضرورت ہو فوراً منگوا لیا کرو۔ انھوں نے دُعا دے کر کہا کہ "میرے میاں جیتے رہو تم اور تم کو میں زیادہ جانتی ہوں اور یہ تو فرمایئے کہ ہماری بھابی کہاں ہیں میکے میں یا گھر میں اگر گھر میں ہوں تو میری طرف سے بندگی کہنا اور بچوں

کو پیار کرتا"۔ غرض چند باتیں کر کے یہ رخصت ہوئے جب گلی کی (کے) موڑ پر آئے تو انھوں نے کھنکارا۔ کھنکارنے کی وجہ ایک حکیم کا قول ہے کہ (تو اپنے چھوٹوں سے ایسا برتاؤ کر جو تو اپنے بڑوں سے چاہتا ہے) چنانچہ اس آواز سے جو چھوٹے چھوٹے بچے۔ آنکھ مچولی۔ پھاڑوا۔ چیل چلو۔ سرنگ لال گھوڑی۔ گیند بلا۔ گیند چڑھی۔ گیند ہگی۔ اوڑان چھلا۔ بتہ وڈھیری۔ گولیاں۔ گیڑیاں۔ چتورانی۔ کوڑی ذقند۔ کبڈی۔ کیل کانٹا۔ راجا پرجا۔ اپکی دوچی۔ گلی ڈنڈا۔ اندھا بھینسا۔ چاؤ چھول ان کھیلوں میں سے جو کھیل کھیلتے تھے اس کھنکار سے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپے اور کوئی سامنے بھی آ گیا تو نہایت ادب سے سلام کیا انھوں نے دعا دی۔ گھر آئے یہاں ان کی بیوی اُن کے آنے کی منتظر بیٹھی آہٹ پر کان اور دروازے پر آنکھیں لگی تھیں چاپ سن کر جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جو کچھ سامان یہ لائے تھے وہ ہاتھ سے لے لیا اور ہر قدم پر بسم اللہ کہتی ہوئیں جو جگہ میاں کے بیٹھنے کی تھی اُس کو پہلے ہی سے جھاڑ جھٹک کر صاف کر رکھا تھا اور جو چیزیں ان کی ضروری تھیں سب ٹھیک کر لی تھیں میاں کو جگہ پر بٹھایا اب بچے گھر مر کر بیٹھ گئے۔ بیوی ان کے برابر اپنی جگہ پلنگ پر بیٹھ گئیں اور پان دان کھول کر چھالیہ کترنی شروع کی اور اس قسم کی باتیں جن سے دل کو تفریح ہو شروع کیں اتنے میں ماما ظلا لائی بیوی نے زیر انداز بچھا کر بیچوان کا نل اپنے ہاتھ سے میاں کے داہنے ہاتھ کی طرف قریب رکھ دیا اب کھانے کا وقت آیا۔ ماماں جو چپلیاں زرم دم پر لگی ہوئی تھیں لائی اور بیوی کے پاس رکھ دیں۔ بیوی نے دسترخوان بچھایا اور اپنے ہاتھ سے سالن دال سبزی یا ترتی مناسب طریقے سے نکالا، پہلے میاں کے آگے پھر بچوں کے آگے رکھا اور خود ہی میاں کے ہاتھ دھلائے پھر بچوں کے، میاں سے کہا پہلے آپ شروع کریں اگر میاں نے حکم دیا تو بے تلقہ دسترخوان پر بیٹھ گئیں اور پانی کی دیکھ بھال رکھی اگر کسی کو خشکی سے ہچکی آئی تو جلد پانی دیا کہ دو گھونٹ سے خشکی رفع ہو جائے، بچوں کی طرف دیکھتی رہیں کہ کوئی زیادہ کھا کر بیمار نہ ہو جائے اگر ایسا دیکھا تو اس بچے کو پیار سے روک دیا بس میاں تم کھا چکے اللہ کا شکر کرو اور نہیں تو بچوں کو ہدایت کرتی رہیں دیکھو میاں چھوٹا نوالہ لو خوب چباؤ جلدی نہ نگلو۔ نوالہ مُنہ میں ہو تو بات نہ کرو، اپنے آگے سے کھاؤ دوسرے کی طرف نہ دیکھو۔ جب سب کھا چکے تو اب دسترخوان بڑھایا اور نوکروں کو کھانا دیا، جو جو غریب پڑوسی ہیں اُن کے ہاں سالن معہ (مع) دو روٹی کے ماماں کے ہاتھ روانہ کیا۔ میاں کے واسطے جو پہلے سے پان تیار رکھے تھے کہ چھالیہ پروردہ ہو جائے، پیش کیے۔ پان سے بہت فائدے ہوتے ہیں اول تو مُنہ گھلنے سے معدے کی ہوا نکلتی ہے دوسرے مُنہ خوش ذائقہ ہو جاتا ہے۔ تیسرے شرط یہ ہے کہ پان میں زردہ نہ ہو اور چونا بھی کم ہو تو پہلی پیک خون کو خوش رنگ کرتی ہے۔ اب باتوں باتوں میں رات زیادہ آ گئی بچے سو گئے اور بیوی نے خوابگاہ کا کمرہ ایک نظر جا کر دیکھ لیا کہ کوئی شے بچوں نے اُتھل پتھل تو نہیں کر دی، اب میاں کا بیچوان پلنگ کے قریب لگایا میاں پان کھا کلی کر سونے کے کمرے میں آئے بیوی پیچھے پیچھے آئیں جب میاں

پلنگ پر لیٹ رہے تو آپ وہیں ٹھہریں اگر میاں نے حکم دیا کہ آؤ سو رہو تو یہ پلنگ پر گئیں ورنہ پاس بیٹھ کر ایسی باتیں شروع کیں نرم آواز سے جس سے نیند آجائے اور دماغ سننے والے کا جواب دینے پر آمادہ نہ ہو۔ جب میاں نے آرام کیا تو ماماں کو صبح کے واسطے بتا دیا کہ ایسا کرنا اور جو جو کام اپنے لائق تھے اُن کو خود انجام دیا۔ تمام چیزیں جو صبح کے واسطے ضروری تھیں اُن کو قرینے سے رکھا کہ میاں اور بچوں کو اٹھنے کے بعد تکلیف نہ ہو اور آپ تمام قفل لگا، دروازے کی کنڈی خود لگائی اور سارے گھر کا کونہ کونہ دیکھ کر اپنے بچھونوں پر لیٹ کر سو گئیں۔ صبح کو سب سے پہلے اٹھیں نوکروں کو آواز دے کر جگایا کہ پانی وضو اور منہ ہاتھ دھونے کو گرم کریں، جب پانی ہو گیا تو آفتابہ بھر کر منہ دھونے کی چوکی پر مع (منج) مسواک منجن چنبیلی کی کھلی جو جلد کو نرم کرتی ہے، چہرے پر ملاحت لاتی ہے اور صابن کیسا ہی ولایتی کیوں نہ ہو اول تو تیزاب دوسرے چربی بلا امتیاز حلال و حرام کے چہرے کی ایک کھال اُڑا دیتا ہے اور چہرے پر خشکی لاتا ہے۔ غرض رومال منہ پونچھنے کا قریب رکھ دیا اب نماز پڑھی اس عرصے میں بچے اُٹھے اُن کو تمام ضرورتوں سے فارغ کرا منہ دُھلایا، اب میاں کھلائے پیچوان تیار تھا منہ سے لگا دیا میاں اُٹھے ان کا مزاج دریافت کیا جب میاں کا آگا تا گا لے چکیں تو بچوں کے شب خوابی کپڑے اُتروائے اور دوسرا لباس پہنایا اتنے میں میاں اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہوئے تو ناشتہ آگے رکھا جب ناشتے سے فارغ ہوئے تو میاں کا سامان آئینہ، کنگھا اور لباس اس کے علاوہ تلوار ڈھال پیش قبض۔ جمیا کاترہ وغیرہ قرینے سے رکھا جب میاں کپڑے پہنن چکے تو آئینہ وغیرہ سب جگہ کا سے رکھوا دیا کہ وقت پر تلاش نہ کرنی پڑے۔ اب میاں نے کنگھا کر پگڑی باندھی لباس پہنا، کاترہ کمر سے لگایا تلوار کا تر سے میں ڈال تھلے کا ڈورا درست کر تخت پہ کمر سے خنجر کٹار جمیا لگا اٹھ کر چلے بیوی اللہ حافظ اللہ نگہبان کہتی ہوئی ڈیوڑھی تک آئیں۔ تلوار کو اگر خیال میں بھی آپ اپنے ہاتھ میں لیں تو یہی جی چاہے گا کہ سینہ تان کر منہ پر کھا کر منہ پر دو اور بندوق ہاتھ آئی اور روح گھٹی اور آڑ پکڑی اب آپ ہی تصور فرمائیں بہادری کا اثر کس ہاتھ میں ہے۔ میرے نانا میر امیر علی داستان گو شاہی ملازم تھے۔ ڈھولکی گلی میں ترکمان دروازے رہتے تھے اور قاضی حیدر علی صاحب ہمسایہ تھے گھر میں کھڑکی تھی سب کا آنا جانا کھانا پینا غرض کوئی یہ نہ جانتا تھا کہ یہ غیر ہیں، فصل میں بادشاہ کے ہاں سے آموں کا چھکڑا، جاڑے میں حلوا سوہن کی بہنگی، بوٹوں کا چھکڑا، جب آتا محلے کنبے کا برابر کا حصہ لگایا جاتا، شادی غمی میں تین دن پڑوسیوں سے مثل عزیزوں کے ہوتا تھا۔ آپس میں بوا، باجی، خالہ کہہ کر بات چیت کرتے تھے اور صرف زبانی ہی نہیں ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ میر امیر علی داستان گو میرے نانا اور میر کاظم علی داستان گو میرے ماموں جن سے میں نے داستان سیکھی۔ میر کاظم علی صاحب نے اس فن قصہ خوانی کو چار چاند لگا دیے۔ مجھے داستان تو نہیں آتی ہاں کچھ بائیں شائیں باتیں بک لیتا ہوں اب وہ اردو جو دلی میں غدر سے پہلے تھی اس کا سبب یہ تھا کہ ہر محلے میں دو چار جاگیردار، صاحب ثروت ذی مقدرت

منصب دار، عہدے دار ایسے ہوتے تھے جن کے دیوان خانے یا مردانہ مکان ایسے ہوتے تھے جو فرش فروش سے درست چلوں پردہ، کچھ قطعات خوشنویسوں کے جن میں نصیحتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھیں یا اخلاقی ہوتے تھے جن کو پڑھ کر ہم کو سبق مل جاتا تھا۔ پھر ان دیوان خانوں میں سوافق ثروت کے خدمت گزار لیکن ایسے لائق کہ آقا کے ذرا سے مزاج کے تغیر کو سمجھ لیتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ہماری زندگی یکی ہوئی ہے اور آقا کی ذات سے ان کو ایسا لگاؤ ہوتا تھا جیسے آفتاب کے ساتھ دن یا آگ کے ساتھ حرارت، اس پر امین اور دیانت دار ذرا سے اشارے پر کٹ پتلی کی طرح کام کرتے تھے۔ ان دیوان خانوں میں شاہزادے، علما باکمال شرفا جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کمالات کا اظہار کرتے تھے نوجوان بچے ان کی باتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ شاہی زمانے میں ہر قسم کی قابلیت کے لوگ چو گنے چنے ہوتے تھے اسی دلی میں تھے، آداب واخلاق ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ دوست دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو تفریح کا سبب ہوتے ہیں دوسرے وہ جن سے زندگی میں مدد ملتی ہے۔ جگت ضلع پھبتی پھکڑ، او کچھ ایسے لوگ بولتے ہیں جن کو کچھ نہیں آتا اور تھوتے ہوتے ہیں اور سوائے پانچ سات تالیوں کے اور کچھ نہیں جانتے انھیں کو الٹ پلٹ کر بولتے رہتے ہیں ہاں مزہ کارے دارد اس میں علم مجلسی کی ضرورت ہے۔ عبدالقادر ذات کے جلاہے صرف خوش طبعی کے واسطے بادشاہ کے ہاں نوکر تھے۔ ایک روز یہ بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ عبدالقادر کے بیٹے نے حضور میں حاضر ہو کر آداب شاہی بجالایا حضور نے اشارہ فرمایا کہ عبدالقادر اپنے بیٹے سے مذاق کرو عبدالقادر نے عرض کی کہ حضور یہ سانپ کا سپولیہ ہے عجب نہیں کہ پلٹ کر کاٹے اور زہر اگلے لیکن حکم شاہی سے اتنی مجال کہاں جو حکم نہ بجالائیں غرض عبدالقادر کا بیٹا جب آداب بجالا کر پیچھے ہٹا تو عبدالقادر نے آواز دی کہ بیٹا تم گھر تو جاتے ہی ہو اپنی اماں سے ذرا کہنا نہا دھو کر بناؤ کر کے تیار رہیں میں آتا ہوں بیٹے نے عرض کی کہ بہت خوب یہ کہہ کر چند قدم گیا اور پھر واپس آ کر عرض کی کہ جناب اگر والدہ کہیں مہمان گئی ہوئی ہوں تو دادی اماں سے کہہ دوں۔ بادشاہ نے زیر لب تبسم فرمایا۔ جب عبدالقادر کا بیٹا چلا گیا تو عبدالقادر نے عرض کی کہ حضور نے ملاحظہ فرمایا کہ کیسا پلٹا اور چوٹ کی۔ اب زمانے کی دست برد سے ہم کو اتنی فرصت کہاں جو کسی صحبت میں بیٹھیں اور وہ لوگ کہاں جو ہر طرح سے قابل ہوتے تھے اب تو بقول شخصے سر کھجانے کی مہلت نہیں، فرصت کی پونجی ہم سے چھن گئی۔

ہمیشہ سدۂ افلاس در جگر دارم
کہ غیر شربت دیدار نیست ہیچ دوا

اب اس بساط کو تو 1857ء اپنے ساتھ لپیٹ کر لے گیا۔ اب میں اپنی بپتی لکھتا ہوں۔

پڑوس کا کچا چٹھا یعنی پاجی پڑوس

1923ء مئی کی 22 تاریخ۔ آفتاب ابھی نکلا نہیں عبادت کا زمانہ شام کو اولہ پڑ چکا ہے، کئی روز سے متواتر بارش ہے تیری کے جھونکیں (جھونکے) روح حیوانی کے دھوئیں اڑائے دیتے ہیں انسان تو ذی روح ہے (رباعی)

صدمے سردی کے بڑے ہوتے ہیں
ہر چند کہ ہم دل کے کڑے ہوتے ہیں
وہ تیری کے جھونکے کہ خدا اُن سے بچائے
کمبل کے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

در و دیوار سیلے ہوئے کچے مکان تو کچے ہی ہوتے ہیں بارش کی کثرت سے پکی چھتیں بھی پسیج رہی ہیں۔ بادل پر بادل آیا اور برس گیا میں دالان میں بیٹھا یہ باتیں کر رہا ہوں ہر چند رضائی اوڑھے ہوئے ہوں اُس پر یہ حال ہے کہ ذرا سا پلہ سرکا اور یخ۔ سامنے انگیٹھی سلگ رہی ہے ہوا کا جھکڑ سائبان کے اندر دالان کے پردوں کو کپکپائے دیتا ہے اور پردے سرد ہن رہے ہیں، الگنی کی جگہ جو بانس بندھا ہوا ہے اس بانس پر چھت کے چشموں کے رہنے والی چڑیاں پر پھلائے ایک دوسرے سے جڑی بیٹھی ہیں، جو کوئی باہر سے آتا ہے اُس کے منہ اور ناک سے بھاپ نکلتی، سُو سُو کرتا دانت سے دانت بجتا چلا آتا ہے۔ صحن میں ایک بڑا سا مٹکا دیوار کے قریب اوندھا ہوا تھا کہ یکایک اُس کے ٹوٹنے کا جھڑاکا ہوا اور ساتھ ہی اُس کے ایک دھماکا ہوا میں سمجھا کہ خدا نخواستہ کوئی دیوار آئی جو اینٹیں گریں، اتنے میں ایک چھوٹا مکان جو ہمسایہ میں خالی تھا وہاں سے گالی اور کوسنے کی آواز آنے لگی میں نے ماماں سے پوچھا کہ کیا کوئی اس گھر میں آ کر رہا ہے ماماں نے کہا میں نے کل شام سوں شام اس گھر میں کوئی آ کر رہا ہے یہ آواز وہاں کی ہے، میں نے ماماں سے کہا کہ ذرا جا کر دریافت تو کرو یہ دھما کا کیسا اور یہ لڑ کیوں رہے ہیں۔ ماماں روانہ ہوئی۔ یہاں میاں ننھا اور گبدو دو بھائی ہیں جو بیلوں کا خیمہ ہانکتے ہیں اور ان دونوں کی بیبیاں ننھا کی بیوی گھنو اور گبدو کی بیوی گھنو نام ہے گھنو نے گھنو سے کہا اری میں تو دیکھوں ہوں کہ اس گھر میں کون کھا جر رہے ہیں یہ کہہ کر ایک جھلنگا بانس کی بنی سردوں کا جس کا ایک پایہ ندارد دوسرا پایہ چٹخا ہوا جس کو پرانی دھجیوں سے انکار رکھا ہے اس جھلنگے کو گھنو نے دیوار سے اڑا کر سیدھا کھڑا کیا اور جھلنگے کے سلوں میں معہ (مع) جوتی کے پاؤں ٹھونس کر اُچکیں اور دیوار کی منڈیر پر ہاتھ ڈالا دیوار سیلی ہوئی ہونے کی وجہ سے دو اینٹیں انگنائی میں گریں اور گھنو صحن میں چاروں شانے چت۔ جس صحن میں بارش سے کیچڑ، بیلوں کا روندا ہوا گوبر، کچھ ان کا موت، کچھ اسباب لانے کی بے ربطی سے روندی ہوئی کالی کالی کیچڑ ولگ ولگ کر رہی ہے، یہ بیچاری اس طرح گری کہ ایک ہاتھ اس کا گھنو کے سر پر ایسا پڑا ارپٹ واں پڑا کہ بقول شخصے جھمیلیں اُڑیں، گھنو اپنے بچے کو انگنائی کے بیچ میں ایک بیڈول سے کاٹ کے ٹکڑے پر بیٹھی ہگا رہی تھی بچے کا رنگ زرد، پیٹ جگر کے ورم اور طحال بڑھ جانے سے اونچا، چہرے پر جھریاں،

پاؤں سُوجھے، ہاتھ میں سے روٹی کا ٹکڑا جو بچے کے مُنہ کی رال سے لتھڑا ہوا جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں اور دست کی ٹوٹی جو پاؤں پر بٹھاتے بٹھاتے چلی ہے تو زرد زرد دست کالی کالی کیچڑ پر دور تک پڑا ہوا جس میں ادھ کچری غذا ملی ہوئی۔ بُو دار ایسا کہ تمام گھر سڑ گیا اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معدے اور انتڑیوں نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔ گھنّو نے دھول کھا کر کہا نپوتی مر اور غصے میں آ کر طوطے کا پنجرہ جو لوہے کی پرانی پٹیوں سے بنا ہوا تھا اور چھت پنجرے کی پرانی دھجیوں سے اٹی ہوئی تھی، طوطے نے روٹی کے ٹکڑے کتر کتر کر دودھ کے ٹوٹے ہوئے کلہڑے کے پیندے میں ڈالے تھے کچھ بیٹ بچھا اور الابلا جو کل کے ڈالے ہوئے پانی میں پڑ کر سڑ گئی تھی اور بلبلے اُٹھ رہے تھے، گھنّو نے جو طوطے کا پنجرہ مارنے کو اٹھایا تو چھت پنجرہ کی الگ ہو کر گھنّو کی کھلی ہوئی پٹاری پر اوندھ گئی اور یہ سب کچھ چونے کی کلیوں اور کتری ہوئی رول کی چھالیہ اور امانت خانی زردہ اور بچے ہوئے پان کے ٹکڑے پر گرا اور طوطا ٹیں ٹیں کرتا پھدکتا چلا، گھر کی پلی ہوئی بلی طوطے پر لپکی، کالو کتا جو پرانی نواڑ سے دالان کے در سے بندھا ہوا تھا اُس نے جھنکا دے کر نواڑ تڑائی بلی پر چلا اور اصیل مرغ جو پرانے کھانچے میں بند تھا اُس نے کٹ کٹانا شروع کیا، گھنّو نے غصّے میں کھانچہ مارنے کو اٹھایا یہ مرغ کھل کر دوسرے مرغ پر جھپٹا اُس نے جو لات ماری تو کھانچہ اُلٹ گیا اور آپس میں جھڑپنے لگے بیلوں نے رسیاں تڑوانی شروع کیں اتنے میں حلال خوری بھرا ہوا ٹوکرا کولے (کوٹھے) پر رکھے جو بارش کی وجہ سے چپا تھل تھل کرتا اور ٹوکرے کے جو راکھ ڈالی ہے تو حرکت سے وہ راکھ سٹ کر زرد زرد گُو چپتا جس کو حلال خوری کی ڈھکنہ (بیٹھک) کہتے ہیں نکلا ہوا، یہ نئے کرایہ داروں کو دیکھنے گھر میں آئی پھسلن کی وجہ سے پاؤں اس غریب کا پھسلا اور گُو کا ٹوکرہ اس طرح اوندھا کہ گھنّو کے بچے کی کمر اور اُس کے پاؤں سب لتھ پتھ ہو گئے۔ حلال خوری نے جو سنبھلنے کو ہاتھ مارا تو گھڑونچی جس کو اینٹیں لگا کر اس پر دو گز کے مٹکے پانی سے بھرے رکھے تھے وہ گرے۔ چھوٹی سی انگنائی دو مٹکوں کا پانی چھ چھ انچ پانی کھڑا ہو گیا اور گُو ساری انگنائی میں تیرنے لگا، گھنّو کے آدھے آدھے چوتڑ اور گھنّو کے ٹخنے تک پاؤں غرق اس عرصے میں میاں لٹّا نائی کی دُکان پر جو نہانے گئے ہوئے تھے یہ سُو سُو کرتے میلا لنگوٹ باندھے ننگے پاؤں، کری گلے میں سر پر میلی چیکٹی ہوئی ٹوپی میلا کرتہ جس کو باندھ کر نہائے ہیں گیلے ہاتھ میں جس سے میلی میلی بوندیں ٹپکتیں، گھر میں قدم رکھا تو عجب حال دیکھا کہ دونوں مرغ لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے ہیں اور اپنی بیوی گھنّو کو مع (مع) بچے کے گُو میں لتھ پتھ دیکھا اور بھاوج جوتی کے تلے سے اپنے پائجامے کی کیچڑ کوٹھے پر سے پونچھ رہی ہے، حلال خوری یہ بُڑھیا اپنے کپڑے گُو کے بھرے ہوئے دیوار سے رگڑ رہی ہے، بلی نے طوطے کو منہ میں دبا رکھا ہے، کتا کھڑا ہوا بلی پر غرا رہا ہے، بیل توں فاں کر رہے ہیں، ایک مرغ کی آنکھ خار کھلے ہونے کی وجہ سے پھوٹ گئی ہے اور قفل کی لات سے ایک مرغ کی چونچ مع (مع) پنجرے الگ ہو گئی ہے اس عرصے میں میاں لٹّا کا پاؤں ایک گُو کی ڈھیری

میں غرق جمنا نے جو پاؤں کو جھٹکا دیا تو میاں گبدو جو دالان میں پڑے ستار ہے تھے ایک گو کی لگدی اُن کے مُنہ میں، گبدو نے جو مُنہ بند کیا تو کچھ حصہ اس کا حلق میں باقی مُنہ میں، یہ تھتکارتے، اُبکائیاں لیتے اُٹھے اور جمنا نے غصے میں آ کر میاں گبدو کے مرغ کی ٹانگیں پکڑ کر ایسے زور سے مارا کہ پھڑکنے لگا، گبدو نے جو دیکھا تو اُبکائیاں لیتے گھڑونچی کا پایہ اٹھا میاں جمنا کی طرف پھینکا جو سر میں لگا میں جمنا پایہ کھا گبدو کی اکھیڑ میں بیٹھ گئے اور سر سے بلند کر ایک بھد کنا گو اور کیچڑ میں دیا کہ اس کے کپڑے بھی لتھڑ پتھڑ ہو گئے اتنے میں بی ماماں نے قدم رکھا تو کٹکٹا غرایا اور مرغ نے جھپٹ کر کیچڑ اور گو کے بھرے ہوئے پنجے سے لات ماری کہ اس بیچاری کے نمازی کپڑے خراب ہو گئے اُدھر حلال خوری نے جو ہاتھ جھٹکا تو ایک گو کی پھٹکی ماماں کے سر پر، اُس وقت اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلکا ہوا تھا ماماں نے جو سر پر ہاتھ پھیرا تو سارا دست اوبٹنہ کی طرح بالوں میں اور ہاتھ بھر گیا اس کا جی متلانے لگا اُلٹے قدموں باہر آئی سامنے اس گھر کے ڈھولو کارخانہ وار ڈھلئی کا کام گھر ہی میں کرتے ہیں پیتل کی اکثر چیزیں ڈھالتے ہیں۔ان کا بھی چھوٹا سا گھر صحن ان کے مکان کا گلی سے آدھ گز نیچا ہے کہ محلہ کا سارا پانی انھیں کے گھر مرتا ہے اور جذب ہوتا ہے بو ایسی کہ ناک نہیں دی جاتی اندر ایک چھوٹا سا اور شمال رویہ جس کی گ، دو یا سوا دو گز سے زیادہ نہیں طملچہ اتنا کہ قد آور آدمی کھڑا ہو تو سر چھت تک جانے لگے اس پر دالان صحن سے بھی نیچا بیچارے نے دالان کے آگے ایک منڈیر باندھ دی ہے کہ بارش کا پانی اندر نہ آ سکے۔ یہ مکان کل چون گز زمین پر بنا ہوا ہے غرب رویہ دروازہ جنوب مشرق اور شمال اور مغرب میں چاروں طرف کئی کئی منزل کے بلند بلند مکان، دھوپ، چھاؤں، ہوا جو زندگی کی جان ہے اس گھر سے منزلوں دور پھر اس پر سونے میں سہاگہ پیتل کا ڈھالنا، میلا کام تیل کوئلہ۔ ماماں ڈھالو کارخانے دار کے ہاں اس وجہ سے گئی کہ نجاست دھولے، دروازے میں قدم رکھا تھا کہ موری کا ڈھکا (ڈھکا) ہوا پتھر آڑا ہوا اور پاؤں اس غریب کا ران تک غرق، اور جوتی موری کی کیچڑ میں، دروازے کے سامنے دیوار کے سہارے دو گوڑ جیسے پتھر رکھ لیے ہیں اور پردے کے واسطے دو لکڑیاں گاڑ کر ان لکڑیوں کے سروں پر ایک بان کا ٹکڑا باندھ دیا ہے جس پر پھٹا ہوا سا کالا کپڑا پڑا ہے جو ہوا سے اُڑ کر گھر والوں اور پاخانے میں بیٹھنے والوں کا آمنا سامنا ہو جاتا ہے، اُن پتھر کے قدمچوں (قدم چوں) کو جو حلال خوری نے کمایا ہے تو بیچ میں پتھروں کے گڑھا پڑ گیا ہے اور آب دست کا پانی جمع ہو کر پاخانہ تیر رہا ہے اور وہی پانی جو اس کھڈی سے انگنائی میں بہہ کر آیا ہے تو سفید سفید کرم اور دُمدار (دُم دار) کیڑے صحن میں رینگ رہے ہیں۔ دالان میں دو بھیڑے بندھے ہیں اور چھنی ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز سے بھیں بھیں کر رہے ہیں اُن کے آگے شلجم کے پتے، گوبھی کا ڈنٹھل، کچھ گھاس اور آم جامن کے پتے گٹھلیوں اور موت میں لتھڑے پڑے ہیں، بھیڑوں کا جہاں تک منہ گیا ہے کھجور کا پرانا بوریہ جو دالان میں بچھا ہے کھا گئے ہیں قریب بھیڑوں کے جوئی کی رکابی یا چاچی کا پیالہ رکھا ہے اُس میں دھوون کا پانی

جمع ہے اس میں کچھ بیگنیاں تیر رہی ہیں اسی دالان کے کونے میں بھٹی بنی ہے اور قریب اس کے ایک پتھر جو سیاہ مطلق ہے جس پر ریزہ بھرتے ہیں بچھا ہے اور برابر اس کے ایک کونڈا مٹی کا ذرا اڑا لگا ہے جس میں بالو ریتا اور تیل ملا ہوا جو ریزہ بھرنے کے کام آتا یہ مصالحہ جل کر سیاہ ہو گیا ہے قریب ہی اس کے کھال لگی ہے، ایک لوہے کی پتی کا ٹکڑا جس سے پتھر کو کھرچتے ہیں پڑا ہے کچھ موٹے اکثر ریزے یہ سب دیوار میں کیلیں گاڑ کر لٹکا دیے ہیں، میاں ڈھالو کارخانے دار گورا رنگ گول چہرہ، سر پر پٹھے جو اُلجھ کر نمدے ہوتے ہیں اُن اُلجھے ہوئے بالوں پر ململ کی پرانی ٹوپی جس کی گوٹ کئی جگہ سے مسکی مانگ کی سیون اُدھڑی، گلے میں گاڑھے کی روئی دار کاہی رنگ کی کرتی جو کئی جگہ چنگوں سے جل کر کالے کالے داغ پڑ گئے ہیں۔ اس پر کارخانے دار نے جو کالے کالے ہاتھوں سے ناک صاف کی ہے تو دونوں نتھنے اور ناک کا بانسہ سیاہ ہے اور پیشانی پر جو پسینہ آیا ہے تو علاوہ پیشانی کی سلوٹوں کے کالی اُبھری ہوئی لکیریں پیدا ہو گئی ہیں کلوں پر داغ الگ، نیلا لنگوٹہ (لنگوٹا) اس میں پسینہ آ کر خشک ہوا ہے تو پسینے کی شوریت سے سفید سفید لکیریں جیسے خوشنویس سطروں کے گرد موش دنداں بناتے ہیں ان کا لطف آ رہا ہے۔ اسی درے کے بیچ میں ایک بان کی چارپائی جس کے بان ٹوٹ کر اتنی جھولا ہو گئی کہ جو اس پر لیٹتا ہے تو اُس کے کولے (کولھے) زمین سے لگ جاتے ہیں، اس پر ایک گاڑھے کی کچی چھپی ہوئی تو شک جو کئی جگہ پانی پڑنے سے رنگ پھیل کر دھبے لگ گئے ہیں اور پرانی ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ کر روئی نکل آئی ہے اور اتنی سیلی ہوئی ہے کہ نچوڑو تو پانی ٹپک جائے اس پر ایک میلا چکٹا ہوا تکیہ جس کی دبازت دو انگل سے زیادہ نہیں سرہانے پڑا ہوا اس پر دو برس کا بچہ ننگے سر ململ کا اکبرا اُگرتہ جگہ جگہ سے پھٹا اور گریبان کھلا پہنے، سردی سے اُس غریب کے رونگٹے کھڑے، رو رہا ہے ماں اس بچے کی کارخانے پر بیٹھی گوٹا بُن رہی ہے، بڑا بچہ دروازے کے باہر کیچڑ پانی میں کھیل رہا ہے، اُس چارپائی کے جھلنگے پر روٹی کی ڈلیا رکھی ہے جس میں تنور کی پکی ہوئی روٹی جو تیز تنور ہونے کی وجہ سے جلس گئی ہے اور نمک آٹے میں ڈالنا جو بھول گئی تھی تو روٹی تنور میں گر کر تمام بھوبل لگ گئی ہے اور اسی روٹی پر بھٹیارے کے شوربے کی جو پایہ کی بوٹی ملی ہے تو روٹی میں چیک پیدا ہو گئی ہے جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں میاں ڈھالو ایک ہاتھ سے ریزہ بھر رہے ہیں دوسرے ہاتھ سے کھال دھونک رہے ہیں کہ میاں بیوی میں تعلیم کے متعلق گفتگو شروع ہوئی میاں ڈھالو نے کہا کہ انگریزی پڑھ کر بچہ کافر ہو جاتا ہے بیوی بولیں ہے نہ موا لنگوٹ بند کارخانے کا بھوت کارخانے کا بیٹھنے والا کارخانے دار تو یہ سن کر جامے سے باہر ہو گئے اور کہا او گدھے کی بچی تو کیا جانے ہماری برابر میں تو ڈکارا کو ہرگز نہ پڑھاؤں گا جان سے مار ڈالوں گا، بیوی نے کہا دیکھوں تو سہی، ڈھالو یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور کہا لے دیکھ یوں مار ڈالتے ہیں یہ کہہ کر آواز دی ابے او ڈکارا۔ میاں ڈکارا نے جواب دیا، جی میاں، کارخانے دار نے کہا ابے ذلدی (جلدی) آ، بیوی بولیں ارے نگوڑے نہ آئیو، ڈکارا یہ سن کر کتنے کا پلا بغل

میں کیچڑ کے ہاتھ جھٹکتے گھر میں آئے ڈھالو نے ڈکارا کا ہاتھ پکڑ بھیگا ہوا اور کیچڑ میں سنا ہوا ادھوڑی کا جوتا اٹھا تان تان کر مارنا شروع کیا بیوی کہے جاتی ہے کہ میں بھی بھگوتسبا کو والے کی پوتی نہیں جو انگریزی ہی نہ پڑھائی ہو تو نام ورنہ نام نہیں، ماماں بیچاری یہاں کی یہ کیفیت دیکھ کر قریب ہی ان کے ایک صاحب شریف خاندانی رہتے ہیں، ان کی شادی نہایت غریب اور معمولی خاندان میں ہوئی ہے ان منشی جی کی والدہ نے صرف پیلی چمڑی دیکھ لی ہے اب کیا تھا۔ پہلے لڑکے والے لڑکی کا خاندان اچھی طرح سے دریافت کر لیتے تھے اور اسی طرح لڑکی والے لڑکے کا چال چلن، غرض اچھی طرح سے چھان بین کر لیتے تھے، اس وقت روپے کی پروا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کو ہڈی چاہیے ہے۔ ہر محلے میں مقتدر لوگ رہتے تھے جن کے ہاں استانیاں، مغلانیاں نوکر ہوتی تھیں جو محلے کی بچیوں کو نماز روزہ، سینا پرونا، پکانا کھانا غرض تمام امور خانہ داری سے آگاہ کر دیتی تھیں۔ اگر سمجھ دار اور صاحب سلیقہ بہو گھر میں آجاتی ہے تو وہ گھر گھر بن جاتا ہے۔ اب منشی صاحب کا حال گزارش کرتا ہوں، منشی صاحب نے شادی سے پہلے یہ نہ خیال کیا کہ تمام عمر کا ساتھ ہے پہلے اچھی طرح سے دریافت کر لیا جائے (یہ کسی کا قول سچ ہے کہ انسان شادی سے پہلے گونگا ہوتا ہے اور بعد شادی کے اور لوگ بہرے ہو جاتے ہیں۔) منشی صاحب کے والد مرحوم بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں، یہ بھی منتظم اور نیک چلن ہیں کسی دکان پر حساب لکھتے ہیں ان کی بیوی کی یہ کیفیت ہے کہ ادوڈول پرورش پائی ہے، ماں باپ غریب روٹی ڈھنگ سے جڑتی ہے نہ کپڑا، بچی کے خیالات یہ ہیں کہ جب میری شادی ہوگی تو ایسا کپڑا پہنوں گی کہ کسی کے پاس نہ ہو اور کام کاج میری بلا کرے میری طرف سے گھی کا کپ بہ جائے مجھے کیا، میں تو بیگم بنی بیٹھی رہوں گی سارے گھر پر حکومت کروں گی پھلی بھی نہ پھوڑوں گی اور زیور تو ایسا بنواؤں گی کہ بڑی بڑی محفلوں میں نہ نکلے اور ایک ایک مجھ سے پوچھے حضور یہ زیور کہاں سے بنوایا تو میں کہوں گی بنوایا کہاں سے میرے گھر میں ایسے ایسے بہت سے بکھرے بکھرے پھرتے ہیں میں پہنتی ہی کب ہوں، وہ بوتام جو ٹوٹا ہوا پاخانے میں پایا ہے اُس کے نگینے کی سونے کی انگوٹھی ایسی بنواؤں گی جو چھٹانک بھر کی ہو اور وہ انگوٹھی سب کو دکھلا کر کہوں گی کہ دیکھو اس جواہر کو کسی جوہری نے نہیں پہچانا یہ نگینہ ہمارے بزرگوں کو سکندر بادشاہ نے دیا تھا اور ایک یہی ایسا جواہر تھا کہ سکندر نے اس کو اپنے تاج میں لگایا تھا اور ایک ایک کو دکھا کر فخر کرتا تھا اور یہی کیا اس سے بھی اچھے اور بڑے بڑے گھر میں پڑے ہیں اُن سے میں گٹیاں کھیلا کرتی ہوں۔ ایک دن بوا میں نے غضب کیا کہ گلی کے کالو کتے کے گلے میں بڑے بڑے نگینوں کا ہار بنا کر پہنا دیا وہ موذی کہیں اتروا آیا ابا بڑے خفا ہوئے تو اماں ابا سے خوب لڑیں اور کہا میری بچی کا صدقہ گیا ایسے سوئے پتھر چار چار ہزار پانچ پانچ ہزار کے میری لال ہی بچی پر سے صدقہ کیے تھے یہ کہہ کر انگوٹھی اتار کر پان دان میں ڈال دوں گی تاکہ عورتیں یہ سمجھیں کہ یہ بڑی امیر ہیں ان کا خطاب سردار دلہن ہے۔ اب گرمیوں کا موسم ہے نئی دلہن دن چڑھا آیا بہو پڑی سو رہی ہیں، مقام پلنگ پر

دھوپ آ گئی ہے، بہو نے جورات کو پان نہیں تھوکا تھا وہ منہ میں ہے اور باچھ سے رال بدرنگ بہ کر کلّے ہٹانے تکیے، چادر تک آ گئی ہے ساس بیچاری خود کردہ را علاجے نیست حیران ہیں اور یہ چاہتی ہیں کہ بچے کے کان میں کوئی نہ ڈال دے دلہن جب منہ سے سانس لیتی ہیں تو کلّہ تھرتھراتا ہے۔ اب دن چڑھ گیا کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے پڑی بھوسنا رہی ہیں ساس شرم کے مارے گڑی جاتی ہیں، مکھیاں باچھ میں محال کی طرح اوپر نیچے لپٹی ہیں، ساس نے قریب آ کر آواز سے کہا بیٹا اٹھو بہت دن چڑھ گیا بہو نے اونھ کی اور کروٹ لے کر پھر سو گئیں۔ ماماں نے آواز دی کہ چھوٹی بیوی اٹھو، دلہن نے جھجک کر کہا کہ شتل تو ہے کون میری نگی سووڑی یہ کہہ کر غصے میں اٹھیں اور پلنگ سے پاؤں لٹکا کر ران پر کہنی رکھ ہاتھ کو زیر رخسار سہارا دے پھر او نگھنے لگیں، تمام سر اور پیٹ پر دھوپ جو بدن میں چبھی جاتی ہے لیکن یہ ضد کی پوری، بیٹھی ہیں، ماماں نے لوٹا پانی کا، منجن کی ڈبیا، کلی وغیرہ نہ دھونے کی چوکی پر رکھ دی اور کہا چھوٹی بیوی منہ دھلوا تا کہ جی ہلکا ہلکا ہو جائے۔ دلہن نے ترخ کر جواب دیا چل میرے پیچھے نہ پڑ گوڑی بلا کی طرح سے لپٹ جاتی ہے آنے دے اپنے ولی نخرا کوا گر چوٹی میں تین بل دے کر نہ نکلوا دیا ہو تو میرا نام پھولو نہیں۔ اب گھنٹے نے ٹن ٹن گیارہ بجائے دلہن نے دل میں گنے اور انگڑائی لے کر اٹھیں، چوکی پر نہایت انداز سے ڈگمگاتی ہوئی چڑھیں ساس نے بیساختہ کہا بسم اللہ بیٹا سنبھل کر، دلہن نے پہلے ہاتھ دھوئے منجن نہ کیا اور الٹے سیدھے منہ پر ہاتھ مار کر سر پر جو کچے رنگ کا سبز دوپٹہ تھا اس سے منہ پونچھا کہ زردی اور سبزی چہرے پر لگ کر بجائے جوانی کی سرخی کے مردنی کے آثار پیدا ہو گئے وہاں سے اٹھیں تو رات کے پان کا بقیہ جو منہ میں تھا زبان سے ٹٹول ٹٹول کر تھکارتیں، صدر میں جو قالین بچھے تھے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ اتفاقاً ایک محلے کی غریب بڑھیا آگ لینے آئی اس نے ماماں سے پوچھا کیوں مضائقہ بہو کیسی آئی اور خطاب کیا دیا، مزاج کی کیسی ہیں ماماں نے کہا کہ خطاب سردار، بھولا ہے اور مزاج کی نہ پوچھو کہیں، تولہ کہیں، ماشہ ذرا سی دیر میں آپے رہیں نہ باپے کچھ بات نہ چیت طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیتی ہیں کبھی ساس کے واسطے چار انگلیاں بھی ہم نے سر پر رکھتے نہیں دیکھا اور مزاج اللہ اللہ، بوا میں تو نوکری چھوڑوں گی ایسی نوکری سے ہو گا سو خدا سے ہو گا خیر یہاں پھول اڑاتے تھے وہاں دھول ہی اڑائیں گے مگر جان کو تو کل ہو گی یہ کل، کل، کل تو نہ ہو گی۔ ادھر بہو سر جھکائے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھیں اپنے رومال کے کونے کو بل دے رہی ہیں کہ اتنے میں پھیلی سقنی جو سردار بہو کے میکے کے قریب رہتی ہے وہ ایک میلے دسترخوان میں مٹی کا پیالہ اور اس پر دو روٹیاں جو شوربے سے گل گئی ہیں اور کچھ حصہ سالن میں مل کر ملیدے کا کام دے رہا ہے یہ دسترخوان میں باندھے اس طرح لائی ہے کہ شوربا چھلک کر دسترخوان تر ہو گیا ہے اور اس کی ہتھیلی میں شوربا جمع ہو کر اس کے ہاتھ کی پشت سے ٹپک رہا ہے اور بوندیں پھیلی کے شانے اور کچھ میلے کرتے کے دامن اور تیلی سوسی کے پاجامے، پاؤں کی پشت اور پرانی جوتی جو گھستے گھستے آدھی رہ گئی ہے اس کے پنجے پر پڑیں

مچھلی کا کالا رنگ، لمبا چہرہ، ناک پر بڑا سا مستا، دو دانت اوپر کے اور ایک نیچے کا ندارد، جب بات کرتی ہے تو زرد زرد دانت کڑ برے، بال پھولے ہوئے، سر پر گزی کا لال دوپٹہ، کانوں میں پیتل کے بڑے بڑے بالے اور بالیاں، گلے میں سوئی ہنسلی، ہاتھ میں کانسی کی گھسی ہوئی پہنچیاں، پاؤں میں پاجوے کے بانگ پینے میں غرق پاؤں پر راستے کی اتنی گرد واڑ کر پڑی ہے کہ پرانی جوتی اور پاؤں کی پشت کا رنگ یکساں ہے، بی مچھلی اندر آ ئیں اور کہا لو پھولو یہ تمھاری ماں نے بھیجا ہے، لگ جائے آگ کل سے گھوڑی نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ سردار بہو تو مچھلی کو دیکھتے ہی خوش ہو گئیں، باچھیں کھل گئیں، تعظیم کو کھڑی ہوئیں اور کہا مچھلی اری گھوڑی یہاں آ مچھلی نے کہا میرے پاؤں خراب ہیں، سردار بہو بولیں یہ گھوڑا فرش ہی کیا ہے اب ساس دیکھ رہی ہیں گھر میں دو ہی چاندنیاں ہیں ایک چاندنی ڈھلنے گئی ہے اور یہ چاندنی آج ہی بچھائی ہے مچھلی کے پاؤں سیت اور گرد و غبار دونوں مل کر کیچڑ ہو گئے ہیں اس نے جو پاؤں رکھے تو قالین تک پورے چھاپے چھپ گئے سردار بہو نے کہا اری قالین پر تکیے سے لگ کر بیٹھ مچھلی نے جواب دیا کہ پھولو مجھے تو یہ بُرا لگے ہے ہیں تو ہم غریب میں نے بھی چار ان کا نام تو نہیں جانوں ہوں ایسے تیار رکھے ہیں لیکن لگ کر نہیں بیٹھی، لو تمھاری ماں نے پائے پکائے تھے سو یہ بھیجے ہیں یہ کہہ کر دستر خوان اتارا تو مچھلی کا جمع ہوا شوربہ اجلی چاندنی اور قالین پر گرا ساس کلیجہ تھام کر رہ گئی اور منہ سے اُف نہ کی اور دل میں کہا بیچے کو کیا جواب دوں گی غرض سہم کر رہ گئیں۔ مچھلی کو خیال بھی نہ ہوا کہ میں نے کیا کیا اب سردار بہو نے اس سے گفتم گفتا شروع کی مچھلی نے کہا دیکھو پھولو دیکھو میں اسی سبب سے نہیں آتی لیکن سردار بہو کس کی سنتی تھیں ایک دفعہ جو سردار بہو اچک کر مچھلی کے کندھوں پر سوار ہونا چاہتی تھیں مچھلی نے جو نیچے سر کیا تو یہ اوندھے منہ پان دان پر گریں کہ پٹاری کا کنارہ بہوں (بھووں) میں ایسا گھسا کہ دو انگل بہوں (بھوں) پھٹ گئی اور خون ڈھل ڈھل بہنے لگا اور قالین، گاؤ تکیہ، چاندنی، مچھلی کے کپڑے، سردار بہو کا دوپٹہ، محرم کرتی، پائجامہ یہ سب ڈوب گئے ساس دوڑیں اور کہا ہے ہے، مچھلی جو شرما کر چلیں تو وہ دستر خوان میں لپٹا ہوا پیالہ قریب گاؤ تکیے کے دھرا تھا اور اس کے پیندے سے شوربہ رس رس کر چکنا دھبا تو قالین پر پہلے ہی پڑ گیا تھا کہ اب جو مچھلی کا پاؤں گھبراہٹ میں پیالے کے کنارے پر پڑا تو سارا پیالہ اوندھ گیا، مچھلی اور گھبرائی اور جھپٹ کر چلی پان دان کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا وہ مچھلی کے دوپٹے میں اٹکا اس نے جو جھٹکا دیا سارا پان دان لوٹ پوٹ ہو گیا چونا، کتھا، چھالیہ، زردہ سب قالین پر اور گھر میں یہی قالین ہے۔ جس کو سردار بہو کی ساس نے قرض اس وجہ سے لیا تھا کہ اس پر بہو بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہو گی غرض ساس نے ریشم جلا کر زخم میں بھرا اس پر خون نہ بند ہوا تو سفید مکڑی کا جالا تیل میں ڈبو کر لگایا، اگر ایسا موقع ہو تو برف رکھی جائے یا برف نہ ہو تو ٹھنڈے پانی کی گدی کہ سردی سے خون رک جاتا ہے اور جو لوگ کہ ریشم یا راکھ بھر دیتے ہیں ان کا زخم اچھا ہونے کے بعد سیاہ و بدنما داغ رہ جاتا ہے یا جو صاحب زخم کو اور صاف نہیں رکھتے میلا

نشان باقی رہتا ہے جو تمام عمر نہیں جاتا۔ اب بہو کے سر پر پٹی باندھی پھر تو بہو کو گھر سر پر اٹھانے کا بہانہ مل گیا "ہائے مری اوئی سیا مری، مینا چلتے ہی گلا کیوں نہ گھونٹ ڈالا۔" غرض ساس نے قالین، چاندنی، گاؤ تکیے دھو کر پھیلا دیا۔ یہ دھبے کب جاتے تھے یہ تو چاندنی ہے اگر گوار پر آدمی کا خون لگ کر خشک ہو جاوے تو جب تک مستقل نہ ہو دھبا نہیں جاتا یہ گھر ان دونوں گھروں سے اچھا ہے سو اس کا یہ حال ہے۔ اب ماماں بیچاری کیچڑ میں لت پت ایک پاؤں میں جوتی ایک پاؤں ننگا دوسری جوتی ہاتھ میں موری کی کیچڑ اور گوبر سے لتھڑی منشی جی کے گھر آئیں ماماں نے منشی جی کی اس کا یہ حال دیکھ کر ایک لمبا قہقہہ لگایا چوں کہ پان رمضانو نے ابھی کھایا تھا بے ساختہ ہنسی سے لعاب دار پیک زردے کی اس کے چھینٹے، دوپٹے، کرتے پر گری اور پھولو تو پھولو ہی تھیں یہ تو مارے ہنسی کے لوٹ گئیں، پتھر کا ستون قریب تھا ایسی ٹکر لگی کہ کنپٹی میں گومڑا پڑ کر کسی قدر خون نکل آیا ان کی ساس نے کہا بیٹا یہ کیا شرافت ہے ہمدردی سے تو گئیں گھر آتے پر ہنستی ہو، پھولو نے کنپٹی دباتے ہوئے ساس کو ترخ کر جواب دیا کہ چلو بے زہر خندہ ہنسی ہنستے ہوئے ہمارے آپ چوٹ لگ گئی اتنا کہہ کر پھر لوٹ گئیں چنانچہ ساس غریب نے گرم پانی کا لوٹا تمڑے سے انڈیل کو ماماں کی کیچڑ دھلائی یہ بیچاری دعائیں دیتی رہی، اسے صحن چی میں بٹھا کر انگیٹھی قریب رکھوادی اور پرانی رضائی اس پر ڈال دی چنانچہ ماماں بڑی دیر میں آئی۔ میں نے اُس سے یہ قصہ سنا یہاں میاں بتا اور گبدو میں لات گھونسا تھپڑ چل رہا ہے گالی چیخ رہی ہے کالے کتے نے ایک کی پنڈلی جھنجوڑی گھتو اور گھتو میں کونسا گالی چل رہی ہے، میاں کچھی رو رہے ہیں طوطا بلی کے منہ میں ٹیں ٹیں کر رہا ہے، کالو کتے نے بھونک بھونک کر گھر سر پر اٹھا رکھا ہے، مرغ اور دونوں اور مرغیاں کٹ کٹا رہی ہیں حلال خوری چیخ چیخ کر منع کر رہی ہے غرض محلہ جاگ رہا ہے، اس عرصہ میں میاں ڈھالو غصے میں باہر آئے اور آواز سے کہا کون پاجی اس گھر میں آ کر رہا ہے اتنے میں میاں گنڈو لب معشوق حقہ ہاتھ میں لیے دم لگاتے باہر آئے اور کہا نکلو بے باہر تمھاری ماں کا پاجی... میاں بتا اور گبدو یہ سُن کر گو اور کیچڑ میں لت پت باہر آئے بتا نے یک دیکھی نہ دوک ڈھالو کا ہاتھ پکڑا ایسی اڑنگی ماری کہ ڈھالو کا سر دیوار سے ٹکرا کر پھوٹ گیا، ڈھالو تو خون سر سے پونچھتے گھر کو ہو لیے اور گبدو گنڈو کو جا لپٹے ان کے لپٹنے سے چلم کی آگ ان دونوں پر پڑی محلہ کی مسجد کے ملاجی ادھیڑ عمر کے آدمی ڈاڑھی گھن دار اور ناف تک لمبی تھی اسی چلم سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ ملاجی کی ڈاڑھی میں ملاجی کو بالوں کے جلنے کی چراند اور چرچراہٹ آئی تو جلدی سے ملاجی نے ہاتھ ڈاڑھی پر مارا جس سے ہتھیلی پر چرکا بیٹھا اور کوئلہ اور اندر، غرض باتوں باتوں میں ملاجی نے جس ڈاڑھی کو ہاتھوں چھاؤں رکھا تھا بجائے ڈاڑھی کے گل مچھے رہ گئے اور وہ کوئلہ ان کی رضائی کے بغل میں آ گیا، جب ملاجی کو کپڑ گند آئی اور رضائی میں سے دھواں اٹھا تو لاحول پڑھ کر رضائی کو جھٹکا وہ کوئلہ چیخ کر منشی جی کے منڈاسے پر بیٹھا جب منشی جی کے سر میں گرمی پہنچی تو انھوں نے منڈاسا سر سے اتار کر پھینکا، وہ منڈاسا ایک بچے کے گلے میں جا پڑا اس بچے نے جو گھبرا

کر آڑے سیدھے ہاتھ مارے تو گردن گلے ہاتھ وغیرہ میں چرکے لگ گئے اس عرصے میں کچھ راہ گیر، کچھ محلے والے جمع ہوئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا، محلے والے اپنے اپنے گھر گئے اور راہ گیروں نے راہ لی میاں ڈھالو اپنے گھر آئے بیوی جلی ہوئی تو تھیں ہی میاں کو لہولہان دیکھ کر بے ساختہ بولیں آیا نا گھوڑا مونڈی کاٹا لہو بہائے میرے اوپر کیسے دیدے لال کرتا ہے ان کا نہ کچھ کر سکا، میاں ڈھالو غصّے میں تو تھے ہی جواب دیا کہ اری تو کیا جانے میں بھی ایسا رپٹا دوں گا کہ رہے نام سائیں کا کہ تمام عمر یاد کرے گا بیوی بولیں ارے رپٹا مارنے والوں کا تو نے مُنہ بھی دیکھا ہے رپٹا دیں گے، بیچارہ ڈھالو بولے بھُس بھر دوں گا۔ بیوی بولیں گھانس کھا گھانس۔

ہمسایہ کا دوسرا دن

میاں بتا شام کو مزدوری کر کے گھر آئے بیلوں کو کٹی سانی وغیرہ دی، روٹی مانگی گھتو نے کہا اٹھا لے وہ ڈلیا چارپائی کے نیچے پڑی ہے اور دال کا پیالہ دیکھ وہ سل پر پڑا ہے۔ بتا نے جو دال کا پیالہ اٹھایا تو کئی مکھیاں تو اس میں مرگئی ہیں اور چند جیتی پاؤں اور پیر مار رہی ہیں، وہ کالے ارد کی مع چھلکوں کی پکی ہوئی دال جس کا نیلا پانی الگ دال الگ اوپر گھی کا ترمرا جو سردی سے جم گیا ہے تو دال پر کالی مٹی کے پیالے کے کنارے پر مٹیلی سی پپڑی جم گئی ہے بتا نے دال کو دیکھ کر اری یہ کیسی دال پکائی گھتو بولی جیسی پکتی ہے اور کیسی غرض میاں بتا روٹی کھانے بیٹھے ابھی بھوک کی تیزی میں دو چار ہی نوالے نگلے تھے کہ گھتو بولیں ارے کلی کے باپ تو سنے ہے کہ نہیں شبو میں تو اپنے کلی کو گھوڑی چڑھاؤں گی چاہے کچھ ہو کل خالہ بلسو آئی تھی اُس نے کہا کہ اری گھتو تیرا بچہ اب ڈھائی برس کا ہو گیا ہے اگر تو گھوڑی نہ چڑھائے گی تو یہ گدھے کا گدھا رہ جائے گا پھر تو سر پہ ہاتھ دھر کر روئے گی تو میں تو چڑھاؤں گی تو سیدھا سن یا الٹا میں تو چڑھاؤں گی مجھے تو اب یہی چڑھی ہے چڑھاؤں گی تو اس کان سن یا اُس چڑھاؤں گی بتا نوالہ چباتے ہوئے بولے او گدھی تائیں تائیں کرے جاتی ہے گھتو نے کہا دیکھو تو تائیں تائیں مت کہیو میں بھی شریف خاندان کی ہوں، میرے باپ نے سدا گو کمایا پر کبھی نہ بیٹھنے دی اور میرے دادا نے سدا جھاڑو دی پر دھول نہ اڑی اور میں نے سب کچھ کیا جو چاہا پر بو نہ پھوٹنے دی بتا بولے کیا بلسو باقی کی سر رہی نہ تھی یہ کہے بغیر بس تیرا سُن کر پیٹ پھول گیا گھتو نے جواب دیا کہ تو مجھے اس بات میں مت ٹوک رے نہیں تو تیرے مُنہ پر جھاڑو پھیر دوں گی اور خاک الگ اڑاؤں گی گھوڑی کی سُن کر تو تجھے بد ہضمی ہو گیا بتا بولے تو تو چپکے کو کی طرح لپٹ گئی ہے نا جھگڑی بدنامی کا تو کرہ میں نے جنگ مارا کو کھایا جو تجھ کو گھر میں ڈالا نہ ڈالتا نہ دھول اڑتی گھتو بولیں دھول کا بچہ گھوڑا کھا کی تیرے ہاں بچہ کہاں، تو کیا جانے بچے کی قدر اپنے مرغ کی ایک ٹانگ کہے جاتا ہے۔ بتا نے کہا اری چڑھائے کیوں تو ہی نہ چڑھ جا گھتو ہاں ہاں چڑھوں گی اور تیرے ہاتھ میں کانے کا ٹھیکرا دوں گی جب تو نام نہیں تو میرا نام گھتو نہیں۔ اس دن رات کو اپنے مُنہ سے کیوں گو کھایا تھا کہ جو کہے گی سو کروں گا لے اب کرتا کرتا کیوں

نہیں میں تو تیار ہوں۔ بنتا بولے نکال اپنی کتی میں سے دیکھوں تیرا کمایا ہوا کیا جیبہ ہے۔ گھنوار سے تو اور میرا جیبہ میرا جیبہ میرے۔ جیبہ دیکھنے والوں کا بڑا منہ چاہیے، جو میرا جیبہ دیکھتے ہیں وہ تجھ جیسے سے بتانے میں لوٹا بھی نہ دھروائیں بنتا نے کہا ارے رہ تیری جیسی پینسٹھ ماں بہت سی ٹھوکھاتی پھرتی ہیں گھنو بولیں بس بہن نہ کہیو چہرہ تو دیکھو کیا نام جو رات کو بولے ہے، آنکھیں جیسی قارورے کی شیشیاں، دانت جیسے ڈلاؤ میں کرم ارے میں ہی تھی جو تجھ کو بھگتا۔

آخر میاں بنتا راضی ہوئے اور تاریخ مقرر کی بی گھنو نے بلاوے بھیجے غرض مہمان آنے شروع ہوئے پہلے بنتا کی چچی آئیں اُن کا کالا رنگ اوپلا سا چہرہ ایک آنکھ سیتلا میں خراب ہوگئی ہے تو ایک ٹینٹ ابھرا ہوا کہیں سے ملگجا کہیں سے سفید کچھ زرد لال لال رگیں نمایاں ہیں چپٹی ناک، چیچک رو گردے سے ہونٹ زرد اور سیاہ دانت تھوڑی لمبی موٹا ڈیل سر پر لال قند کا دوپٹہ جس میں اودی گوٹ لگی گلے میں موٹی چھینٹ کا کرتا بے پٹی کا گریباں بوتام کی جگہ سبز گھنڈی لگی لیکن گریبان اتنا کھلا ہوا کہ سینہ اور ڈھلی ہوئی چھاتیوں کے آدھے آدھے حصے نظر آتے ہیں چھ بچے سات اللہ رکھو ساتواں پیٹ پورے دنوں کا ہے، ٹانگوں میں کالی چھینٹ کا ڈھلا ہوا پاجامہ جس کی چھینٹ ڈھل کر بدرنگ ہوگئی ہے۔ پاؤں میں ادھوڑی کی جوتی الٹی نوک کی جس پر سبز و سرخ زرد کڑیاں بنی ہیں مجلی اور رانگ کانسی پیتل کا زیور انوٹ۔ بچھوے۔ جھنگری۔ چنگی۔ پکھان بلے۔ بجے۔ تھیا۔ گجری۔ تحتی۔ چوکڑا۔ مرکی۔ بندہ۔ کنگن۔ بازو۔ لبیسی۔ انجری۔ ڈھار۔ ہار۔ بازو۔ ہمیل۔ لالا۔ ٹپلوا۔ ست لڑا۔ بالا۔ بالی۔ جھمکے۔ موہن۔ مالا ٹیکہ۔ ٹروا۔ چھندن۔ بندان۔ چھمن۔ مجھلی۔ یہ سب زیور میلے اور گھسے پٹے تین برس کا بچہ گود میں ننگے سر نیلا کرتا پہنا ہوا گلے میں جھگا ہوا دودھ پی رہا ہے اور یہ ایک ہاتھ سے کرتا اٹھائے دودھ پلا رہی ہیں ابھرا ہوا کالا کالا پیٹ جس کی ناف تک الٹ گئی ہے اور ناف کی سلوٹوں اور نشیب میں جو کالا کالا میل بھرا ہے وہ نظر آ رہا ہے۔ ایک تین برس کی لڑکی ان کا پاجامہ پکڑے جس کے کھینچنے سے اس کی میانی ایسی تنی ہے کہ سیون کے ٹانکے تک کھنچ گئے ہیں دوسری طرف دوسری لڑکی ران سے لپٹی، تین بچے پیچھے پیچھے یہ دروازے سے آئیں بغل کا تازہ گوبر پڑا تھا ان کا پاؤں اس چوتھ پر پڑا اور ٹخنے تک غرق انھوں نے جوتی اتار کر پانی پینے کے مٹکے جو گھڑونچی پر کورے بھرے ہوئے تھے اُن سے کھٹ کھٹائی کہ کچھ گوبر کی پھٹکیاں مٹکے پر چپک گئیں۔ گھنو نے کہا آ چاچی آ بیٹھ جا چاچی ابھی اچھی طرح بیٹھیں نہ تھیں کہ چاچی کے بچوں نے دنگا شروع کیا ایک نے گلے میں پتھر پھینکنے شروع کیے کسی نے کسی بچے کو مارا ایک نے ایک بچے کے کاٹ کھایا۔ اب اور مہمان آنے لگے چھوٹا مکان ڈیڑھ سو مہمان تل دھرنے کو جگہ نہیں اب مرد آنے شروع ہوئے کوئی گلی میں کھڑا ہے کوئی موری کے پتھر پر بیٹھا ہے، ایک کھنڈر میں دیگیں کھنک رہی ہیں پانی دیگوں کا گلی میں بہہ رہا ہے کہ جو آتا ہے پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں، مہمانوں کے بچے جو دوڑ دوڑ کر اس کیچڑ میں جاتے ہیں تو راہ گیروں پر چھینٹیں پڑتی ہیں، کچھ مہمان کھنڈر میں اینٹوں پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں دھوئیں کے مارے برا حال ہے

آنکھوں سے آنسو، ناک سے پانی بہ رہا ہے، رنگ چہروں کے لال ہو گئے ہیں۔ گلی میں برف والے، لونگ چڑے والے، کچالو والے آ گئے ہیں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی زنانے میں ایک بچہ اپنی ماں سے کہہ رہا ہے لا اسری لا پیسہ دے برف کھاؤں گا، ایک بچے نے ایک بچے پر کلی کر دی اس کی ماں نے کہا او رے الو کے جام کیا ماتھے کی پھوٹ گئیں تجھی کیوں کر دی کلی کرنے والے نے کہا چپ رہ الو کی پٹھی اور اپنی ماں سے کہا دیکھو ری یہ مجھے الو کا جام کہے ہے اس کی ماں نے کہا کہ تھو تھنی تو مسل گیروں گی بھلا اب کی کہیو، اس نے جواب دیا تھو تھنی مل اپنے رہوں سموں کی اب کیا تھا کچھ اس طرف سے بولیں ادھر شہنا نوازوں نے دروازے پر آ کر شادیانہ بجایا، نوبت والوں نے نوبت شروع کی، انگریزی باجے والوں نے باجا بجانا شروع کیا ادھر بنانے آواز دی کہ دولھا کی ماں کو بھیجو ادھر ایک عورت نے دوسرے کو دھکا دیا وہ مٹکے پر گری مٹکا انگنائی میں پھوٹا مہمانوں کو بیٹھنا تو ایک طرف کھڑے ہونے کو جگہ نہیں پانی سے عورتوں بچوں کے کپڑے بھیگے بچوں نے موری میں پتھر ٹھونس دیے تھے اس سے پانی صحن میں کھڑا ہو گیا تھا ادھر دروازے پر کہار غل مچا رہے ہیں کہ کرایہ بھیجو، کچھ فقیرنیاں اور کنجریاں کہہ رہی ہیں دولھا کی کھیر کوئی نکوا ل جائے، چار پانچ شہدے کھڑے ہیں پہلے ایک شہدا کہتا ہے ابھی سازگاری ہو سب شہدے مل کر کہتے ہیں آمین۔ دولھا کی ماں کسی سے الگ لڑ رہی ہیں اس عرصے میں تانگے کا ٹٹو جس پر بجائے چار جامے کے کمبل جو پرانے بان کی رسی سے کسا ہے آیا اب غل ہوا دولھا کو بھیجو غرض دولھا کے گلے میں زرد اچکن، سرخ پائجامہ، سرخ منڈاسا اس پر سہرا بندھا کہ میاں گبدو اچک کر ٹٹو پر چڑھے کلی کو گود میں لیا شہنا نواز نے شہنا بجائی، دم تالے والے نے سر دیا اور مرفہ والے نے تھاپ دی انگریزی باجا بجا آگے تاشے والوں کی برادری میاں مستا ستہ پہلوان کسرتی بدن سر پر ایک عباسی دوپٹہ جس کا شملہ کولھوں سے نیچے تک لٹکا ہوا اس پر دھوئیں کا چھوٹا گوٹا لپٹا، گلے میں چھوٹے چھوٹے چاندی کے تین تعویذ جن کی جلا پر وازمیں میں میل اٹ کر کالی کالی لکیریں نظر آتی ہیں میلا ڈورا پہونچے کے ہاتھ کا جس کی کرک، ٹھمنی، بیچوان پلنے، بٹر، چپکتے ہوئے، گلے میں کالی بانات کی کمری جس پر زرد بانمیں کا چاروں طرف حاشیہ، مونڈھے مداخل بنے ہوئے، ٹانگوں میں لٹھے کا پائجامہ آڑا سیلا لیکن چست سپاٹ جوتا پاؤں میں، یہ پہلوان پہلے ہی سے کنورہ لیے گلی کے باہر کھڑے تھے انھوں نے ڈھول تاشا شروع ہوتے ہی اپنے کنوروں کو لے میں یہ کہہ کر ہاں میاں بجانا شروع کیا اب خدا خدا کر کے یہ غل کلنے سے دور ہوا اور محلے والوں کے کان ٹھنڈے ہوئے یہ سب دولھا کو لیے گشت لگاتے چلے اگر راستے میں کسی بھٹیارے یا نان بائی کی دکان ملی تو میاں گبدو نے اس کا نام کر سو بے ڈھولا بے کہہ کر پکارا اور چل دیے اب یہ سب دولھا کو لیے جامع مسجد پہنچے دولھا کو لے کر اندر گئے اور تبرکات کو سلام کرایا پھر وہاں سے ٹھہرتے ٹھہراتے گشت لگاتے دس بجے کے بعد رات کو واپس آئے پھر محلے میں وہی طوفان تھا اور یہ مثل صادق تھی کہ غیر کے گھر شادی میرے کھٹ کھٹا، یہاں

مہمانوں کے بچے بھوک کے رو رو کر سو گئے اب پھر سلامی اتری اس کے بعد غل ہوا کھانا کھلاؤ یہ سن کر باورچیوں نے دیگوں کے دم توڑے اور کھپ پے سے سالن کو بھرا یا چودھری صاحب آستینیں چڑھا دیگ کے قریب ایک پرانی پیڑھی بچھا کر بیٹھ گئے اور باورچی نے دیگ آڑی کر کے اُن کے آگے لگا دی، چودھری صاحب نے بائیں ہاتھ میں مٹی کا پیالہ اور داہنے ہاتھ میں لوہے کا بسچا بدقلعی لے کر دیگ پر جھکے، ایک لڑکا مٹی کے تیل کی ٹین کی ڈبیا لے کر آیا جس کی تلی کا بھبال کھلا ہوا اس کی وجہ سے بالشت بھر کی لو نکلتی اور کاجل کے ذرے لو پر پہلے سرخی پھر سیاہی دے رہے ہیں اور پھر وہی ذرے ٹکڑے بن بن کر حرارت کی تیزی سے اوپر اٹھ کر چاروں طرف ہوا میں اڑ رہے ہیں، کچھ مہمانوں کے کپڑوں، کچھ دیگ کے شوربے پر چودھری نے ڈبیا والے سے جھنک کر کہا اب ہاتھ آگے لا نمک حرام اُس نے جھٹکے سے جو ہاتھ آگے کیا تو ڈبیا رسنے کی وجہ سے پیندے میں چند بوندیں پہلے ہی لٹک رہیں تھیں، اس جھٹکے سے وہ بوندیں اور کچھ تیل دیگ میں گرا جس سے سارا سالن مہک گیا اب چودھری نے پیالوں میں سالن نکالا مہمانوں نے کرائے کی میلی دری جو پرانی ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے چھید پڑ گئے تھے اس کو اینٹوں پر بچھایا اونچے نیچے بیٹھ گئے گبدو نے خمیری روٹیاں جو دن سے پک کر آ گئیں تھیں اور کھلی پڑی رہنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہو کر اینٹھ اور اُن میں باسی پن پیدا ہو گیا تھا وہ لا کر دو دو مہمانوں کے ہاتھوں میں دینی شروع کیں اگر کسی نے کہا کہ ایک روٹی اور دو تو گبدو نے گرم ہو کر کہا اب بے صبرے یہ تو کھا لے اور لے لیجیو، یہ مہمان روٹیاں ہاتھوں میں لیے آسمان کے نیچے، سردی مہاوٹ کا زمانہ اُس بارش کی طرح برس رہی ہے کسی نے روٹی دری پر رکھ دی۔ جس پر یہ سب مع جوتیوں بیٹھے ہیں، کسی نے روٹی سالن کے انتظار میں بھنبھوڑنی شروع کی اب پیالے آنے شروع ہوئے فرش ایسا کہیں سے اونچا کہیں سے نیچا کسی کے چوتڑ میں اینٹ کا کونہ چبھ رہا ہے پھر بیٹھ اس کثرت سے گئے ہیں کہ سرکنے کی جگہ نہیں کسی نے اپنے بچوں کو آگے بٹھالیا ہے کوئی کہہ رہا ہے اب جلدی لاؤ اب پیالہ مہمانوں کے آگے رکھے گئے پیالے رکھنے والے نے کہا بھائی پیالہ کم ہیں ایک ایک میں چار چار بیٹھ جاؤ اب کسی کا پیالہ ٹیڑھا ہو کر تمام شوربہ دری پر کسی نے ناک سنک اور رینٹ کا لوتھڑا انگلی اور انگوٹھے میں لٹکا کر دری سے ہاتھ مل دیا کہ زرد رینٹ کا پھیپا نیلی دری پر روشنی میں چمکنے لگا اور کچھ رینٹ کا حصہ انگوٹھے اور انگلیوں میں لگا رہ گیا اسی ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا توڑ ہاتھ پیالے میں ڈبو دیا اور ایک بوٹی جو پیالے میں تھی اُسے انگوٹھے اور انگلیوں سے مل کر اس کا چیچڑا ہاتھ میں لے چوس کر پھینک دیا ساتھ کے کھانے والے گھن کھا کر الگ ہو گئے اور کہا کہ میاں گبدو ایک پیالہ سالن کا اور لانا گبدو بھلا کہہ کر غائب ادھر چودھری نے آواز بسم اللہ چھوڑ، وہ دو آدمی مٹی کی بدھنیاں اور دو دو کے مٹی کے کلہڑے لے کر پانی پلانے کو کھڑے ہوئے کسی نے کہا ذرا سا تار دو کوئی بولا چودھری ایک بوٹی بے دریغ، کسی نے کہا ہمارے پیالے میں تو ہڈیاں ہی ہڈیاں بھر دیں نہ تار نہ بوٹی، کسی بچے نے ہوکے کے مارے گرم گرم ساری بوٹی منہ میں رکھ لی اور

منہ کھول کر کہا تا آن، اس کے باپ نے اُس کے منہ کے آگے ہاتھ لگایا اور کہا اے تھوک اس نے چچی ہوئی لیس دار بوٹی باپ کے ہاتھ میں اُگل دی انھوں نے وہ بوٹی پیالے کے پاس رکھا اپنے ہاتھ کو گھٹنے سے پونچھا تھا کہ اتنے میں بچے کا ریشہ اور لنگ پڑا پھر انھوں نے اُسی ہاتھ سے اس کی ناک پونچھ ہاتھ کو ایسا جھٹکا دیا کہ ایک صاحب بڑا سا منہ کھول کر نوالہ منہ میں رکھنے والے تھے کہ وہ ریشہ ان کے حلق میں انھوں نے تھنکار کے اور اپنے داہنے ہاتھ سے جس میں نوالہ تھا اُس کی پشت سے اپنے سالن میں لتھڑے ہوئے ہونٹوں کو پونچھ کر کہا واہ بے اُلّو یہ کیا کیا یہ سُن کر یہ نیچی نظر کر گردن جھکا کر ہنسنے لگے۔ کسی نے ہڈیاں اس طرح کڑاک کڑاک چبائیں جیسے رات کو بھوکا کتا کھنڈر میں چباتا ہے اور عرق چوس چوس کر روٹیوں کے قریب۔ کہہ دیں اب کوئی صاحب کھانا کھا کر اٹھے تو دری کا کونہ اٹھا کر منہ پونچھا وہ مٹکے کورے جو کھنڈر کے کونے میں مہمانوں کے واسطے اینٹوں پر بھرے رکھے تھے ایک صاحب پہنچے اور کاغذی مٹی کا آب خورہ برابر مٹکے کے ایک اینٹ پر رکھا تھا جس کے قریب کو کر بھنگرا اکھڑا ہوا ہے اور قریب ہی اُس اینٹ کے دوسری اینٹ پر کوئی کتا پتلا گو اس طرح ہگ گیا ہے کہ آدھا گو اینٹ پر اور آدھا نیچے انھوں نے آب خورہ اٹھا سالن کا بھرا ہوا ہاتھ یہ سمجھ کر کہ آدھا مٹکا ہو گا اپنے اندازے کے موافق ڈالا وہ مٹکا گلے سے کچھ ہی خالی تھا ان کا ہاتھ آدھی کلائی تک مع آب خورے کے غرق کر ان کی آدھی آستین بھی تر ہو گئی اور پانی پر چربی کے تر مرے تیرنے لگے، انھوں نے آب خورہ منہ سے لگا مٹکوں کے قریب دیوار پر کلی اس زور سے ماری کہ دیوار سے پانی چھٹ کر کچھ تو کلی کا پانی دونوں کھلے ہوئے مٹکوں پر کچھ اندر باقی ان کے کپڑوں پر چھینٹیں پڑیں اب پان کی سینی آئی کسی نے ایک ٹکڑے کی جگہ تین تین ٹکڑے منہ میں رکھ لیے، بچے آ کر سینی سے لپٹ گئے کسی بچے نے ایک ہاتھ ایسا مارا کہ آدھی سینی کے پان کچھ ہاتھ میں کچھ نیچے گرے اور چھالیہ چوں کہ کھلے ہوئے ٹکڑے تھے کچھ گری کچھ سینی میں اور ہنستا ہوا بچہ بھاگ گیا۔ غرض کسی کو پان ملا، کوئی زردہ کھانے والا مانگتا ہوا چلا گیا ایک نے آواز دی اے او نائی کے جلدی سلفہ بھر کر لا کہ دم لگائیں اور چلیں رات زیادہ آئی۔ اب میاں ننھا کو خیال آیا کہ زنانے میں کھانا بھیجیں یہ دروازے پر آئے اور آواز دی اری او دودھا کی ماں یہ سر کے درد کے مارے اپنے اپنے بچے کے پاس منہ اوندھائے پڑی تھیں کسی عورت نے آ کر کہا اری گھنو اٹھ دیکھ پھوپا تجھ کو بلاتا ہے گھنو نے کہا اری مجھ کو تو پڑا رہنے دے تو ہی پوچھ آ کیا کہوے ہے یہ گئی اور کہا پھوپا کیا کہوے ہے پھوپی تو درد کے مارے اوندھی پڑی ہے ننھا نے کہا اُس سے کہو سب کو کھانا کھلا دے یہ سُن کر دوڑی ہوئی آئی اور کہا پھوپی ری کھانے کو کہوے ہے گھنو اٹھیں رات کے ٹن ٹن بارہ بجے مہمانوں میں کوئی عورت سکڑی سمٹی منہ لپیٹے بیٹھی اونگھ رہی ہے، کوئی پٹاری پر سر رکھے سکڑی سمٹی پڑی ہے، کسی نے دالان کی چوکھٹ کو تکیہ بنا لیا ہے، کوئی گٹھڑی بنی۔ سے سہارا لگائے نیند میں جھونکے کھا رہی ہے۔ کوئی کسی کے کولھے پر سر رکھ کر آڑی ہو گئی ہے، کسی کو جگہ نہیں ملی تو پاخانے کے دروازے کے

پاس ٹاٹ بچھالیا ہے اور اسی کی سیلی ہوئی دیوار سے سہارا لگالیا ہے۔ موری کا پانی مہمانوں کی کثرت سے بود اربد رہا ہے چلنے کے واسطے قدم دھرنے کو جگہ نہیں اب کوئی چلا تو کسی کے منہ پر پاؤں پڑا ایہ ہائے مری رے کہہ کر اٹھ بیٹھی اور گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا اری کیا تیرے دیدے پٹم ہیں کہ اندھی ہو کر منہ پر پاؤں رکھ دیا اس نے جواب دیا کہ تو کیوں بیچ میں پسری ہے کہاں سے چلیں، اب غل ہوا کھانا کھاؤ مہمان اٹھے کسی نے اپنے بچے کو اٹھایا اور کہا ارے نلو اٹھ روٹی کھالے، ارے اُلھنا لے دیکھ تو وہ روٹی آئی یہ بچہ آنکھیں ملتا اٹھا اور کہا لالا اس کی ماں نے کہا اب روٹی آئے ہے کسی نے آواز دی اری چھوری دھولو اٹھ کوئی بولی اری دلہن اے دلہن لے اُلھنا روٹی آتی ہے غرض میاں بتنا رونیوں کا دسترخوان۔ جس میں کچھ روٹیاں جو مردانہ میں سے بچیں تھیں کچھ کنارہ کچھ آدھی کچھ ٹکڑے کوئی ثابت روٹی سالن میں تھتھڑی ہوئی لا کر دیں اور کہا کھاؤ سالن آتا ہے۔ چودھری تو گئے اب میا گبدو سالن نکالنے بیٹھے انھیں جھوٹے پیالوں میں۔ جس میں چربی اور گھی جم کر کناروں پر لگ گیا ہے اب ایک عورت کھڑی ہوئی اُس نے ایک ایک روٹی ثابت اور ایک ایک روٹی کے برابر ٹکڑے بانٹنے شروع کیے نیند اور بھوک میں ان غریبوں کو غنیمت معلوم ہوئے کوئی سالن کا پیالہ لے کر چلی بیچ میں بچاری نے ٹھوکر کھائی پیالہ ہاتھ سے چھوٹا ایک عورت کے سر پر پڑ کر چھوٹا تمام سالن اس کے دوپٹے پر جو ماتھے کا تھا پڑا باقی بالوں میں، چہرے پر اور آنکھوں میں اور یہاں سے سالن اوچٹ کر ایک دو کی آنکھوں میں، یہ نوالہ چھوڑ کر آنکھیں ملنے لگیں ان کے ہاتھ جو سالن میں بھرے ہوئے تھے اس وجہ سے اور مرچیں لگ گئیں اب کھانا کھا کر کوئی لیٹ گئی کوئی پان کھا کر لیٹی اور لیٹے لیٹے دیواروں پر پیک تھوکنی شروع کی، چھوٹا سا مکان بہت مہمان چاروں طرف دیواریں اجارہ تک پیک سے لال اور بلغم کی کثرت سے روغنی ہو گئیں۔ اب صبح ہوئی سب انھیں ایک نے ایک کو جھنجوڑا اب پھر غل غپاڑہ ہونے لگا ایک بڑھیا نے گھنو سے کہا کہ لاری بلجان کر لیں نہیں تو نامعلوم کتنے دنوں ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گھنو نے ایک اکنی نکال کر دی دو دو پیسہ سب نے دیے اس کی پکوریاں آئیں ایک نے ایک سے کہا اری بلجان گالیں ایک ڈھولک لے کر بیٹھی۔ پکوریاں آئیں ایک نے کہا لوری گاؤ ایک بولی میں تو نا گاؤں ہوں۔ جس کے آگے ڈھولک رکھی تھی اس سے کہا بجا لیکن خوب بجائیو یہ کہہ کر خود ایک لیں سی آ کی پھر آ بول ندارد۔ جب دس بارہ دفعہ آ کر چکیں تو ایک نے کہا تو تو آ ہی آ کیے جاوے ہے کیا کسی کو بلاوے ہے اری بول نکال بول اُس نے کہا ٹھہری رہ نکالوں ہوں مجھے یاد ہے، ایک کے آگے ڈھولک رکھی تھی اُس سے کہا لے ری بجا اور تو نہیں جانتی تو لا مجھے دے میں بجاؤں یہ کہہ کر ڈھولک لے لی اور الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگی اور کہا میں اور تو سب کام جانوں ہوں ایک ڈھولک ہی نیوتی نہیں آوے ہے اتنے میں حلال خوری آئی اور ٹوکرا رکھ ان کا تماشا دیکھنے لگی جب حلال خوری نے یہ دیکھا کہ یہ سب نسوت عورتیں ہیں انھیں کچھ نہیں آتا تو یہ بیٹھ گئی اور کہا لو میرے ساتھ گاؤ یہ کہہ کر اس نے نہایت سریلی آواز سے اتری رکھب پر پھیر دیں الکی شروع کی کہ

دل میں برچھیاں لگانے والی اور وہ دل تڑپانے کی حرکتیں سر میں ڈوبی ہوئی اور تانیں اور مرکیاں شروع کیں اور یہ لفظ نکالے (کہ برخوردار ہیں بی بلجاں) لیکن ڈھولک ندارد، حلال خوری نے کہا کہ کسی کو ڈھولک بجانی آتی ہے ایک عورت بولی میں ایسی بجاؤں ہوں کہ بڑی بڑی میری ڈھولک کے آگے کان پکڑے ہیں حلال خوری نے کہا کہ بیوی لو بجاؤ کہ آؤ جاؤ معلوم ہو، جو ڈھولک لیے بیٹھیں تھیں انھوں نے کہا بتاؤ حلال خوری نے کہا کہ سیدھا ٹھیکا دھیما لگاؤ لیکن ذرا جلدی جلدی نہیں لے گاڑ کر بجانا اس نے پانچ سات دفعہ جلدی جلدی بندر کی طرح ہاتھ مارے اور کہا لے گا گاتی کیوں نہیں بس اسی پر کہتی تھی کہ میں گاؤں ہوں۔ حلال خوری نے کہا بجاؤ تو سہی ڈھولک والی نے کہا کہ بجایا تو تیرے دیسی بھی تیری تیز بھی اب تو جو کہے بجاؤں حلال خوری نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا کہ تم کو کچھ نہیں آتا نری بیوی ہی ہو، ڈھولک والی بولی کیوں چاچی سچ کہیو اس دن ماں کی شادی میں میں نے کیسا گایا تھا کہ سب محلے والیاں اور دولہا والیوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے وہ تو ذرا آج بھول گئی ہوں حلال خوری اٹھی کہ جاتی ہوں گھنو بولی بہو تجھے قسم ہے گھوڑی بیٹھ تو سہی لے ڈھولک تو ہی لے لے حلال خوری نے کہا بیوی میرے ہاتھ رگ میں بھرے ہیں اور ابھی کمانا پڑا ہے بیوی گھنو بولیں اری کیا ڈر ہے ڈھولک بجا اب حلال خوری نے ڈھولک خود ہی بجا کر جو گایا کسی نے دوہا خوب لکھا ہے (دوہا) مل مدہ روپ مدراج مدبد یہامد سوحد + جب او بجت ہیں راگ مدہ سب ہی مد ہیں رودہ + میں بھی دیوار کے پاس کھڑا ہو کر سنتا رہا جب حلال خوری گا چکی تو گھنو نے ایک پیسہ نکال کر دیا اور کہا لے اور ایک پان کا ٹکڑا اور بلجان کی پکوریوں میں سے ایک پکوری دی حلال خوری لے کر چلی گئی اب پکوریاں بٹیں اب گھنو نے ایک بچے سے کہا ارے للوا ذرا گلی کے نکڑ پر کو ہانک ماریو، للو گئے اور میاں جمتا اپنے دوستوں کے ساتھ کھنڈر میں انہی اینٹوں پر دری بچھا کر سو گئے تھے اب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں ایک دیگ میں کچھ بے رونق گلا ہوا سالن بچا ہے پانچ چار گلی کے کتے ہڈیاں چبا رہے ہیں کہ للو نے کہا ماموں تجھے ماں بلاتی ہے جمتا نے اٹھ کر دروازے پر باہر گھنو کو آواز دی گھنو آئیں اور جمتا سے کہا کہ اب مہمانوں کو کیا کھلائے گا جمتا نے کہا رات کا سالن بچا ہے اور تنور کی روٹی گھنو نے کہا جلدی کر جمتا کھنڈر میں آئے اور گبدو سے کہا کہ لے چھ روپیہ لے اور آٹا لے کر جلدی سے تنور کی روٹی پکوا لا تا کہ یہ جھگڑا اپنے اپنے گھر جاوے، میاں گبدو روانہ ہوئے اور آٹا لے کر تنور پر آئے کونڈے میں ڈال کر اپنے آپ اول جلول ٹکیاں مار کچھ گندھا کچھ بے گندھا بھٹیارے کو دیا اور کہا جلدی پہلے ہماری لگا دے، بھٹیارے نے پیڑے بنا روٹیاں لگائیں آٹا ہی خراب گندھا تھا دوسرے تیز تنور اکثر روٹیاں بھوبل میں گر کر خاک آلود ہو گئیں، میاں گبدو روٹی ایک ٹوکرے میں بھر کر لائے سالن گرم ہوا انھیں بے دھوئے پیالوں میں جس میں رات کو کھانا کھلایا تھا سالن نکال کر دینا شروع کیا یہ مہمان خدا خدا کر کے کم ہوئے اور محلے میں امن ہوا۔

پاجی پڑوس

دروازہ پر دروازے ہے گھو بخشی کے کارخانے دار تیس پاڑیں ہیں کچھ کھڑی کچھ بیٹھی پاڑ دو تین جوڑ والے بٹن والے صبح سے جو کھڑ کھڑ شروع ہوتی ہے تو رات تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک دن چار گھڑی دن رہے میاں گھو نے مجھے بلایا میں اندر گیا تو آواز دی ابے چھٹو ہمارے میر صاحب کے واسطے تپائی لا دو وہ دوڑ کر تپائی لایا جب وہ تپائی لایا تو گھو خود اٹھ کھڑے ہوئے، زمین اونچی نیچی تھی ایک جگہ صحیح کر کے تپائی کو بچھایا اور کہا لو میر صاحب یہاں آ جاؤ، اتنے میں میاں گھو کے صاحبزادے آٹھ برس کا سن لا لنگر ہاتھ میں، پچھنے کی گٹھی بندھی گئے بولے کہ ابے بچا میر صاحب کو سلام کر یہ لڑکا شرمایا اور نیچی نظر کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا گھو نے گالی دے کر کہا ابے الو کے پٹھے سلام نہیں کرتا (گالی دینے کے واسطے بھی علم کی ضرورت ہے) یہ کہہ کر جھپٹ کر اٹھے اور کان پکڑ کر ایک چپت مارا یہ بیچارہ رونے لگا میں نے میاں گھو سے کہا کارخانے دار آپ نے اسے کیوں مارا تو میاں گھو بولے دیکھو تو اس نے سلام نہیں کیا ہم تو اپنے بچپن میں جہاں کسی بڑے کو دیکھا اور جھک کر سلام کر لیتے تھے میں نے کہا آپ نے اسے کیوں نہیں بتایا یہ سن کر بولے بس میر صاحب بس آپ بھی نرے داستان گو ہی ہیں میاں سلام بھی کوئی ایسا ہے جو نہیں جانتا تو میں نے کہا آپ ہی سلام کر کے دکھائیں یہ سن کر بڑا قہقہہ لگایا اور جوڑوں کی جوتیاں باندھتے ہوئے منہ سے کہا سلاما لیک بس ہو گیا، میں نے کہا بھائی تم کو مناسب ہے کہ پہلے تم اس کو سلام کرو پھر اس سے کہو دیکھوں یوں سلام کرتے ہیں جب سلام کرنا اس کو آ جائے اس وقت سلام کرے گا اس کا کیا قصور ہے جو آپ نے اس غریب کو مارا پھر میں نے اس بچے کو سلام کا قاعدہ بتایا اور اس سے سلام کروایا اس عرصے میں ایک کاریگر ڈھولو نام جھکی کھینچتے بائیں ہاتھ سے اور داہنے سے ہتھوڑا کوٹتے ہوئے بولے میاں کرخندار دس روپے دو میں نے کنکووں کا ہاتھ لگایا ہے اور کچھ آدمی باہر سے آئیں گے گھو بولے میاں تم تو نہ لگ کر کام کرتے ہو روز کی ناغہ اور ریزہ بھی تمہارا خراب آتا ہے پہلے ہی تم پر باقی کے پچاس روپے ہیں اور تم نے باقی میں ایک پیسہ بھی نہیں دیا اور کام آج کل جیسا ہے تم کو خود ہی معلوم ہے پھر میں کہاں سے دوں ڈھولو بولے میاں کرخندار ہم تو لیں گے کل ور جن ستو آتا ہے پرسوں پیچ ہیں ایک ڈھولو کے دوست بولے پیچ لڑائیں گے ابے کچھ بڑھیا کی کتنی بھی ہے بچوں کے رسیا ڈھولو بولے ابے تو کچھ ہاتھ لگالے اگر کچھ پونی رکھتا ہے تو تو ہی لگالے، ڈھولو کے دوست بولے ابے چل ایک ایسا رسید دوں گا کہ کھوپڑی گو کھاتی پھرے گی ڈھولو نے جواب دیا کہ بے مرغی کے اب کے بولا تو ایسی ایک لات دوں گا کہ انتڑیاں باہر نکل پڑیں گی اور آئیں گی وہ پانچ بکڑے سہلاتی ہوئی ڈھولو کے دوست یہ سن کر غصے میں آ کام چھوڑ ایسے بڑ بڑا کر اٹھے کہ ساتھ الجھ گیا اور پینترے پر پاؤں پڑنے سے پینترے کا پڑا ہوا بادلہ سب ریزہ گیا ادھر ڈھولو نے جھکی کی پاڑ کے ہتھوڑے کا دست پھرا کر مارا اور دست دیوار سے

ٹکرا گیا ایک بیچارے بڈھے آدمی دیوار کے پاس سب سے الگ کام کرتے ہیں بال بچے دار کچا ساتھ کمزور چار آنے کی مزدوری کر صبح سے شام تک مزدوری کرتے ہیں جب آٹا لے جاتے ہیں تب بیوی بچوں کا پیٹ بھرتا ہے، وہ دستہ ان کے سر میں لگا کر سر پھٹ گیا یہ ہائے ہائے کر کے تڑپ گئے اور کہا ہائے بچوں کی قسمت کہ آج رو کھا آٹا بھی نہ جڑا اسب خون میں تر بتر بڑھاپے کی چوٹ اور سر کا خون نکل جائے تو پھر قوت کا آنا بہت دشوار، ادھر ڈھولو کے دوست ڈھولو کو آ لپٹے دونوں میں کشتم کشتا لپاڈگی ہونے لگی ڈھولو نے اپنے دوست کو پٹخا دیا کہ یہ ماشہ بھرنے کی تپائی پر گرا اور تپائی کا کیلا ان کے بازو میں بیٹھا اور ہاتھ پایہ پر پڑا کہ کئی کیلیں ہتھیلی میں گڑ گئیں انھوں نے اٹھ کر ڈھولو کو ایک پٹخا ایسا دیا کہ تار کے چکر کے کنارے دونوں اس کے سر میں بیٹھ گئے اور ذرا سی دیر میں تمام گلے کا کرتا خون سے تر بتر اب کاری گروں نے اٹھ کر دو چار نے ان کو پکڑا دو چار نے ان کو اور کہا میاں جانے دو کیوں لڑتے ہو ڈھولو نے کہا کہ دیکھو میں مرغی والے سے بولا تھا ڈھولو کے دوست نے کہا اب ٹھہر یہ کہہ کر جھپٹے پھر لوگوں نے پکڑا ایک بولے میاں شیطان کو آتے کیا دیر لگتی ہے میں حیران یا اللہ یہ کیا اخلاق ہیں۔ افسوس ہم انسان ہو کر جانوروں کی سی باتیں کریں، جانور تو بہت سی باتوں میں قانون قدرت کے تحت میں چلتے ہیں ہم تو ان سے بھی گئے۔ گزرے غرض شام کو میاں ڈھولو اپنے گھر گئے ڈھولو کی بیوی ایک بیوہ کی بچی اس کی ماں نے محنت مزدوری اور چکی پیس پیس کر پالا ہے اور اپنا پیٹ کاٹ کر بچی کا ہاتھ گلا کر دیا ہے جو سب ملا کر بیس روپے کا ہے ڈھولو کی بیوی اس مصیبت کی زندگی میں دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے جانتی ہے کہ نکھٹو سے پالا پڑا ہے یہ چیزیں کسی وقت میں کام آئیں گی۔ ڈھولو پہلوان ہیں اول تو مزدوری ہی نہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو بھنگ کوکین کی نذر کرتے ہیں، یہ بیچاری جب سے نکاح ہوا گوٹہ بٹتی ہے جب شام کو گوٹے والا پیسے دیتا ہے تو یہ محلے کے کسی بچے کی خوشامد کر کے آٹا دال منگا کر پکاتی ہے۔ میاں ڈھولو جب گھر میں آتے ہیں تو سہم جاتی ہے آپ بھوکی رہ جاتی ہے اس ڈر سے کہ روٹی نہ ہوگی تو یہ مارے گا یا اللہ میں مر جاؤں تو اس زندگی سے چھوٹوں لیکن میری ماں کا کیا حال ہوگا غرض اس روز میاں ڈھولو گھر میں آئے اور کہا اری روٹی جلدی لا یا، یہ غریب اس ڈر کے مارے کہ مارے گا جو دال روٹی پکاتی تھی اٹھا لائی اور آپ نے پانی لینے گئی۔ ڈھولو نے روٹی کو دیکھ کر کہا اری یہ روٹیاں اتنی سی سب آپ ٹھور گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ آج گوٹے والے نے پیسے نہیں دیے اتنے ہی دیے تھے جو میں نے روٹی پکائی ہے تم کھالو، ڈھولو بولے اری تو روز دال ہی کا گھونٹو پکا لیتی ہے اتنے میں یہ پانی لے کر آئی اور نہایت نرم لہجے میں دریافت کیا کہ تمھارے سر میں پٹی کیوں بندھی ہے یہ سن کر ڈھولو نے ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ یہ فاقوں سے ناتواں تو تھی ہی گر پڑی اور اٹھ کر اوپر سے لات رونے کا حکم نہیں، آنکھوں پر اس کا بس چلتا نہ تھا چوٹ کے درد سے رونے لگی تو روٹی کھاتے ہوئے ڈھولو نے کہا اری تیرا کون مر گیا جو روتی ہے جب روٹی کھا چکے تو کہا یہ چوڑیاں اور بالیاں دے

دے عورت اپنے زیور کو عزیز رکھتی ہے ڈر سے کچھ کہہ تو نہ سکی لیکن دل پر سانپ لوٹ گیا اور دل میں کہا کہ یا اللہ یہی مری ماں کا اور میرا مرنے جینے کا سہارا تھا اب کیا ہوگا غرض چوڑیاں اور بالیاں ہی تھیں وہی اتار کر دے دیں اس کی انگلی میں ایک چھلا جو چار پیسہ کو لیا تھا اور ایک اس کے مرے ہوئے باپ کی نشانی گھسی ہوئی انگوٹھی جو شاید پانچ چار پیسوں کو مشکل سے صراف لے گا وہ بھی اتروالی اور اونے پونے بیچ کر کچھ درجن خریدے کچھ گڈیاں آدھی پونیاں باقی داموں کی کوکین خرید اکھاڑے میں گئے یہاں آکر پان منگائے اور تمام رات کوکین کھاتے رہے منہ کے ٹکڑے اڑ گئے کہ روٹی کھانے سے بھی گئے صبح کو گڈیاں اور ڈور لے کر عیدگاہ کے میدان میں سب سے پہلے پہنچے اور گڈی تان دی۔ ڈھولو کی بیوی بیچاری تنہا مکان میں تمام رات اپنی تقدیر پر روتی رہی اور ڈر کی وجہ سے اول رات تو ہمسائی کو پکارا اب رات زیادہ آگئی ہمسائی نے جواب نہ دیا تو یہ ڈر کے مارے کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی رہی خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو اس کی ماں آئی بیٹی ماں کی صورت دیکھ کر بے اختیار پھوٹ کر رودی بیٹی کو روتا دیکھ کر ماں کا کلیجہ منہ کو آیا آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا میری لال کیا ہوا میں تو بار بار تیرے واسطے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تیرا پردہ ڈھک لے جو اس عذاب سے چھوٹے جب رو چکی تو ماں نے پوچھا کیا ہوا اس نے نیچی نظر کر رک رک کر آواز شدت گریہ سے سر سے در گلوگھی سارا واقعہ سنایا۔ ماں نے اس کے آنسو پونچھ کر چھاتی سے لگایا اور کہا صدقہ ماں تو دل بھاری نہ کر میں زندہ ہوں تو پھر ہو جائے گا یہ کہہ کر بٹوہ کھول اس غریب کو مہینے بھر نوکری کرنے سے دو روپے ملے تھے وہ بٹوے سے نکال کر دیے اور کہا کہ بیٹا اب کے تنخواہ بھی اپنے چاند کو دے دوں گی تو روپیٹ نہیں بیٹا ہم پر مصیبت پڑی ہے یوں ہی کٹے گی، بیٹی تم کو خدا نے سید کے گھر پیدا کیا خدا کا شکر کر دنیا چند روزہ ہے اگر یہاں مصیبت ہے تو اس کے بدلے خدا وہاں آرام دے گا (مصرعہ) "دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے" افسوس ہمارے ملک کی حالت پر کہ جس کے افراد جو قدرت کے لطیف جوہر ہیں اپنی مفید زندگیاں بیکار گزاریں اور قدرت کے بڑے بڑے خزانوں سے محروم رہ کر اس طرح مٹ رہے ہیں کہ شعر:

کوئی بھی جانتا نہیں ہے کہاں　　　گور کا ان کی اس زمیں پہ نشاں

ایسے جینے پہ بار بار افسوس　　　ایک کیا بلکہ* صد ہزار افسوس

جو صاحب اس مضمون کو پڑھیں عند اللہ وعند الناس اگر کوئی حرکت ایسی حرکات سے جو بیان کی گئی ہیں ہو تو چھوڑ دیں اور ان کو بھی نیک مشورہ دیں اور یہ خیال نہ فرمائیں کہ اوہ میاں ہمیں کیا یہ نیا ہے یہاں اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ میں تو اپنی اوپر مثال دیتا ہوں کہ میں تو اس جہالت کی وجہ سے بے تال ناچ رہا ہوں۔ اگر ہم نے اب بھی کچھ نہ کیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر آگن لیز جانا ہو یہ اشعار سمجھنے کے واسطے کافی ہیں۔ اشعار:

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ　　　جو دنیا میں کرتے ہیں محنت زیادہ

اسی میں ہے عزت خبردار رہنا — بڑا دکھ ہے دنیا میں بیکار رہنا
اسی سے ہے آباد نگری جہاں کی — جہاں میں یہ بنیاد ہے ہر مکاں کی
بڑائی بشر کو اسی سے ملی ہے — نکمی جو گزرے وہ کیا زندگی ہے
حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں — اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں
جہاں میں اگر کیمیا ہے تو یہ ہے — غریبی کی دکھ کی دوا ہے تو یہ ہے
ہری کھیتیاں جو نظر آ رہی ہیں — ہمیں شان محنت کی دکھلا رہی ہیں
نہیں کرتے دنیا میں نادان محنت — جو سمجھیں تو سونے کی ہے کان محنت
کوئی اس کو سمجھے تو اکسیر ہے یہ — بڑا بن کے رہنے کی تدبیر ہے یہ
جو محنت نہ ہوتی تجارت نہ ہوتی — کسی قوم کی شان و شوکت نہ ہوتی
کھڑا ہے یہ سنسار محنت کی کل پر — یہ کل کارخانہ ہے اس کل کے بل پر
گڈریوں کو شاہنشہی اس نے دی ہے — کولمبس کو دنیا نئی اس نے دی ہے
بناتی ہے یہ شہر نگری بنوں کو — بساتی ہے اجڑی ہوئی بستیوں کو
جو ہاتھوں سے اپنے کمایا وہ اچھا — جو ہو اپنی محنت کا پیسہ وہ اچھا
مری جان غافل نہ محنت سے رہنا — اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

گاڑھے خان نے ململ جان کو طلاق دے دی

میر باقر علی

گاڑھے خاں ولد پنبہ دہاں بن نرمہ خاں قوم ڈوڈھ گوت کتی پیشہ تن پوشی ساکن باڑی تحصیل زراعت محلہ نور بافاں گلی بزازاں ہندی النسل، اپنے کنبے میں سب سے بڑے گراں ڈیل، کپاسی رنگ، موٹے موٹے اعضا، سادہ طبیعت راحت رساں، ہر کام میں مضبوط۔

ململ جان تلاش گھر کرنے، پیٹ بھرنے اپنے وطن سے نکلیں۔ چھریرہ بدن، اجلا رنگ، نازک مزاج ایسی کہ ذرا سی دیر میں تار تار ہو جاتی ہیں۔ اپنی دُھن کی ایسی پکی کہ اتنے بڑے سفر کو جہاز اور خشکی کے راستے طے کر کے آئیں اور گاڑھے خاں کے مضبوط اعضا دیکھ کر ڈورے ڈالنے شروع کیے کہ ان سے رشتہ اور پیوند ہو جائے۔ گاڑھے خاں نے جو ململ جان کو دیکھا طبیعت تار تار ہو گئی۔ ململ جان کا نازک نازک نقشہ، سوتواں (ستواں) ناک، پتلے پتلے ہونٹ، رسیلی آنکھیں، صراحی دار گردن گز بھر چلنے میں سولہ سولہ گرہیں کمر میں پڑتی ہیں، ہاتھ پاؤں گول، نہایت سڈول بیالیس کا سن مشہور اکثر دیکھنے والے چھتیس کا بھی گمان کرتے تھے۔ بلا کی کلک مسک، گاڑھے خاں نے پہلے تو اس خیال سے سر دھنا پھر سوچا کہ شادی مناسب نہیں کیوں کہ ڈھاکے والی بیوی صاحب سلیقہ عفیفہ گھر میں موجود لیکن موٹی عقل کے تھے سمجھ میں آ گیا کہ شادی کر بھی لو دیکھا جائے گا ان شاء اللہ شادی کے بعد ململ جان ہماری ہو جائیں گی لیکن ان کو یہ خبر نہ تھی کہ ململ جان بیسیوں برس گزرنے کے بعد بھی یہ اپنے کنبے اور اپنے حلوے مانڈے سے غرض رکھیں گی اور ان سے دامن چھڑوانا جنجال ہو جائے گا۔ گاڑھے خاں نے ململ جان سے کہا کہ اگر آپ کا دامن بندی اور پیوند کا ارادہ ہے تو میں بھی تم سے عہد کرتا ہوں کہ تم کو اپنے گھر کا مختار بنا کر اپنی بُود و باش گاؤں اور جنگل میں اختیار کر لوں گا اور ملک کے کونے کونے سے پیداوار سمیٹ کر تمہارے کنبے اور تمہارے واسطے بھیجتا رہوں گا لیکن میری یہ شرطیں ہیں اول تو اپنی عفت کو ملحوظ رکھنا دوسرے

ڈھاکہ والی سے نہ الجھتا اور نہ مخالفت کرتا کہ بیچے میں اِن کا سر پرست کوئی نہیں رہا۔ تیسرے تمھارا کنبہ آ کر رہے سہے کھائے پیے لیکن ایسا نہ کرے کہ میرا تمام گھر سوت کر اپنا مجوبہ بھر لے اور ہم دیکھ کر کڑ دوں اُچھلیں تو ہم کو سبز باغ دکھاؤ اور مسجد میں خدا سے ہم فریاد کرنے جائیں تو قبضہ شمشیر سے ہم پر قبضہ کرو اور جو چیزیں میری جیسی ہیں ان کو اُسی حالت میں چھوڑنا اتھل پتھل نہ کرنا۔ یہ شرطیں منظور ہیں تو آ کر رہو سہو کھاؤ پیو اور اتنا کرنا کہ میرے بچے کم سمجھ اور نادان ہیں ان سے ایسا سخت کام نہ لینا جو اُن کی بساط سے باہر ہو۔ یہ شرطیں اگر منظور ہیں تو آ کر رہو سہو، مل جل کر زندگی بسر کرو اگر ایسا کرو گی تو کوئی طاقت ہم دونوں کا دل نہ پھاڑ سکے گی اور ایک یہ کہ میرے پرانے خادم بڈھے ہونے کی وجہ سے چڑ چڑے ہو گئے ہیں ان سے بگڑ نہ لانا ململ جان نے یہ سُن کر نیچی نظر کر ایک تاگہ کو اُٹھا مروڑی لگانی شروع کی اور نرم آواز سے کہا کہ میں تو یہی ارادہ کر کے چلی تھی کہ تمھارے گھر کا انتظام کروں گی، مساوات رکھوں گی، راستہ صاف کروں گی، ہر شے کی ریل پیل کر دوں گی، کسی کو پابند نہ کروں گی سب کو آزادی دوں گی اور لگا تار کام کرتی رہوں گی۔ ہاں جب معاملہ پڑے گا حال تو جب ہی کھلے گا آپ کو ایسا بنا دوں گی کہ نواب بے ملک کا مزا آئے گا اور تم کو ہلنے چلنے کی ضرورت نہ پڑے گی، دنیا میں وحشی مشہور کر دوں گی تا کہ کوئی آپ تک نہ آ سکے عضوِ معطل کی صورت بن جاوے، جالیسا عرف ڈیون ململ جان کے بڑے بھائی ہیں اور ململ جان کے ساتھ ہی آئے ہیں بولے جناب گاڑھے خاں صاحب میں آپ کی بیگموں کی خدمت چھنی تگی کے واسطے حاضر ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے آڑی ترکیب نہ برتیں ہاں سیدھی طرح سے تو بطنے دو بطنے دوست رہ سکتا ہوں اور میرے اور جو بھائی ہیں وہ تو ملاقات۔ کے ایسے بودے ہیں کہ ہاتھ ہلایا اور چلے۔ گاڑھے خاں صاحب بولے جناب آپ بھی مجھ سے نُقصِ نقصان نہ کرنا، جالی جو ململ جان کی خانہ زاد بہن ہیں لیکن نہایت دیدہ دھوئی دیدہ پھٹی بولیں جناب میری چھاتی دیکھو میرا اور بہن کا چولی دامن کا ساتھ ہے میں انھیں کی رفاقت میں اپنے وطن سے محبت توڑ ملک سے منہ موڑ کر آپ کی سادہ لوحی، فروتنی اور جہالت اِن سب باتوں کے علاوہ آپ کے اخلاق کی تعریف سُن کر یہاں آئی ہوں آپ مجھ کو ننگی بچی اور تنگ خاندان نہ جانیں، آپ کی آنکھوں کے آگے رہوں گی اور خلوت و جلوت میں پیشرانی کی خدمت انجام دوں گی۔ خاص ولایتی کمخواب چمک کر بولیں آپ میرے جھوٹ سچ سے تو بحث نہ کریں ہاں تراج تو ایسی ہوں کہ گھر میں تانبے کا تار نہ چھوڑوں گی اور آپ کو منہ چھکنا اور پیٹ خالی کر دوں گی مگر اس کے ساتھ ہی آپ کو دنیا میں خوش غلاف مشہور کر دینا میرا کام ہے۔ زین کے تھان بولے جناب آپ کے طویلہ اور ملازمان نظم نے جانا اور میں نے۔ گاڑھے خاں اِن کی دو دروزہ جھلک اور چمکتی ہوئی صورت اور رنگین لباس دیکھ کر، لچھے دار باتوں میں ایسے آئے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ گاڑھے خاں کی قیام پذیر جوانی تھی، عاقبت اندیشیوں کے بھید سے واقف نہ تھے، سیدھے سادے، بھولے بھالے، دنیا کے اونچ نیچ سے آگاہ نہ تھے کہ دنیا

آگے چل کر نیز بھی ہو جائے گی غرض سوت کی طرح ایسے اُلجھے کہ آگا تاگا کچھ نہ نظر آیا، ایسے اندھے ہوئے کہ گویا شاہ عالم یہی ہیں اور اپنی ذات کو فنا کر بیٹھے کہ طمل جان سے شادی کا اقرار کر لیا۔ طمل جان نے یہ خوشخبری (خوش خبری) سُن کر اپنے ہم وطن یا جن سے دور دراز کی بھی رشتے داری تھی اُن کو کہلا بھیجا کہ تم جیسے بیٹھے ہو ویسے ہی چلے آؤ اور مرزا صیوں، گو انھوں نے مجھے بہت تاؤ دیے ہیں اور جلایا پھونکا ہے، خیر ان سے کہنا کہ لو آؤ یہاں چاندی ہی چاندی ہے لوٹو لو، آؤ جو چاہو کرو، جس کو چاہو کشتہ کرو، جس کو چاہو شہد سہاگہ گھی دے کر زندہ کرو یہاں تم ہی تم ہو اور میرے دم میں دم ہے تو گاڑھے خاں کے ساتھ جتنے لچے لفنگے (لفنڈے) ہیں ان کا نام ونشان مٹا دوں گی اور آسمانی آفتیں اور زمین کی مصیبتیں اُن پر ایسی ڈالوں گی اور ایسا بنا دوں گی کہ دنیا کی تاریخ بھی ان کا پتا نہ لگا سکے۔ گاڑھے خاں کے داروغہ چرخہ خاں سب جگہ (جگ) گھومے ہوئے اور مال گاڑھے خاں کا اُنھی کے پاس رہتا ہے۔ گاڑھے خاں نے چرخہ خاں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ میں نے طمل جان سے شادی ٹھیرائی ہے تمھارا کیا منشا ہے، چرخہ خاں یہ سن کر بہت چکرائے اور کہا جناب آپ نے یہ کیا ٹھانی اور یہ تو کہیے کہ طمل جان آپ کے منہ (مُکھ) کیوں کر چڑھیں۔ طمل جان بڑی باریک بلدار (بل دار) پھول کی پنکھڑی سے زیادہ نازک اُجلی طبیعت کی، خوبصورت حسین آواز سریلی پاٹ دار مرکیاں گلے سے نکلی ہوئیں کہاں تک عرض کروں لیکن آپ نے کسی شاعر کا قول نہیں سنا شعر:

"پردیسی کی پیت کو سب کا من للچائے
دو ہی بات کا کھوٹ ہے رہے نہ سنگ لے جائے

دیکھو دیکھو دھوکا نہ کھانا اور ان کی گوری چٹی رنگت اور چکنی چپڑی باتوں اور نرم نرم صورت اور قطع دار چہرے پر نہ جانا۔ شعر:

سنگیں دل است ہر کہ بظاہر ملائم است
پنہاں درون پنبہ بہ بیں پنبہ دانہ را

گاڑھے خاں نے یہ سن کر گردن میں ڈورا ڈال کر ایک جھٹکا سا دیا اور اُدھڑ کی اور فرمایا کہ میاں میں سب سوچ چکا ہوں پہلے ہی۔ سنو سیدھی سیدھی رہیں تو خیر ورنہ گھر کے دھوبی سے تاکید کروں گا کہ وہ کندی کرے کہ سب بل اور جو جو زندگی کی سلوٹیں ہیں سب صاف ہو جائیں اور اخلاقی دامن پر کوئی دھبہ (دھبا) نہ رہے، کہتے کیا ہو کان پکڑی چیری بنی رہیں گی اچھا اب تم جاؤ اور مہمانوں کو بلاوا بھیجو، کوچی سے کہو کہ مکان کی صفائی کرے، اوٹنی (اوٹنی) کو حکم دو کہ بہت کھیل چکی، چرخہ ٹکا چکی اب کام کا وقت ہے گھر کا کوڑا کرکٹ جلد نکالو اور قرقلذین سے کہنا کہ چاندنی سب جگہ بچھا دے، جل گگری چھڑکاؤ کرے اور میرے پچا وولڑے اور چچی دوسری اور چھوٹی بہن دھوتر

خانم کو اطلاع دو کہ شادی کی تاریخوں سے پہلے آجائیں اور اپنی دونوں لڑکیاں اسٹرنی اور دمرکی کو بلاؤ اور دیکھو عداف بیگ ہیں تو اپنی دلہن کے پلّے اُن کی نائیں نائیں برابر چلی جاتی ہے وہ کہیں تمہارے بنتے (بھتیجے) چڑھیں تو اُن کو لانا اور بختو باورچی آئے اور مانڈھے چڑھائیں اور حلوا تاکہ رشتے والے کھا کر کڑے اور کرارے تازہ دم ہو جائیں آب رواں اور دریائی سے کہو کہ پانی کا انتظام کریں۔ رات بسی طوائف سے کہو کہ مہمانوں کی دم ساز ہو اور کچھ گالے۔ گلبدن مالن سے کہو کہ سہرا گجل مخمل کا شانی کا گوندھے اور گدڑ وخا کروب بروقت حاضر رہے اور ریشم بیگم قاقم میرزا اور سنجاب خاں شیخ شور مشال دوشالہ اوڑھ کر اور اپنے ملازمیں کمبل وگدسہ وغالیچہ وغیرہ کو ساتھ لائیں اور رونق محفل کو دوبالا کریں۔ یہ لوگ سب سرد ملک کے رہنے والے ہیں، ان کے کھانے کو ملیدہ (مالیدہ) تیار رکھنا اور قاضی بانو صاحب روزنامچہ و کتاب گدڑی لے کر نکاح سے پہلے آجائیں تاکہ وقت پر تلاش نہ کرنی پڑے اور محلّے کا جو درزی ہے اس کے لڑکے کو معہ (مع) بیچک دھوئی اور گز وقینچی کے ململ جان کی خدمت میں حاضر ہو اور ململ جان کو ہاتھوں میں رکھے اور ٹانکا ٹوک میں اُس کا کام دیکھوں اور شلنگ شاہ کا بالکا اُس سے کہنا کہ جز و بدن بن جائے اور خواجہ سراسیر اتو ادھر اُدھر کام میں لگا رہے۔ یہاں ململ جان جب وطن سے چلیں تو بابو مشینہ سے یہ کہہ کر آئی ہیں کہ جب میں بلاؤں تو تم فوراً دریا کا پاٹ طے کر کے آنا اور اگر خرچ نہ ہو تو تم پانچ روپیہ کی قسط مقرر کر کے آجانا اور گاڑھے خاں کی خالہ کھدر خانم نے توشہ خانے کا کمرہ مع صندوق والماری و مچان اور الگنی وغیرہ کے درست کیا داروغہ نے عرض کی کہ جناب ہم سب ہمہ تن کام میں مصروف رہیں گے اگر ململ جان بھی ہمارے واسطے مضبوط اور مفید ثابت ہوں اور ہم سے اپنا دل نہ پھاڑیں اور اپنی وضع قطع کو درست رکھیں۔ گاڑھے خاں نے چرخہ خاں سے کہا کہ میاں تم تو نرے کاٹھ کے اُلّو ہو تمہاری عقل تو چکر اری ہے کچھ باتیں سیکھا آؤ جب باتیں کرنا میاں سب جھول جھال جو ہوں گے نکل جائیں گے اور کان پکڑی چیری بنی رہیں گی، داروغہ نے کہا کہ جناب بڑے بڑوں کو دیکھ لیا مرد کسی رتبے کا ہو جوڑو کے آگے اُس کی عزت نہیں ہوتی اور جوڑو کے دو وہ حکم بجالاتا ہے کہ چار آدمیوں میں بیان نہیں کر سکتا گاڑھے خاں نے جواب دیا کہ جو ایسا کرتے ہیں وہ پیٹ کے ہلکے اور تنے کے بودے اور دنیا کے بلوں سے واقف نہ ہوں گے میرا نام گاڑھا ہے گاڑھا میں اپنے گھر میں سب کی عیب پوشی کرتا ہوں اگر ململ جان مجھ سے مل کی نہ لیں گی تو کچھ بھی نہ ہوگا ہاں اگر ململ جان کے دشمن جھنڈ خاں جو اُن کے قدیمی نمک حرام ہیں اگر وہ آ گئے تب تو وہ سب مال سمیٹ کر لے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے اُن کو نہ آنے دینا چرخہ خاں بیٹھک پر سنبھل کر کھونٹا سے بیٹھ گئے اور کہنے لگے جناب آپ میری طرف سے تو اطمینان فرمائیں ہمتو (ہم تو) ململ جان کو ہاتھوں چھاؤں رکھیں گے اگر ہمارے ہاتھ میں آجائیں۔ چنانچہ گاڑھے خاں تو مائیوں بیٹھے اور ململ جان نے سُکھ چین اور نین سکھ بدن اور نین سکھ کو مقرر کیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے گاڑھے خاں

کے کنبے اور مہمانوں کے واسطے آنکھیں بچھادینا اور جب رشتہ ہو جائے گا تو کون بس پھر تو ہم اور تم ہوں گے اور ان سب وحشیوں کو چن چن کر گھر سے نکال دوں گی اور نام ونشان مٹادوں گی بلکہ ایسا کروں گی کہ ان کے گھر والے ان کی صورت تک نہ پہچانیں۔ یہ لوگ اس گھر کے رہنے کے قابل کہاں ہیں ہاں اگر ہماری غلامی کریں تو خیر ورنہ تو کون اور میں کون ان کی صورتیں تو دیکھو روڑھے روڑھے چہرے، کالے کالے رنگ، چیچک کے داغ، بدن پر خشکی، پست حوصلہ جھوٹے جاہل یہ اسی قابل ہیں اونٹ ہ آتے ہی لدتے ہیں ذرا پھندا پڑ جاوے پھر تو ان کے شتر غمزہ نکلہ کے بالوں کی طرح نکال دوں گی۔ بہت بھولی بھولی کھائیں ہیں، ماما مختریاں اور شادی کے معلوم ہو جائے گا کہ کے بیسی کا ساتھ ہوتا ہے یہ لوگ اپنے آپ کو بہت اُٹ سانٹ لگانے میں اُستاد جانتے ہیں اچھا اب تم جاؤ اور میں جو جو بندوبست کرتا ہوں یعنی جہیز سب پارسل کی صورت میں روانہ کرو لیکن یہ دیکھ لینا کہ جو جو چیزیں کسی نے نہ لی ہوں اور کوئی نہ لے وہ روانہ کرنا اور کام کی چیزیں نہ لانا ہاں جو بھی کوڑا کرکٹ ہو ملک کے کونے کونے سے سمیٹ کر ایسا نظر فریب جہیز ہو کہ گاڑھے کے کنبے والے دیکھتے ہی لوٹ پوٹ ہو جائیں اور جب نتیجے پر آئیں تو ہاتھ مَل مَل کر رہ جائیں۔ یہ کہہ کر ململ جان نے شادی کی دھن میں حمام میں جا کر مل مل کر نہانا شروع کیا اور آب رواں کی چادر اپنے اوپر ڈالی کہ پانی ریگ کر بیٹھنے لگا اور شکوہ بدن سے کہا کہ میرا زیور لباس لاؤ غرض ململ جان بغرض شادی سیدھی سادی دُلھن بن کر تیار ہوئیں ادھر ان کا کنبہ آنے لگا اور آذر خاں چیرامی نے جا جا کر ایک کو لانا شروع کیا۔ ادھر گاڑھے خاں کی برادری میں مومن مسلمان مومن بیگ تاتاری صرف قاعدہ پڑھ کر قاضی بن گئے ہیں ان کو نکاح کے واسطے بلایا دونوں طرف کے لوگ جمع ہوئے جگ اکٹھا ہوا لیکن گاڑھے خاں کے کنبے اور برادری کے لوگ خالی ہاتھ اور ململ جان کے کنبے والے ہتھیاروں سے درست موٹروں اور گاڑیوں میں آنے لگے اور گاڑھے خاں والے کوئی کپاسی عمامہ باندھے، کوئی گاڑھے کی دو پلڑی ٹوپی، کسی کے گلے میں رومال، مگر چرخہ خاں چکر دار پگڑی باندھے تکلے سے کھڑے ہوئے اور نکاح پڑھنا شروع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

اعوذ باللہ من وکت اللباس و الکثافت اللباس و التصفیق اللباس و الخرق اللباس

وشرّ الشیطان الرجیم

امابعد گاڑھے خاں ولد پنبہ دہاں، ململ جان بنت مشین الحدید بعوض تمام اجناس دھلہ دسینہ ومگو وگھی ودروئی و شکر و معدن ونقد وجنس خام ململ جان کو قبول کیا، قاضی جی نے گاڑھے خاں سے مخاطب ہو کر (کہا) قبول کیا۔ قاضی جی چرخہ خاں سے مخاطب ہو کر لو میاں مبارک ہو، اب تو بڑا تیرے کا کنبہ وجنگلی ڈیوڑھی سے بدری نا راض تک

کا علاقہ تم کو مل گیا روز درشن کا سودا کرو۔ چرخہ خاں طمل جان کے کنبے کی طرف دیکھ کر سلامت ہو، اب نوٹ تقسیم ہونے شروع ہوئے۔ طمل جان نے گھونگٹ اُٹھا کر گھر کے کونے کونے کو دیکھا اور آہنی جھاڑو سے تمام چیزیں سمیٹ سمیٹ اپنے میکے (میکے) روانہ کرنا شروع کیں یہاں تک کہ طمل جان کے میکے (میکے) میں ہر شے کی ریل پیل ہوگئی اور گاڑھے خاں کے گھر میں دانت کریدنے کو تنکا نہ رہا اور طمل جان نے گھر کا چپہ چپہ اپنے کنبے کو تقسیم کیا۔ لٹھے خاں سے کہا کہ تم تو نیچے کے درجے میں پاؤں پھیلا کر سوؤ اور ان کے چھوٹے بھائی سے کہا کہ تم دالانوں میں بستر لگاؤ گلشن سے کہا بہن تم محراب میں پردہ ڈال کر رہو، مخمل سے کہا کہ باجی تم پلنگ پر اپنی توشک بچھاؤ، چکن بیکیا بار لیٹ سے کہا کہ باجی ہم تم سب ساتھ ہی رہیں گے۔ دروازے کے ملازم ٹھمن خاں اور بچھے بیگ کو حکم دیا کہ تم دروازے اور مکان کی ہر چہار طرف کی حفاظت کرو اور اس حکم کی گرہ دل میں باندھ لو کہ گاڑھا آئے تو اندر قدم نہ رکھنے دینا اور اگر اصرار کریں تو کہہ دینا کہ اس وقت سرکار کو فرصت نہیں کیوں کہ مارکین صاحب آئے ہوئے ہیں بنک کی ہنڈیوں کا نقصان کرانا اور اگر اقرار یاد دلائیں تو کہنا کہ اقرار وقت کے واسطے ہوتا ہے نہ کہ ہر وقت ایک؟؟ خان کو طمل جان سے کچھ بات طے کرنی تھی اور عرضِ حال کا موقع نہ ملتا تھا آج چھٹی تھی گاڑھے خاں آئے تو ڈبل زین صاحب دربانوں سے کچھ باتیں کر رہے تھے گاڑھے خاں کو آتا دیکھ کر آپس میں گل تھنی کرنے لگے اور دست و گریباں ہو گئے۔ گاڑھے خاں نے یہ دیکھ کر بھلا ہے سے کہا کہ اُلٹے چلو سودا بگڑ گیا اور میرا تو گڑوں دل پھٹ گیا ان باتوں سے اور دل میں ایسی گرہ پڑ گئی کہ کھلنی دشوار ہے اور اپنے اس فعل پر نہایت لعنت ملامت کی اور کہا افسوس میں نے ملک کے کونے کونے سے سامان سمیٹ کر گھر بھیجا اور یہ خیال کیا کہ میرے گھر میں سب کچھ ہوگا لیکن سوائے ردی کے جو بچا باندھنے کے قابل بھی نہیں اور کچھ نہ پایا، بھاڑ میں کوڑا جھونکتے ہیں تو راکھ برآمد ہوتی، ایسی وضع عفونت ہے کہ کسی شے کو رتبہ نہیں اور جو جو تیز مصالح ڈالے جاتے ہیں تیزی کی وجہ سے خود فنا ہو جاتے ہیں اور راکھ اُس عفونت کو دبا لیتی ہے میں نے میں سونا جھونکا اور کوڑا کرکٹ تک ہاتھ نہ آیا خیر کیا مضائقہ ہے یار زندہ صحبت باقی اگر میرے دم میں دم ہے اور رشتۂ حیات بھی باقی ہے تو ان بودے عہد والوں کے تنکے سے بل نہ نکالے تو نام گاڑھے خاں نہ پایا۔ یہ سوچ کر جنگل کی راہ لی اور دل میں شرمندہ ہوئے کہ ڈھاکے والی اپنی وفادار بیوی اور اُس کی خالہ سوسی وغیرہ کو بھی منہ نہ دکھایا۔ اب یہ اسی ذہن میں غلطاں و پیچاں نہایت سست قدمی سے سر بسر چلے جاتے ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ تھوڑا سا دن باقی ہے پہاڑ کی لہردار غیر منتظم و بلند چوٹیوں کا سلسلہ نامتناہی دور تک چلا گیا ہے اور آفتاب تمام دن کے سفر کی کوفت اُٹھائے اپنے گرد آلود چھپائے ہوئے چہرے کو بغرضِ خواب دامنِ کوہ کی چادر میں منہ چھپایا چاہتا ہے اور شبستانِ مغرب کی شفقی توشک اور کاف سنجاب کروٹیں لے رہا ہے اور پہاڑ کی چوٹیوں کے درختوں کے تنے اور پھیلی ہوئی شاخیں عکسِ شفق میں صفحۂ اُفق پر تصویر کا عالم

دکھا رہی ہیں اور اُن کی ہوا کی چھیڑ سے دل لبھانے والی حرکت گھاٹیوں کا سہانا سہانا عالم، پھولوں کی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ مہک، ٹہنیوں کی لپٹی ہوئی پتیوں کا ہوا سے پھیل پھیل کر کھلنا، شاما کا بسیرا بولنا، ویڑ کی سریلی آواز اور وہ درختوں کے سائے میں شام کا اودا اودا سا (اُودا سا) اور کچھ کچھ دھندلکے اور اندھیرے میں جگنوؤں کی مدہم مدہم (مدھم مدھم) چمک جو اڑتے ہوئے پتنگوں کی صورت فنا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے، وہ سبزہ صحرا کا زمردیں رنگ سے سیاہی کا بدلنا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا چلنا۔ اس عرصے میں گاڑھے خاں کو ایک طرف آگ نظر آئی گاڑھے خاں اُسی روشنی کی طرف چلے تو ایک مہاتما کو اُس پرماتما کی یاد میں ایسا ڈوبا ہوا پایا کہ ان کو اپنے سراپا کا ہوش نہیں اور ایسے رندھے اور گندھے ہوئے ہیں کہ ان کو عرصے تک یہ خبر نہیں ہوئی کہ گاڑھے خاں میرے پاس کچھ فریاد لائے ہیں۔ گاڑھے خاں نے دیکھا کہ ان مہاتما کے سر پر حق کی کلاہ، ہمدردی کا وسلہ گلے میں، عیب پوشی کا تہ بند باندھے ثابت قدمی کھڑاویں اس کا مرگ چھالا بچھائے اللہ کی یاد میں مصروف ہیں کہ یکا یک اُن مہاتما کی نظر کیمیا اثر گاڑھے خاں پر پڑی تو آپ نے زبانِ اعجاز بیان سے فرمایا آ میرے رات دن کے ساتھی آ تو تو میرے گلے کا گل جنڈرا ہے تو کہاں تھا۔ پھر بہ نظر غور دیکھ کر کہا افسوس یہ تو نے کیا کیا دیکھا حیوانی جذبے کا اثر کہ تیری ناتجربہ کاری نے تجھ کو کہیں کا نہ رکھا کہ اب کوئی انجان اور بعض جان بوجھ کر تجھ سے پلہ بچاتے ہیں، رات کی تاریکی تو خیر اب تو روشنی کے وقت جان بوجھ کر تجھ سے دامن چھڑاتے ہیں اور اصلی صورت کوئی نہیں پہچانتا اب تو تیرے گھر والے تیرے دھوکے میں۔ ایک دن میاں بدلو نے بہروپیے کو گاڑھا سمجھ کر بڑی آوازیں دیں تب بہروپیے نے کہا کہ میاں میں دوسرے ملک کا ہوں آئندہ دیکھ بھال کر کام کرو اور دھوکہ کھا کر نقصان نہ اٹھاؤ۔ اے قدیمی میرے گوشت پوست جو جو خوبیاں تجھ کو قدرت نے دی ہیں اوروں میں کہاں آ تو اپنا گھر اپنے بچوں کو گودی لے، وطن سے دوستی کر کہ یہ ایمان کی نشانی ہے رباعی

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر … خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی میکرد … میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

دنیا کی پستی، دنیا کی بلندی، دنیا کی خنکی، دنیا کی تری علاوہ اس کے گرم و سرد زمانہ کیا شے تجھ میں نہیں ہے جو تو اوروں سے چاہ پیدا کرتا ہے، ناحق طبیعت جگت کے خلاف ڈانواڈول کرتا ہے تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ شادی رسی سے جیوڑا گھستا ہے ایسے چکر گھنی بن گئے لیکن عجب سن رکھتا ہے تو شاید کھیل سمجھا تھا کیا کسی نے تجھ سے نہیں کہا کہ دیکھ اس کام میں کوئی اوٹ رہے کام نہ آوے گی اوڈا اس نمبردار نے مجھ سے خود کہا کہ گاڑھے خاں نے جھولا کھایا میں نے ہر چند دوبارہ سمجھایا لیکن گاڈوری نکلا بہت کہتا تھا کہ مجھے کیلی کا کھٹکا نہیں اب خالی سپاٹ رہ گیا اور کوئی کھونٹا مضبوط نہیں اب اُلٹے سیدھے چکر ہیں، میاں گاڑھے خاں ہیں اور دنیا تو عالم میں مشہور تیرا گھر معمارِ قدرت

نے عجیب ہیچ کاری سے بنایا ہے:

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ضروری اشیا تو ہر جگہ ممکن لیکن موسم کسی کے اختیار میں نہیں، تیرا دولت خانہ شمال تو ہمالہ اور کاشمیر جیسے سرسبز اور پُرگل خطوں سے مالا مال تیرا جنوب جوالا کا محبوب تیرے مغرب کے درشن کو سورج لگاتار بیچک نورانی کو لپیٹتا لاکھوں میل طے کر کے جاتا ہے۔ تیرے مشرق سے اتنی نور کی دولت اپنے دامن حال میں لاتا کہ تمام دن عالم جس سے فیض اُٹھاتا ہے، تجھے کیا ہو گیا تھا جو اس وقت میں بھی گاڑھے خاں نے جواب دیا کہ جناب خودنمائی اور ہوس کے پنجے میں آ گیا عاقبت نظر نہ ڈالی اور یہ نہ سوچا کہ سات سمندر پار کی بیوی میرے کنار الفت میں کیوں کر خوش رہ سکتی ہے، وہ عاقل اور عالم میں بیوقوف و جاہل، وہ گوری چٹی صاحب جمال، نیک اعمال خصال، میں کالا کلوٹا بداعمال، وہ باریک میں موٹا، وہ نازک میں بھدا شادی کر بیٹھا میں گاڑھا وہ ململ، وہ ریشم میں کمبل مجھے خوش کیوں کر رہ سکیں گی اور میں ہی کیا خوش رہوں گا شعر:

گندم از گندم بروید جَو ز جَو
از مکافات عمل غافل مشو

اب تجربے سے ثابت ہوا کہ وطن ہی کی بیوی اچھی تھی اب خالی ہاتھ رہ گیا کچھ پاس نہیں اور سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں، جو دوست تھے وہ دشمن، جو یگانہ تھے بیگانہ ہو گئے اور مجھ سے ملتے شرماتے ہیں کوئی کہتا ہے پرے رہ ایسا نہ ہو کہ تیرے پاس رہنے سے پھنسیاں نکل آئیں، کوئی کہتا ہے کہ گرمی معلوم ہوتی ہے میرے پاس آئیں تو میں بتاؤں جو جو مجھ میں خوبیاں ہیں، جدھر جاتا ہوں لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ مہاتما نے فرمایا اچھا ٹھیرو تدبیر کرتا ہوں اگر بن آئے تو کیا کہنا ہے ورنہ دعا اگر اس کی بارگاہ میں قبول ہو جائے لیکن تو بھی کوشش کر اور سب اپنے گھر والوں سے مل جل کر کام کر اگر وہ چاہے گا تو جلد انجام ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر مہاتما کھڑے ہوئے اور سچے دھیان سے اُس عادل حقیقی کی بارگاہ میں دعا کی کہ اے درماندوں کے دستگیر اور اے بیکسوں کے خبر گیر تجھ کو آسان ہے ہمیں مشکل، تو دلوں کو پلٹ دینے والا ہے۔ چوں کہ دعا سچے دل کی تھی اِدھر دعا تمام نہ ہونے پائی تھی کہ گاڑھے خاں کے دل میں خیال آیا کہ اے موئی عقل کے تو اِن نظر فریبوں میں کیوں آ گیا اور اپنے بڑوں کے چال چلن کیوں چھوڑ دیے۔ شعر:

لاتے ہیں کب وہ حشمت دارا خیال پر
چلتے ہیں جو کہ اپنے بزرگوں کی چال پر

چل اور اس اُلجھاؤ سے اپنا پیچھا چھڑا تمام دنیا اپنا کام کر رہی ہے اور حصہ لے رہی ہے اور تو بے خبر شعر:

ایسے جینے پہ بار بار افسوس
ایک کیا بلکہ صدہزار افسوس

یہ سوچ کر مہاتما سے رخصت ہوا اپنے گھر آیا۔ یہاں طمل جان اپنے عزیز اور دوستوں کے ساتھ گل چھرے اوڑا (اُڑا) رہی ہیں۔ ناچ ہو رہا ہے، بادل چھایا ہوا ہے گھٹا اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم نرم ہوا چل رہی ہے۔ دور شراب کا بندھا ہوا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے ذرّے پانی کے پن بھری ہوا کے ساتھ کمرے کے اندر آ کر لوگوں کے چہروں پر مس کر کے اور چھینٹا دے رہے ہیں اور جسم کی گرمی اور شراب کی حرارت سے اوڑ (اُڑ) کر تفریح کو دوبالا کر رہے ہیں۔ جس سے شراب کا لطف دُگنا ہو رہا ہے کہ گاڑھے خاں نے سخت اور کرخت آواز سے کہا کہ دروازہ کھولو طمل جان کا اِس آواز سے ماتھا ٹھنکا اور چونک کر کہا کون، گاڑھے خاں نے کہا کھولو، طمل جان نے کہا ارے کیا کھولیں، گاڑھے خاں نے پھر بلند آواز سے کہا کھولو ضروری کام ہے، طمل جان نے اپنی ملازمہ لوٹ جالی سے کہا کہ جا کر دیکھو تو سہی یہ کون بیہودہ، گستاخ بدنصیب ہے جو اپنا گلا پھاڑے جاتا ہے چنانچہ ملازمہ دروازے کے پاس آئی اور دروازہ کھولا تو گاڑھے خاں کو جامے سے باہر دیکھا، یہ دیکھ کر ڈری اور طمل جان سے گھبرائے ہوئے لہجے میں ہاتھ مل مل کر کہا بیوی آ گیا، طمل جان اری کون، لوٹ جالی نے جواب دیا کہ وہی موذی گھوڑا اسوینڈی کا ناس کے جائے ناس وہی گاڑھا ہے گاڑھا، اس کا پاجی پن تو دیکھو کیا منہ لے کر آیا ہے باہر سوری سے لگا کھڑا ہے یا اپنے آپ کو دہراتے کس بات پر ہیں، طمل جان نے کہا دروازہ نہ کھولنا، ملازمہ بیوی اب تو کھول دیا طمل جان نے کہا نکالو گھر میں نہ آنے دینا گلا گھونٹو دھکے دو گز بھوکو گردن ناپو مارو جس طرح ہو سکے نہ آنے دینا اور دیکھنا کہیں جانے بھی نہ پائے، یہ جس حیثیت کا ہے اس کی حیثیت سے سخت زنجیر گلے میں ڈالو سب طرح سے مجبور کرو، وار دو تم جاؤ، ننھے بھائی تم جاؤ اور اس کو رفل (رائفل) کا نشانہ بناؤ اور جو کچھ ہو وار پار ہو کٹی، بہن تم کیا سکوی سمٹی بیٹھی ہو چلو ہمت کرو ورنہ کام بگڑ جائے گا اور وہی ڈھاک کے تین پات اوڑھو یا بچھاؤ اور وہی افلاس کی کھوہ ہوگی اور ہم یہ سُن کر ٹل کر چلے اور پہلے سے دو دو بک شروع کی ننھے بولے جاؤ میاں جاؤ ورنہ سر نہ ہوگا اور اندر قدم رکھا تو کوچہ کاٹ ڈالیں گے اور بہن طمل سے مخاطب ہو کر بہن تم کیوں آئیں یہ موذی سمجھا ہی کیا ہے او گدھے سنتا ہے اگر ہمارے حلوے مانڈے میں فرق آیا تو یاد رکھنا کہ ہمشیرہ تجھے جان سے مار ڈالیں گی اور ہم تھانوں کی چٹھیاں اوکھیڑ اور اُن میں سے توپ، بندوق، تلوار اور ہوائی جہاز نکال نکال کر ایسا حملہ کریں گے کہ در بے نام سائیں کا۔ معلوم نہیں تم بھوے کس بات پر ہو کیا موٹے موٹے اعضا پر اور طمل جان سے مخاطب ہو کر باجی اس گھر میں ان کا رکھا ہی کیا ہے اور اب انہیں کے پاس کیا ہے ادھی پاس نہیں جو قند کا شربت ہی پی لیں اس برتے پر تتا پانی میں چاہوں تو ابھی دھجیاں بکھیر دوں اور اکڑ ان کی سب ملے کر دوں بس یہ تو بتاؤ ان کو حق ہی کیا ہے دنیا کی لذتوں سے، ان کی زندگی تو اس واسطے ہے اپنے ملک میں مقید رہ کر کمائیں اور ہم کو دیں ہم کھائیں اور

یہ فاقے سے ہمارا پہرہ دیں اور جلد مر جائیں اور ان کے ڈھانچ سے ہم کھاد گرم بنائیں اور ٹھنڈے ہمارے پودے بڑھیں اور ہمارے پودے اور گھملے (گملے) نیا گل اور طرفہ شگوفہ کھلاتے رہیں۔ گاڑھے خاں نے طمل جان کی طرف اشارہ کر کے مجھے اِن سے کچھ کہنا ہے اور ننھے خاں کو گاڑھے خاں نے اپنے پھٹے پھٹے دیدے دکھا کر کہا خصہ نہ کرو ٹھیرو ایسا نہ ہو کہ اس اینٹھ سے تڑخ جاؤ یہ رشتہ ہے کھینچو نہیں ٹوٹ جائے گا۔ طمل جان نے ننھے خاں سے اشارہ کر آنکھ ماری جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹھیرو اُنگلی ٹیکنے کا ذرا سہارا ہو جائے پھر تو دنیا سے مٹا دینا میرا کام ہے یہ کہہ کر طمل جان نے گھر سے پاؤں نکالے اور زہر خندہ ہنسی کی صورت بنا کر کچھ آگے آئیں گاڑھے خاں کچھ پیچھے ہٹے لیکن دروازے کی طرف کتراتے ہوئے غرض اسی طرح سے جب گاڑھے خاں دروازے کے قریب آئے تو جلدی سے قدم بڑھا دروازے کے اندر اور دروازہ بند۔ طمل جان نے آواز سے کہا سرکار یہ کیا۔ گاڑھے خاں نے جواب دیا کہ آپ سمجھ لیں طمل جان میں تو نہیں گھی۔ گاڑھے خاں بس یہی بہتر ہے کچھ ہم سمجھے کچھ تم طمل جان نے کہا تا تو دیا طمل جان، کیا۔ گاڑھے خاں راستہ اور خیر اسی میں ہے کہ شرنہ بڑھے اور خدا تمھاری چھینٹ کسی پر نہ ڈالے کہ وہ بھی آل سے جاتا رہے طمل جان۔ تم میری بات تو سنو تمھارے فائدے کی صورت ہے تمھارے سب مل جاتے رہیں گے اور تم کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ دنیا ہے کہاں بلکہ آرام سے رہو گے اور کروٹ لینے کی بھی تکلیف نہ ہوگی۔ گاڑھے خاں میں سمجھ لیا اگر پھر بھی ملنا ہے تو جاؤ ورنہ ایک سو چالیس کو تین دفعہ سمجھ لو، طمل جان ایک سو چالیس ہے لیکن اس کو کیا جانوں یہ کہہ کر خیال آیا تو معلوم ہوا کہ طا کے تو لام کے تیس الف کا ایک قاف کے سو یعنی طلاق ہوئی۔ طمل جان نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا افسوس یہ گھر مجھ سے چھوٹا۔ جس کو میں نے بنانا شروع کیا تھا اور ننھے سے کہا دیکھا بھائی یہ سب تمھاری غفلتوں سے ہوا کہ ہم اس حال کو پہنچے تم تو اِدھر اُدھر سنے میں رہے اور یہاں کام تمام ہوا اب کیا کروں اور نکاح کا کاغذ کھارو ے خاں کے پاس ہے سو وہ ایسا بھنڈا ہے کہ اب کیوں دے گا، افسوس جو جو میرے وطن سے یہاں آنے کو تیار تھے اور اسباب باندھ چکے تھے وہ وہیں رہے اور جو ہمراہی تھے وہ جگہ جگہ گڑوں میں بند رہے گھیاں میرے پاس ہیں اور جو ساتھ ہیں وہ شر بجر۔ اچھا اب بہتر ہے کہ اس قصے کا جہاں سے نام ہٹ جائے پاگی منگاؤں میں تو اب بھگت ہوں بدری نارائن جاؤں گی لیکن ایسے راستے سے چلنا جس میں آبادی نہ ہو جنگلی راستہ ہو یہ کہہ کر سوار ہو راستہ لیا۔ اُدھر گاڑھے خاں نے اپنے گھر کو دیکھا کہ سب اُلٹ پلٹ، چرمہ خاں کے انجر پنجر الگ ہیں، امیرتی کہیں، اتکا بلوں کے مارے دوہرا پڑا ہے، مال کے ٹکڑے ٹکڑے، دمڑی کا پتا نہیں، پونی، گالے، نگڑی، کتنی سب رفو چکر اور گھر کی یہ صورت کہیں پکانے کی بھٹی، کہیں آڑ کی ٹٹی، کہیں گھر میں لوہے کا جنگلہ (جنگلا) کہیں ملاقات کا بنگلہ (بنگلا)، کوئی جگہ سپاٹ کہیں کوئی اونچی اَلی کھاٹ گاڑھے خاں یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور دل میں کہا سچ ہے کہ دنیاوی لذتوں میں پھنس کر

آپ بھلا چنگے خراب بھی آنکھ کھلی میں تو بید جی کا مشکور ہوں نہ وہ گولیاں کھلاتے اور نہ دماغ صحیح ہوتا ورنہ ہمارا اس گھر میں حق اتنا بھی نہ رہتا۔ نظیر اکبر آبادی نے خوب کہا ہے شعر:

غفلت کی یہ جا کہ نہیں یاں صاحب ادراک رہ　　　دل شاد رکھ دل شاد رہ غمناک رکھ غمناک رہ

ہر حال میں تو بھی نظیر ایسے کا پائے خاک رہ　　　دنیا یہ ایسی ہے جگہ یاں صاف رہ بیباک رہ

کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہات (ہاتھ) لے

راستے میں ننھے خاں نے طمل جان سے کہا، بھئی ہم تو تمھاری ہمراہی سے مجبور تھے ورنہ نگوڑی کی توپ اور پچک کے گولے ایسے صحیح نشانے پر لگاتے کہ میاں گاڑھے خاں کی دھجیاں بکھیر دیتے اور تار تار ہو جاتے اور ان کے اجزائے بدن فزائے (فضائے) عالم کو دھنیے کی دُکان بنا دیتے اور ہوا و ہوس سے اِن کو اب بھی ایسا منتشر کریں گے کہ کبھی روئی کا پودا پیدا نہ ہو جو یہ پیدا ہوں اور دنیا میں بل ماریں۔ طمل جان نے کہا ہاں بھائی یہ مردود ہے تو اسی قابل کہ اس کی پیپے پر رکھ کر بوٹیاں اوڑائی (اُڑائی) جائیں اور آہ نہ کریں، لیکن ٹھیرو ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے کہ اس کو دھانسہ (دھانسا) پٹی دے کر اس ترکیب سے پارہ کھلائیں کہ میاں گاڑھے خاں تمام عمر امراض کو توالی چبوترہ بنے رہیں اور ہمیشہ اِس کے بدن سے پھوڑے اُٹھ اُٹھ کر اس کو فنا کرتے رہیں اور کوئی علاج نہ کر سکے اور یہاں سے جائیں کیوں اِدھر اُدھر کوئی تدبیر کریں۔ بھائی تم کو وہ دن یاد ہے جس روز میاں گاڑھے خاں نے اپنی مونچھوں کو بل دے کر اور تن کر کھڑے ہو کے تم سے کہا تھا کہ دیکھو مجھ سے عقل کی نہ لینا ورنہ نہ تیرا سوت نہ میری بُنائی پھر تو کون اور میں کون اِس پر تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے جواب دیا تھا کہ اتنے نہ اینٹھو دیکھو رشتہ ہے ٹوٹ جائے گا شادی کرنی کھیل نہیں گھر کر گھر کر ستر بلا سر رکھ سانپ سب جگہ ٹیڑھا چلتا ہے لیکن گھر میں سیدھا ہو جاتا ہے اور تم نے تیلی کا قصہ نہیں سُنا کہ ایک نکھوا اسا ای تیلی جوان طاقت ور تیل بیچنے آتا تھا اور ایسی کڑک کر آواز لگاتا تھا کہ محلّہ گونج جاتا تھا اتفاق سے چند روز نہ آیا ایک روز محلّہ میں آ کر نہایت کمزور آواز سے پہلے کھنکارا اور پھر کہا اری لو، یہ کہہ کر کچھ دیر دم لیا اور کہا تیل۔ ایک عورت اپنی پڑوسن سے باتیں کر رہی تھی کہ پڑوسن نے کہا لو! تیل والا آیا ہے تیل لے لے اُس نے کہا اوئی میں تو اپنے تیل والے سے لوں گی جو کھنک کر آواز لگاتا ہے۔ یہ فقرہ اتفاقاً تیل والے نے سُن لیا۔ دروازے میں منہ ڈال کر تھرائی ہوئی آواز سے کہا اری بہن تو یہاں تو آ میں وہی ہوں نکھوا تیل والا۔ پڑوسن یہ سُن کر دروازے کے پاس آئی اور کہا ارے بھائی تجھے کیا ہو گیا۔ تیلی سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا اری ہوا ہوا یا تو کچھ نہیں میری شادی ہوگئی۔ یہ سُن کر میاں گاڑھے خاں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا ہم تیلی نہیں جو بہہ جائیں گے ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، وہ تیلی تھا چکنا گھڑا ہوگا جو کولھو کے بیل کی طرح تمام عمر

پھرا اور آنکھیں نہ کھولیں میرا نام گاڑھا ہے گاڑھا دنیائے ہند میں میرا سب سے پہلے قدم آیا اب جب تک یہ طوفان ہے رہے آخر میں مَیں ہی میں ہوں گا۔ ململ جان نے لٹھے سے کہا کہ بھائی اب تو میری یہ رائے ہے کہ جلد چلو برسات سر پر ہے سمندر طوفانی زمین پر جگہ جگہ گڑھے گڑھوں میں پانی، ہمیں تو قدم قدم پر خطرہ ہے جلد چلو ایسا نہ ہو کہ کوئی اور طوفان اُٹھے غرض ململ جان سب کو خدا حافظ کہہ کر سدھاریں۔

اب گاڑھے خاں گھر کی اُدھیڑ بُن میں مصروف ہوئے اور اپنے برادر رضاعی کو بلایا کہ وہ سب میں فرد تھے۔ کہا: بھائی تم بھی میری طرف سے ایسے تنے اور مجھ سے بَل کی لی اور دُہراؤ کیا آخر وہ مجھ سے چوک کیا ہوئی اور تم تنے تھے تنتے بھائی کو کیا ہوا کہ اُنھوں نے پلّہ تک نہ دکھایا۔ ململ جان نے گھر تو گھر سارا شہر، سارا ملک سونت لیا اور تم نے مجھے تار تک نہ بھیجا۔ آپ ململ جان کے لئے لینے کے ڈر سے، خبر دینے سے کتراتے اور کنیاتے تمھارے کام تو ناکا ٹوک ہوتے تھے۔ ہاں میں سمجھا کہ ململ جان نے تمھارے ہونٹ رشتۂ الفت سے سی دیے۔ افسوس ہے کہ بھائی بھائی سے اپنا دل پھاڑے اور ایک ایک کو بگاڑے اس سے معلوم ہوا کہ تم کو جامۂ زندگی وبال ہے۔ بس بہتر ہے کہ کچھ کھا کے کسی کھڈی میں منہ چُھپا کے سو رہو کہ اوروں کو تمھارے بگاڑنے کی بھی فکر نہ رہے، اپنے ساتھ اوروں کو بھی کیوں اُلجھن میں ڈالا ورنہ تم کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ تم نے تو وہ ڈھڈی ڈھائی اور داڑھی کو کلپ لگایا کہ ہم سب کو منہ دکھانے کو جگہ نہیں، اگر تم کو مٹنا ہے مٹو اوروں کو تو تکلیف نہ دو کہ تمھارے مٹانے کی فکر بھی کامی آدمیوں کو کرنی پڑے اس آخری منزل کا کام تو خود ہی کرتے جاؤ کہ عاقبت میں ناکام نہ پکارے جاؤ تاکہ اتنا کہنے کا موقع ملے کہ گاڑھے خاں کے کنبے نے پاؤں مل مل کے منزل جالی اور بھائی جب سے تم نے ہمت جان کو طلاق دی گھر کا گھروا ہو گیا۔ سونا گھر رہنے سے گھر میں نحوست چیلہ اور حشرات الارض اس کثرت سے پیدا ہوئے ہیں کہ گھر میں قدم رکھنا، سونا، بیٹھنا حرام ہو گیا ہے۔ اگر ان کو طرح طرح کی غذا کھلاتے رہو تب تو خیر ورنہ میاں گرگٹ خاں رنگ بدل کر گولی مارنے کو تیار ہیں، اژدہے صاحب زہریلی گیس چھوڑنے کی تاک لگا رہے ہیں، چھت سے میاں اُلّو منحوس سایہ ڈالنے کی فکر میں منڈلا رہے ہیں اور بم چار رکھی ہے۔ گاڑھے خاں کے بھائی نے کہا کہ جناب میں کیا کروں جن صاحبوں سے لین دین تھا وہ اپنا پلّہ ہم سے چُھڑا کر الگ ہیں اگر میں اُن سے کہتا ہوں تو صرف زبانی جمع خرچ سے کام لیتے ہیں چوں کہ کچھ کما لیا ہے اور وہ بھی دشمنوں سے گٹھ کر، اب وہ بھی اینٹھ رہے ہیں اور ہماری آواز کان لگا کر بھی نہیں سُنتے۔ میں نے تو اپنا لین دین، کپڑا، اناج، سونا، چاندی سب ہی اُن کے ہاتھ میں دے دیا تھا لیکن اُن سے کہو تو اتنا تو کہتے ہیں کہ میاں جی گاڑھے خاں کی صورت پر اب تو شرافت برستی ہے، افلاس کی گھٹا جو چھائی ہوئی تھی وہ بادل پھٹ گیا اور چہرے پر نور آ گیا ہے اور بارش کے تاروں نے ظلمت کو دھو کر نورانی چادر اُڑھا دی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بارہ برس بعد کوڑی کے بھی دن پھرتے ہیں اور

گاڑھے خاں کے نوسو برس بعد پھرے ہیں اب شرط یہ ہے کہ ضروری کام کر کے اور لمبی چادر تان کر سوئیں۔ اچھا آپ یہ بندوبست کر کے ڈھاکے والی کی خبر لو کہ اُس بیچاری پر کیا گذری (گزری)۔

گاڑھے خاں کے برادر رضائی نے فرمایا کہ بھائی تم نے دنیاوی خواہشوں کے موافق تن پروری کی اور تن زیب اور زینت کے واسطے ایسا وقف کیا کہ مٹ گئے اور آپ کو برباد کر دیا اور اب تک کیسا خیال ململ جان کا ہے بقول داغ:

کتنا باوضع ہے خیال اُس کا
بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے

ڈھاکے والی کے گھر اور کنبے کے لوگ بندور کر کے پہلے تو تمھاری صورت سے ڈرتے ہی تھے اور اب تو نفرت ہی کرنے لگے اور گھر کا وارث نہ رہنے سے اتنے حشرات الارض پیدا ہو گئے ہیں کہ سونا بیٹھنا چلنا پھرنا، قدم رکھنا تک دشوار ہو گیا ہے کہیں گرگٹ صاحب اپنی نیلی نیلی آنکھیں دکھا کر کہتے ہیں مجھے دیتے جاؤ ورنہ گولی ماروں گا اور گولی مارنے کو تیار ہیں، کہیں اژدہے صاحب فرماتے ہیں چلنا پھرنا بند کر دوں گا میری دو وقتی غذا کر دو ورنہ زہریلی گیس ماروں گا، کہیں چھت میں الّو منحوس اپنا سایہ ڈالنے کو منڈلا رہے ہیں اور بم بچار کھی ہے اور کہہ رہے ہیں کہ میں نے جو مقرر کیا ہے اب سوایا دو ورنہ ہنچال کا بم ایسا ماروں گا کہ تمھارے چیتھڑے بکھیر دوں گا کیوں کہ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ میاں گاڑھے خاں لوگوں کے بہت سر چڑھے ہیں اور اُن کی ٹوپیاں اُتار کر اپنی ذات کو اُن کے سر منڈھا ہے اور اُس پر یہ لغویت کر اپنے جلے پھپھولے پھوڑے اور جلایا اس سے یہی بہتر ہے کہ اب آپ تمام اوزار جمع کیجیے جہاں جہاں سے ملیں تاکہ کارخانہ چلے تمھارا کارخانہ تو کاریگروں کی گنتی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے درجے کا ہے تمھارے گھر میں کیا شے نہیں ہے جو محتاج ہو اور ململ جان کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔ پرائے اڈّے پر شکرا پالا یا تو خود شکاری تھے یا اب شکاریوں کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے داہنے بائیں رہتے ہو۔ کیا ملا؟ طاقت کی گولیاں کھانی پڑیں جب آنکھیں کھلیں اور دل باغ باغ ہو گیا میں نے خیال کیا تو ڈھائی ہزار سے کم خرچ نہیں ہوا، خرچ تو کئی نسخوں میں ہوا لیکن دو تین نسخے یادگار ہیں اب دعا یہ ہے کہ تم تندرست ہو جاؤ اور چلتے پھرتے رہو اور وہاں میں نے یہ بھی سنا ہے خدانخواستہ آپ کی دونوں ٹانگیں ٹرام میں آنے سے بیکار ہو گئیں میاں اگر ایسا ہے تو پہلے ان کا بندوبست کرو اور ٹانگوں میں قوت آنے کی غرض سے پیدل چلا کرو جس سے ٹانگوں میں دم آئے اور ٹانگوں کا تیل نکل جائے اور کسی کام میں محتاج نہ رہو تم کو اب تو سہارا تکنا پڑتا ہے کیسا افسوس ہے کہ بے پیرا گی ٹس سے مس نہیں ہوتے ذرا تو غیرت کرو۔ یہ کیسی زندگی کہ دوسروں کے محتاج۔ اگر کسی نے پانی دیا تو پیا اور جو بند کر دیا تو پیاسے، اگر سہارا دیا تو چلے، کھانے کو جس قدر کسی نے دیا اُسی پر گزارہ کیا ورنہ سور ہے اب تو تم سوت

تک نہیں کاتتے وہ بھی پر محلے سے جیسا ملا خرید لیا اور سر پنڑ کر کے کام چلایا اور کسی نے کہا تو آپ کہہ دیتے ہیں آپ زندم جہاں زندم؟ واہ رے تمہاری خود غرض زندگی تم کو کیا ہو گیا تم تو دنیا کے مشہور گنے چنے لوگوں میں گنے جاتے تھے یا اب تھان میں بندھنے کے بھی قابل نہ رہے اسی واسطے تمہارے فقلوں پر لوگ منہ آتے ہیں۔ یہ ملک اور قوم بے رتی سے جیوڑا گھسا جاتا ہے۔ تکل کی لوا منحوس دیکھو انگ ہو جاؤ گے اور تمام عمر یہ چرخہ چرخ آپ کو ایسا چکر دیتا رہے گا کہ گھوم گھوم پھر وہیں کے وہیں، خدا نے تجھے تو مالا مال کیا ہے اور یوں تو ہر ملک کو باعتبار تقسیم کے قدرت نے اتنی بھی نعمتیں عنایت کی ہیں کہیں گرمی زیادہ کہیں سردی زیادہ، کوئی جگہ معتدل ہے، تجھ کو گرمی سے بھی حصہ دیا سردی سے بھی اور اعتدال کا پڑوس حق ہمسایہ مشہور۔ تو تو بچوں کی طرح سے حرکتیں کر رہا ہے جیسے ماں باپ بچے کو کچھ دیں اور وہ بچہ اپنی کم کجھی سے غصہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو نہیں لیتا دو چار دفعہ ماں باپ کہتے ہیں پھر جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نہیں لیتا تو وہ شے کسی دوسرے بچے کو دے دیتے ہیں اور بے عقل غصہ کرنے والا بچہ محروم رہ جاتا ہے پھر دوسرے وقت جب ماں باپ کو رحم آتا ہے تو اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔ اے گاڑھے اب قدرت نے تجھ پر رحم فرمایا ہے اب بھی اگر اپنی مروڑ میں رہے تو مروڑ سے گانٹھ پڑ جاتی ہے اور گانٹھ میں رس نہیں ہوتا۔ اپنی پور پور بچاؤ۔ یہی وقت ہے اگر اس وقت کو بھی تم نے ہاتھ سے جانے دیا اور چلنے والوں کا ساتھ نہ دیا تو کیا ہو گا ٹھوکروں میں ٹھکرائے جاؤ گے اور ململ جان کے دم میں دم ہے تو منزل مقصود پر پہنچنا کیسا گھر کی چوکھٹ ہی پر منزل ہو گی اور کہیں کے نہ رہو گے اور زندگی کا مزا اب جاتا رہے گا اور جب عاجز آؤ گے تو مجھے نظیر کا یہ مصرعہ سنانا پڑے گا۔

جب باپ کی خاطر روتا تھا اب اپنی خاطر رو بابا

اور جب ململ جان کے دروازے پر تم ڈھیر ہو گئے تو ململ جان کاہے کو تمہیں رکھیں گی تم سے اپنے راستے کو صاف کر دیں گی بس اب ٹھنڈے ٹھنڈے سیدھے ہو جاؤ دنیا کی نظر فریب میں نہ آؤ، ان الجھنوں میں الجھو نہیں اب تک ان چٹخاروں میں کیا مزا آیا برف کی لذت دیکھی سوائے تالو اور زبان کے رگڑے کے اور کیا پایا۔ تن پر لتا رہا نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی اور نہ پیٹ میں روٹی اب تو ہوشیار ہو جاؤ، اب تک خیر کچھ تیرے اچکے (اب کے) جو ڈوبو گے تو کہیں تھل بیڑا نہیں لگے گا۔ دنیا کے دریا کا پاٹ بڑا ہے اور خالی دریا پار کر ہزاروں جہاز آ گئے ہیں تمہاری نال کی کشتی کو اتنی جگہ بھی نہ ملے گی کہ بے جہاز رانوں کی مرضی ایک گرہ بھی سرک سکو آپ رواں میں ڈوب جاؤ گے اور جب تمہاری کشتی جھکولوں میں آ جائے گی تو غیر ہنس کر یہ کہیں گے کہ میاں گاڑھے خاں کچھ سیکھ آٹو تو آنکھوں کا اندھا اور نام نین سکھ ہے کہ سیدھے راستے سے بھٹا بھٹا چلتا ہے کیا آنکھوں پر جالا چھایا ہے۔ آگے سے ہٹ جا ورنہ غدہ باندھ دیں گے مگر واہ رے میاں گاڑھے تمہاری ڈھٹائی کے کیا کہنے۔ بچوں کا کہا سر پر پر تالہ نہیں رہے گا تجھے کیا کچھ نہیں آتا ہے یہ جو کچھ جان بوجھ کر کیا تیری یہ حالت دیکھ کر تجھ پر رحم کرتا ہے گناہوں پر

ظلم ہے، دیکھ سنبھل اور اس وقت کو غنیمت جان کہ تیری مدد کے واسطے دنیا کے ہاتھ اس وقت اُٹھے ہیں اگر اس وقت کو ہاتھ سے جانے دیا تو سر دُھنے گا اور یہی کہہ کر مر جائے گا۔ شعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے ہوئے (رہے) نہ اُدھر کے ہوئے (رہے)
گئے دو نوجوان کے کام سے ہم نہ اِدھر کے ہوئے (رہے) نہ اُدھر کے ہوئے (رہے)

یہ تیرے گاڑھے زہد کی کمائی یوں تو نے گنوائی اور طمل جان نکل گئیں اب اس خیال میں چکر کھاؤ اور چرخہ بن جاؤ جب گردش سے نکلو گے ورنہ خدا حافظ کہہ کر دنیا دنیا الگ اور تم دنیا والوں سے الگ، جب تم میں دم ہی نہیں تو کوئی لے کر کیا کرے گا یہ دنیا ہے بقول نظیر:

جو اَوروں کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پائے گا
جو آج کو جیسا دیوے گا ویسا ہی وہ کل پائے گا
گیہوں سے گیہوں، جَو سے جَو چاول سے چاول پائے گا
کل دیوے گا کل پائے گا کل پائے گا کل پائے گا

تیرے واسطے کب تک کوئی آنسوؤں کا تار باندھے اور شام کے مُردے کو کب تک کوئی روئے اب تم دُعا کے والی کے پاس جاؤ، اپنے کام کو دیکھو، صورت کو درست کرو، سیرت پیدا کرو، گھر ٹھیک کرو اور اب کے ملاقات میں تم سے باتیں ہوں گی۔

خلاق عالم نے جس کو جس حال میں پیدا کیا اس کے واسطے وہی حال اچھا ہے۔ جانوروں کو دیکھو قدرت کے خلاف آگے قدم نہیں دھرتے چنانچہ سو جانوروں کو دیکھو تندرست بخلاف حضرت انسان کے۔ اپنی ذرا ذرا سی لذتوں کے واسطے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہیں۔ کوئی روزوا لے زیادہ کھا کر تخمہ اور ہیضے کا شکار ہوتا ہے کوئی غیر ملک کی دوروزہ جھلک پر مرتا ہے غرض جو جو اشیا ہم سے دور ہیں وہ ہمارے واسطے مفید نہیں ہو سکتیں عام یہ کہ وہ کچھ ہی ہو ہمارا ملک گرم ہے قدرت نے جو جو چیزیں پیدا کیں وہ گرم ملک کی اصلاح کے لحاظ سے پیدا فرمائی ہیں اور جو ٹھنڈے ملک ہیں وہاں اُسی میل کی چیزیں پیدا کی ہیں، اگر ٹھنڈے ملک کی اشیا کو ہم گرم ملک میں استعمال کریں گے تو وہ نقصان کا باعث ہوں گی۔

گاڑھے خان کا دکھڑا

میر باقر علی

جب گاڑھے خاں گھر میں آئے اور کچھ اطمینان ہوا تب کونے کونے پر گھر کے نظر ڈالی تو سارا گھر لوٹ پوٹ نکاس کے دروازے پر گھاس پھوس، جھاڑ جھنکاڑ، کوڑا کرکٹ، داخل ہونے کا دروازہ صفا چٹ میدان۔ اب گاڑھے خان کو وہ فقرہ ململ جان کا یاد آیا کہ میں آپ کو منہ چکنا اور پیٹ خالی بنا دوں گی۔ گاڑھے خاں یہ سوچ کر بہت کلپے اور ململائے اور ہاتھ مل مل کر کہا، افسوس میں نے یہ کیا غفلت کی اب وہ مثل اصل ہے کہ دھوبی کا کتا، گھر کا نہ گھاٹ کا اور سوت نہ کپاس اور ململ جان اب تو دریا ہی کا پاٹ طے کر چکی ہوں گی اور موجیں مار رہی ہوں گی اور یہاں روڑی کے ٹھکرے سے سڑے بُودار ٹکڑے جن کو ہاتھ لگانے سے ہاتھ گندہ ہونے کا احتمال کہیں ٹین کا بکس جس کا پیندا زنگ آلود ہو کر سوراخ پڑ گئے ہیں اگر کاش تانبہ ہوتا تو گھسنے کے بعد بھی بک جاتا، کہیں کاغذ کا بکس خالی بے ڈھکنے کا، کہیں مچھلی کا ٹین کھلا ہوا، سخت بودار ایک چمڑے کا بٹوہ ملا جس میں کچھ پرزے مستطیل مربع کاغذ کے چند اُن میں چھید جو جوڑ یا باندھنے کے قابل نہیں اور کثرت استعمال سے میلے دھبے دار چیتھڑے، کہیں ایک دھجی جو سروں پر سے کچھ چوڑی اور بیچ میں سے پتلی جو لنگوٹی کے کام بھی نہیں آ سکتی، کہیں پرانا زنانہ جوتا جس کی ایڑی اتنی اونچی اگر کوئی عورت پہنے تو تمام ہیئر کے پیچھے کھنچ جائیں اور اگر حمل کے زمانے میں پہنی جائے تو بچہ صاف کیے ہوئے کبوتر سے زیادہ جسیم نہیں پیدا ہو سکتا۔ کہیں شیشے کے گلاس کے تیز اور دھار دار نوکیلے ٹکڑے کے سوائے ہاتھ پاؤں میں چبھ کر خون نکالیں اور کسی کام کے نہیں یا جیب کترے ان سے کام لیں۔ کہیں کچھ ڈاک سے آئے ہوئے کارڈ اور لفافے، کہیں بال پڑی جھوجھری کنارہ اور دستی ٹوٹی چینی کی پیالی، کہیں ٹونٹی ندارد اور ڈھکنا غائب پیٹ میں چھید سوئی، کہیں گلابی اور سفید پھٹے ہوئے جاذب کے ٹکڑے، کہیں شراب کی ٹوٹی پھوٹی بوتلیں، کہیں لنگڑی کرسی، کسی طرف ٹوٹی ہوئی میز غرض سوائے ایسے سامان کے اور کچھ گھر میں نہ ملا اب گاڑھے خاں ادھر اُدھر تانا بانا کرتے

پھرتے ہیں کہ شاید کچھ تار نکلے لیکن اسی الجھن میں پھر خیال آیا کہ کنبے والے کچھ مدد کریں گے تو ان کا تکلہ اپنے سے ٹیڑھا پایا اسی چکر میں کیا کروں یہ سوچ رہے تھے کہ خیال آیا کہ خواجہ نورباف جو میرے قدیم دوست اور سچے میرے خادم تھے افسوس میں نے ان سے کام نہ لیا ورنہ مجھے وہی بنا سنوار کر رکھتے تھے ان کو بلاؤں، اُن کے قدم کی حرکت سے کیسو وہ پار ہو جائے اور یہ جالے جو چھت میں لگے ہیں یہ سب صاف ہو کر گل لالہ کھل جائے گا اور جب میں اور وہ ملیں گے تو جگ بندھ جائے گا پھر کوئی طاقت ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ ہاں یہ مشہور ہے کہ جگ ٹوٹا اور نرد مری ورنہ جگ کا مارنا یہ کس کی بساط ہے۔ دو جب مل جاتے ہیں تو خانہ عافیت بنا لیتے ہیں پھر بازی اپنے ہاتھ ہے اور دشمن کا کوئی داؤ نہیں چل سکتا اور اس کے اوپر اگر پانسہ پڑ گیا تو دشمن بساط پلٹ کر گھر کا راستہ لیتا ہے پھر چاروں چوک اپنے اور کوئی قید باقی نہیں رہتی پھر اپنے پوبارہ اور دشمن کے پھوٹے تین کانے، بازی اپنی اور دشمن کے چہرے کا رنگ بدرنگ ہو جاتا ہے شرط یہ ہے کہ ہم دو ایک ہیں پھر کوئی تین پانچ نہیں کر سکتا پھر دنیا کی چوسر کھیلو کودو لیکن رنگ ڈھنگ اپنا بنا رکھو اپنی عقل کا رنگ ایسا رکھو کہ عقل کام کرتی رہے، دنیا میں بت بن کر نہ جیو ورنہ دونوں طرف سے ٹکرائے جاؤ گے۔ یہ خیال کر کے تانا شاہ درویش کو بلایا اور کہا کہ تم جا کر خواجہ نورباف صاحب کو جلد بلا لاؤ اور یہ کہنا کہ آپ کے چچا چرخہ خان صاحب کا علاج ایسے ہی طبیب حاذق سے کرایا ہے ورنہ ان غریب کے انجر پنجر سب الگ تھے اور بے لاٹھی قدم نہ رکھ سکتے تھے، چلنے میں چکر کھا کھا کر گر پڑتے تھے وہ غریب کیا کرتے کھونٹا ہی مضبوط نہ تھا اور غریب سے سب کا تکلہ ٹیڑھا اور مال ان کا لے کر سب پامال کر دیا تھا، بیٹھک تک چھن گئی تھی اور دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے ہاں اب خدا کا فضل ہے کہ بازار میں نکلتے ہیں اور اکثر ان کے مشتاق جمال ان سے آ کر ملتے ہیں، بعض دعوت دے کر اپنے ہمراہ بھی لے جاتے ہیں آپ تشریف لا کر اور مہربانی کی تار نظر ان پر ڈالیے اور یہ دیکھیے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا ان کی رشتے داری مجھ سے کہلوا رہی ہے میں تو ان سے یہ عہد کر لیا ہے کہ:

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

بھائی تانا اُن ہی نے میرے سارے کام سنوارے ہیں اور جب ان سے کہتا ہوں تو پوبارہ ہی ہوتے اور کہنا کہ آپ نے میری خبر نہ لی اب تو آپ ہی سے تار نکلیں گے کہ میری زندگی بہت الجھن میں پڑ گئی اور ایسے پھندوں میں آیا ہوں کہ آگا تاگا کچھ نہیں سوجھتا اور ہمارے بابو چکرو بنگال نے اس چکر میں ڈالا۔ اپنا تو فائدہ کیا اور سب کا نقصان اور دشمنوں سے ایسی گھلو مٹھو کی آخر دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے بابو صاحب کے ایک دن موقع پا کر دو ٹکڑے کر ہی دیے۔ تانا شاہ بولے وہ نہ آئے تو میں کیا کروں گا گاڑھے خاں نے فرمایا کہ بھائی مومن کا دل صاف ہوتا ہے تانا شاہ بولے جاتا ہوں اور آتا ہوں یہ کہہ کر اُونے ری کی لکڑیاں دونوں ہاتھوں میں لے کر چلے اور قدم

قدم پر اِس طرف اور اُس طرف بیچتے۔ تھان سنگھ کی گلی میں خواجہ نور باف کے پھاٹ کی تک پہنچے تھے اور ہاتھ میں رس گلے خواجہ صاحب کے واسطے جو لائے تھے، تانا شاہ نے دیکھا کہ خواجہ زینے پر کثرت کر رہے ہیں کبھی نیچے آتے ہیں اور کبھی اوپر جاتے ہیں اور آواز سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اس دنیا کا پاٹ بڑا ہے کھیون ہار اتو ہی تو ہے۔

تانا شاہ نے جب خواجہ کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو دل میں کہا کہ یہ کیا کریں چند پیشے ایسے ہیں کہ جن کا اثر دماغ پر پڑتا ہے۔ چرخ ور تکلنے والے سخت آواز کھڑ کھڑ کا کام جیسے چلو نے گاڑی بان بیلوں کی مصاحبت سے گاؤدی بن جاتے ہیں اور بے ناتھے بیل ہوتے ہیں اور اپنے قصور کا جوا دوسرے کے کاندھے پر رکھتے ہیں اور بعض ڈھری سے خراب ہوتے ہیں یعنی پیدائش سے روپیہ کو روپیہ اور تعجب کی جگہ اترے کہتے ہیں اور ان سے بات کرو تو پیٹھ پھیر دیتے ہیں، اپنے بڑوں کی لیک چھوڑ کر گمراہ ہو جاتے ہیں اور سب کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں اور گاڑی پر بیٹھے بیٹھے مجہول ہو جاتے ہیں ہاں اپنی مرضی کے موافق سب کو جوت لیتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ بارکش ہوتے ہیں سیکڑوں من مال اِدھر سے اُدھر ڈال دیتے ہیں غرض تانا شاہ نے خیال کیا کہ تو کس الجھن میں پڑا خواجہ نورو کو ساتھ لے کر چل یہ سوچ کر تانا شاہ نے خواجہ سے کہا کہ خواجہ صاحب آپ کس اُدھیڑ بن میں ہیں۔

آپ کو میاں گاڑھے خاں نے بلایا ہے، خواجہ نورو نے کہا کہ کیا ململ جان نکل گئیں اور خانہ داری کر چکیں اور گاڑھے خاں کا عقل کا کلپ اور بجھی کی مانڈھی نکل گئی اب کیا دماغ میں آیا جو آپ کو بھیجا، ململ جان کا تار آیا ہے آن کر مل جاؤ گاڑھے خاں نے کس بل بوتے پر کیا تھا اور اب چنچی کس بات پر اور اب کیوں کنی کھاتی ہیں۔ تانا شاہ نے کہا کہ جناب ململ جان نے گھر اوڈھنا رکھا تھا ظاہر میں برت رکھتی تھیں باطن میں ایک سے بغل گیر اور گاڑھے خاں کے واسطے تو ریچی کا کام دیا ایسا رگڑا کہ تار تار کر دیا اور ایسی لپیٹیں سے لپیٹن کہ گاڑھے خاں تہ ہو گئے خواجہ نورو نے یہ سن کر سر دھنا اور پھر مالک کارگاہ عالم سے گاڑھے خاں کے واسطے دعا کی کہ اے ہماری امیدوں کی باڑی کو ہرا رکھنے والے تجھ کو آسان ہے ہمیں مشکل گاڑھے خاں کی باڑی کو ہرا رکھ کیوں کہ ملازموں نے ململا پانی دے کر خشک کر دیا اور ان کے دولت خانے کی بلند کھنڈی سے بدل دی اور تندرستی کی حالت یہ ہے کہ کھنڈی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور تار نفس مل کر رہا ہے اور نبض کا ڈورا دوری ہو گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ اب ٹوٹا میری تو یہ تمنا ہے کہ جگ جگ جیو کیوں کہ میرا گورا دوست ہے اوروں کی طرح دیدہ دھویا نہیں اور نہ وہ میرے ساتھ کسی قسم سے کندی نہیں کرتا ہے اور اگر ایسا کرے تو میں اس خیال کو اس کی طرف سے دھو بھی ڈالوں گا، اُن سا بن کر دوست بگڑے تو دوستی پر سخت دھبا ہے ایسے دوست کو چھانٹے اور ملے تو چھوا چھو کیا اور کنارہ تو ہی نے گاڑھے خاں کی محبت میرے سر پر لادی ہے مجھ کو اس کی دوستی سے ایسا الگ کر دے جیسے صابن سے تار۔ استری کی بدولت اس نے یہ مصیبت اٹھائی، ململ جان استری سے اپنے حسن کی گرمی سے تمام زندگی کے بل اور سلوٹیں نکال دیں اور

گاڑھا کورے گھڑے کا چوہا بن گیا ورنہ دنیا کے گھر گھاٹ سے خوب واقف تھا اور یہ نشانی عمر بھر ان کے دامنِ حال پر لگی ہے۔ یہ کہہ کر اُدھے ری کی دونوں لکڑیاں دونوں ہاتھوں میں لے کر اور تن کر چلے اور دونوں ہاتھوں میں لکڑیاں اس واسطے لیں کہ دیتے ہاتھ کیوں چلو کچھ لے لو راستے میں نانا شاہ سے کہا کہ گاڑھے خاں نے چوک کھائی اب بھی بے لاگ رہتے ہیں یا ست گل ست تار کرتے پھرتے ہیں نانا شاہ نے کہا کہ جناب اب تو ٹوٹے ہوئے رشتے کی امید میں تدبیر کی سانٹ لگائی ہے ورنہ ململ جان نے تو مروڑ ہی دیا تھا۔ غرض باتیں کرتے نانا شاہ اور خواجہ نورو گاڑھے خان کے مکان پر آئے تو عجب سامان نظر آیا، جہاں گاڑھے خاں کے احاطے کی دیوار نہایت عریض اور طویل تھی وہاں صرف خار دار تاروں کا جنگلہ اور بیچ میں ململ جان کا جو بھو جو بنگلہ او پر تالی دار چادر اور اس پر اینٹری کی مہر کہ غرض نورو شاہ نے آ کر دیکھا کہ گاڑھے خاں کے دارونہ چرچہ خاں صاحب کھڑے ہوئے کوچی کی جھاڑو سے گھر کو صاف کر رہے ہیں اور ایک لڑکی چھانک ری نام تاروں سے لپٹی کھڑی ہے اس کو بتا رہے ہیں کہ گاڑھے خاں نے خواجہ نورو کو آتا دیکھ دوڑے اور گودڑ کے ڈھیر میں منہ چھپا کر جا پڑے۔ خواجہ صاحب نے کہا گاڑھے خاں کیا ہوا اُدھر گاڑھے خان کے رونے کا ایک تار بندھ گیا اور تار نفس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلنے لگا یعنی ہچکیاں آنے لگیں۔ خواجہ صاحب نے پانی سے گاڑھے کو بھگویا کہ مفارقت کی حرارت بجھ جائے اور میرا اتحاد اس مل سے بیٹھ جائے تو پھر چکر جاتا رہے گا۔ گاڑھے خان پاس آئے اور کہا ارے بھولو یہ کیا تو گودڑ میں دبا دبا کیوں پڑا ہے تجھ میں تو ابھی بہت کچھ دم ہے تیری قوت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے تجھ کو اپنی قوت کا اندازہ نہیں کہ میں کیسا ہوں اور کون ہوں اور کیا کیا خوبیاں جو قدرت نے تجھے دیں تیرے اندر موجود ہیں۔ انسان اِنس سے بنا ہے مگر آج کل اِنس انسان سے دور اور تجھ میں موجود، تو سب کو آرام دیتا ہے، پردہ پوشی کرتا اور عیب پوشی تو تیری قدیم عادت ہے، تجھے میں انسان نہ کہوں تو کیسے کہوں تو کھڑا ہو کر دیکھ تو سہی تو تو سب کو تہ کر دے گا اور لپیٹ کر رکھ دے گا۔ یہ چند روز کی اُلجھن ہی تھی اب مل نکل گیا:

آئے آئے کچھ حسرتیں دل کی نکلیں
وہی ہم ہیں وہی تم ہو وہی تنہائی ہے

تو اپنوں سے دل مت پھاڑ، اگر تجھ سے کوئی کترائے تو اپنی طرف سے دور سے ملا تا رہیو۔ تجھ کو تیرے خادموں نے وہ گلی سڑی بوری کونے کھدروں میں پڑی پرانی میلی بودار، پرانے لحافوں میں گھسی کہنہ رضائیوں میں بھری کوڑا کرکٹ چنتا ہوا غرض تجھے اور تیرے مہمانوں کو ایسی غذا کھلائی کہ بیچاروں نے اُگل اُگل کر اُبکائیاں لے کر کھا رہے ہیں۔ اگر کھانے والوں سے پوچھا جاتا تو کہتے ہیں کہ زر نکو رم، اگر ہم نے اُجلا سفید مانڈھا بچھایا تو ہم کو پرانے گودڑ کا پھل جس سے کسی درد کو سینکا ایسی صورت کی روٹی دی اور نان گزار سے دو چند دام

لیے ہم نے جو کہا کہ اتنے مہنگے دام تو جواب دیا کہ جھنگا ہے اور آپ ہی کی روئی کی جگہ بالائی کے پراٹھے کھائے اور سب سے کہتے پھرے کہ قوم قدر نہیں کرتی۔ تیری لطافت اور نرمی کی تو لوگ مثال دیتے ہیں، تیرا جسم مسام دار جو گرم ملک کے واسطے مفید (مصنف)، گاڑھے کو گرمی میں بدن انسان سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستانی گرم ملک کے ہیں، جب گرمی مساموں کو کھول دیتی ہے تو پسینہ خارج ہوتا ہے اور گاڑھا نرم، گداز اور مسام دار ہوتا ہے۔ جب گاڑھے کے پہننے والے کو پسینہ آتا ہے تو گاڑھا اپنی دبافت اور روئیں دار ہونے کی وجہ سے پسینے کو جذب کر لیتا ہے اور جب گاڑھے کے سوراخوں سے ہوا داخل ہو کر بدن سے مس کرتی ہے تو ہوا کا قاعدہ ہے کہ پانی کو ٹھنڈا کر دیتی ہے اس وجہ سے پسینہ ٹھنڈا ہو کر راحت پہنچاتا ہے۔ اس راحت کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو گاڑھا گرمی اور لو کے زمانے میں پہنے ہوئے ہو اور جو کپڑے ملوں سے بنے ہیں اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشین لچکدار مادے سے چلتی ہے اور لچکدار مادے کی قوت اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی ہے تو روئی جیسی نرم شے جب لچکدار مادہ آہنی کے پنجے میں آتی ہے تو روئی کی کوئی قوت باقی نہیں رہتی اور کپڑا نہایت ٹھوس ہو جاتا ہے جو برخلاف ملکوں کے کام کا ہی ہوتا ہے اور ہاتھ کا بنا ہوا گاڑھا کیسا ہی دوھنک کر بنے اور کاتنے والا کتنا ہی بل دے کر کاتے سوت میں رُواں باقی رہے گا جو پسینے کو بھی روکے گا اور سردی کے موسم میں سردی کو بھی ہم تک نہ آنے دے گا۔ ہم سردی کو روئیں سے روکتے ہیں لیکن سردی میں دوہرا گاڑھا جسم پر ہو کہ اوپر کا ابرہ سردی کے اثر کو روکے اور اندر کا استر ہمارے بدن کی گرمی کی مزاحمت کرے یعنی حرارت کو باہر جانے سے روکے اس وجہ سے سینکڑوں زمیندار دوہرے گاڑھے میں سردی کو نکال دیتے ہیں۔ بخلاف شہر والوں کے کہ اتنے لبادوں پر بھی طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اب برسات میں گاڑھا کیا کرتا ہے یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے نہیں نہیں ٹیڑھی کھیر نہیں آؤ میں بتاؤں یہ گاڑھے خاں ہیں برسات میں اپنا مزاج بدل دیتے ہیں یعنی چھریرہ بدن ہو جاتا ہے، ہوا خوری کی عادت کر لیتے ہیں وہ کیا آپ برسات میں جھرجھرہ گاڑھا پہنو جس سے بدن کو ہوا لگتی ہے، پسینہ بھی خشک ہو جائے گا اور تفریح بھی ہو گی۔ حقیقت میں جو جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دماغ انسان کو عنایت کی ہیں کہ صاحب دماغ بھی نہیں سمجھ سکتا اور سمجھ کے تو وارے نیارے ہیں تم دیکھو تو سہی کہ میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ۔ گاڑھے روتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ جناب میرے اپنوں نے مجھ سے دل پھاڑا اور دشمنوں نے مجھے لتاڑا کیا آپ ابھی مجھ سے کنی دبا کر جانا چاہتے ہیں اور رشتۂ الفت کو توڑنا تو خیر۔ افسوس اتنے عرصے سے آپ نے میری خبر نہ لی اچھا نہ لو لیکن میں تو جب تک میرے تار نفس باقی ہیں تو آپ کو الفت کی پٹیں لپیٹتا رہوں گا۔ میری زندگی تو شیطان کی آنت ہو گئی ہے۔ ململ جان سے مل کر زندگی کا عرض وطول بڑھ گیا، یہ پیوند میرے واسطے غیر جنس اور غیر مفید ثابت ہوا کہ اس الجھن میں تار نفس الجھا الجھا اور ٹوٹ ٹوٹ کر ہے کہاں ٹھنڈے ملک کی اجلی پری کہاں گرم ملک کا کالا کوئلہ سا بے وقوف اور بدصورت دیو، رات دن کا فرق، یہ

اجتماع نقیضین تھا ہر صورت سے دنیا اس کو محال کہہ چکی ہے لیکن میں موٹی عقل کا کندۂ ناتراش مفلس قلاش کہاں طمل جان باریک عقل اور نازک سمجھ کی خوش معاش اب اللہ کا شکر ہے میں تو اپنے خیال میں الگ ہو گیا ہوں اگر طمل جان بھی دامن چھوڑیں اور گریبان گیر رہا ہوں، مجھ سے نہ الجھیں اب میرا ارادہ ہے کہ اپنے اوزار پاڑ درست کر کے سب افراد کو جمع کروں جب سب اوزار پاڑ درست ہو جائیں گے تو جگ کا کھیون ہار اس نال کی کشتی کو پاٹ سے اگر ادھر جائیں گے تو ادھر ادھر جائیں گے تو اُدھر پار لگھا وے گا اور دریا کی موج یا سطحِ آبی پر جو سلوٹیں پیدا ہوں گے سب صاف ہو جائیں گی۔ خواجہ نورو صاحب نے دریافت کیا کہ میاں تمھارے دوستوں کی کیا نشانی ہے۔ گاڑھے خاں نے کہا واہ واہ صاحب واہ واہ آپ میرے ساتھ میرے دوستوں کو بھی بھول گئے، جس روز ہم اور آپ کھادر سے گزر رہے تھے سب میرے ساتھ تھے آپ کو یاد نہیں کہ سب میری شکل میں ملتے جلتے ہیں، کوئی مجھ جیسا دبلا پتلا، کوئی ڈگنا کسی کا رنگ عنابی، کوئی نیلا دھاری دار لباس پہنے کوئی مجھ جیسا میلا غرض ہمارے چھیلا کوئی اجلا کوئی میلا۔ یہ سب ایک ہی تھان کے ٹکڑے ہیں طمل جان کو میں نے اپنا ہی پیوند سمجھا تھا سو ہی بن کے بعد معلوم ہوا کہ یہ نکاح ادھڑ جائے گا کیوں کہ میں گرم مزاج کا اور طمل جان ٹھنڈی طبیعت کی، ان کے مزاج کی ٹھنڈک نے ایسا جمایا کہ باہر کے باہر مجھے گھر کی بھی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے تمام دن نین سکھ ملازم پاس آنکھیں بند پڑا رہتا تھا صرف طمل جان ہی کے کام کا رہ گیا تھا، انھوں نے کہا کھڑا ہو کھڑا ہو گیا کہا لیٹ جا لیٹ گیا غرض ایک بولی تین کام۔ اور جب وہ غصے میں چھاتی پر چڑھیں تو سوائے اس کے کہ چت پڑا رہوں اور کچھ نہ کرتا تھا:

حکم جورو جی ہے از حکم خدا

انچہ جورو جی بفرماید روا

خواجہ نورو صاحب نے فرمایا کہ یہ کہو کہ طمل جان نے تمھارا ڈرواں ڈرواں بکھیر دیا تھا اور ہاں یہ تو کہو کہ طمل جان نے تم کو کسی دن دُھنا بھی یا نہیں۔ گاڑھے بولے جناب یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ وہ اپنے دُھن کی پکی تھیں جب چاہا قصور بے قصور دھن ڈالا اور جندری سے تار کھینچ لیا اور گاڑھے گاڑھے حکم اور لٹھ مار باتیں کرنی شروع کیں میں تو ڈر سے جنگلوں میں منہ چھپائے رہتا تھا ہاں کبھی کبھی موسن خاں تو میری آ کر خبر لیتے تھے اور کوئی تو مجھے آ کر ہاتھ بھی نہ لگاتا تھا۔ اگر میں کسی سے دریافت کرتا تھا کہ میری کیا خطا ہے تو کہہ دیتے تھے کہ الگ رہو الگ ایسا نہ ہو کہ زمانہ ہم کو غریب کہنے لگے تو میں دل میں کلپتا تھا کہ یا اللہ میرے ساتھ غریب بھی غرق ہوئے۔ افسوس یہ اتنا نہیں جانتے کہ اس گلشنِ عالم میں دھوپ چھاؤں بھی الٹتی بدلتی رہتی ہے۔ جس نے ہمت کی دھوپ چاہا دھوپ چھاؤں چاہا چھاؤں جالی میں تو غریب ہوں یا امیر لیٹ گئے۔ دنیا کے پھندوں میں ایسے آئے کہ میری طرح گھر کو چھوڑ دیا، میری اور ان کی تقدیر کا ایک ہی سا خانہ ہے اس کے ساتھ کماچ خاں سپاہی رہتا تھا اور میرے پاس اس

کا بھائی بچا نکل بیگ ہے لیکن میرے ہر کام میں گھمار رہتا ہے یہ تو سب کچھ ہوا اب آپ کے خیال میں کہ میں کیا کروں۔ خواجہ نورو صاحب نے کہا کہ تمہاری بیوی کہاں ہے، گاڑھے خان نے یہ سن کر نیچی نظر کر بائیں ہاتھ کی کلے کی انگلی کو داہنے ہاتھ سے مروڑنا شروع کیا اور چپ۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ افسوس ایسے اک زُنے بجے کہ پلٹ کر نہ دیکھا تم کو یہ سزا ڈھاکے والی کے کلپنے سے ملی، تم نے طمل جان کے عشق میں ڈھاکے والی کو تبہ کر دیا اور اس کے دل کو داغ داغ بنا دیا اور تم نے دل سے اس کے خیال کو ایسا دھویا کہ تمہارے دل میں دھبا تک اس کی محبت کا نہیں جیسے میلے کپڑے کوئی الگ کر دے اور ایسے کورے دیدے کیے کہ گویا کبھی میل ہی نہ کریں گے یا محبت نے ایسا طول پکڑا اور اب اُس کا عرض مدعا بھی نہیں سنتے یہ کیو بڑی چوک کھائی اور طرفہ یہ کہ ڈھاکے والی کے ساتھ ہی سب کو لپیٹا اور آڑ میں شکار کھیلا اور تن تن کر کوچۂ دلدار میں تالا کرتے رہے، اُس کی کچھ خبر نہ لی اب تو ایسا پیچیدہ معاملہ ہو گیا ہے کہ اُس کا سلجھنا دشوار طمل جان بیٹ کی بلی نکل کہ سب سونت کر بھیج دیا اور تم ایسے اندھے ہو کر ڈوبے کہ اپنے بدن کے ٹکڑوں کو دیدہ و دانستہ پارچہ کرائے اور ان سے بھی پٹوایا اور آپ بھی ڈھنا اور وہ راز داری بات کی مخبری طمل جان سے خود کرتے رہے اس کو شرافت تو کیا شرر و آفت کہتے ہیں۔ اچھا اب تھان میں جا کر دیکھو اور مارک کا گھوڑا ہو تو اس پر زین یا امیرانی کے کام کا جو اچھا گٹھا ہوا چار جامہ ہو کس کر لاؤ اور دوڑ و اور سائیس سے کہو کہ اپنے بیوی لگڑی سے کہہ دے کہ جب تم میں نہ آؤں طویلے کے کام میں لپٹا رہے ایسا نہ ہو کہ چوک جائے اور کوئی پڑوسی غفلت سے چکر لائے۔ غرض گاڑھے خاں نے کھڑک سنگھ سپاہی جو آشوبِ زمانہ سے پورا ہو گیا ہے اس سے کہا کہ گھوڑا لاؤ۔ گاڑھے خان چونکہ گھر میں کچھ نہ تھا تازیانے کی جگہ سنٹھا ہاتھ میں لے کر سوار ہوئے لیکن مدت کے بعد جو سواری ملی تو لڑکھڑاتے ہوئے سڑک لیے اور بنیا چھوڑ کر کھیتوں کی پامن سے گزرتے، پاس کچھ نہیں ڈھاکے کے تین پات ننگے منہ نہار پاؤں، ڈھاکے والی کے مکان کی طرف چلے الغرض گاڑھے خان گھوڑے پر تنے ہوئے جا رہے ہیں اور اپنے دل میں یہ اُدھیڑ بن کر رہے ہیں کہ اتنے دنوں کے بعد جو گھر والے مجھے دیکھیں گے تو اُبرائیں گے اور مجھے گلے لگاتے شرمائیں گے، کوئی کہے گا کہ تیری رو بڑی رو بڑی صورت دیکھ کر نفرت ہوتا ہے، کوئی کہے گا بھائی اور کچھ نہیں تیرا بو دا پن ہمیں برا معلوم ہوتا ہے اور یہ کسی کو خبر نہیں جو میرے کارندے تھے انھوں نے غذا میں مجھے گڑ گوڈ کھلا کر ایسا کر دیا کہ جب کوئی کام کرتا ہوں نکل جاتا ہوں۔ اگر اب بھی مرے نمک حرام جو محض اپنی تن پروری کے واسطے مجھ کو تو پرانے گوڈ کے ٹکڑے کھلائے اور آپ بنی ہوئی سوئیاں اور بلدار پراٹھے کھاتے رہے تو میں اُن کو اُن کی بے ایمانی کی سزا ایسی دوں گا کہ رشتۂ حیات منقطع ہو جائے اور بھوکے مریں گے اور اگر ایمانداری سے کام کیا تو ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ مجھے اول یا دوسرے درجے کی غذا دیں تو خیر اور اگر وہی سٹ پٹ تیار کرتے رہے تو وہ جانیں۔ ایک روز بی اللہ جلائی خربوزہ لیے آئیں میں نے ان سے کہا کہ ایک

پھانک رہی مجھے دیتی جاتو اس نے میری طرف سے منہ موڑ لیا یہ بات میرے تن بدن میں ایسی چبھی کہ یاد ہے گویا گرہ میں بندھ گئی۔ اب میں دیکھ لیا کروں گا کہ غذا کیسی ہے میں نے ان سے کہہ دیا کہ اب تو میں غذا میں سوائے بچی روٹی کے اور وہ بھی پہلی دوسری دفعہ کی آخری روٹی کا پھل وری خانم یا اگر اچھی ہو تو پچھاڑ لڑے کو دوں گا اور جب غذا آگے آئے گی تو دیکھ لوں گا۔ اوّل تو روٹی کا رنگ بتائے گا کہ میں کیسا ہوں دوسرے گوڑ گانے لکڑی پھیک یہ سب میرے گھر میں بنی ہے یا باہر سے آئی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ الغتے میری عمدہ غذا تو خود کھا گئے اور مجھ کو بھٹیارے کا تار دار شوربا کھلایا۔ جب مجھے تازہ عمدہ غذا ملے گی تو پھر دیکھنا کہ گھر یہ فرماداوں کو کیسا آرام دیتا ہوں۔ گرمیوں میں ان کا پسینہ پہلے جذب کروں گا اور خار خانہ کی جالی سے چھان کر ہوا کو ایسا پنکھا جھلوں گا کہ پسینہ ٹھنڈا ہو جائے اور ان کو چین آ جائے جاڑے۔ میں دہری خدمت کروں گا باہر کے رخ تو روئیں دار فوج کو کھڑا کر دوں گا کہ جاڑے خاں دادا اور نیری خانم دادی آئیں تو ان کو روکے اور اندر کی پلٹن کو حکم دوں گا کہ ماما غریبی کی وجہ سے کچھ پہنے اوڑھے نہیں ہے اس کو باہر نہ جانے دیں۔ جب برسات آئے گی اس وقت میری استادی دیکھنا ایسے ہوا دار مکان سول سوت میں بناؤں اور ایسی کشادہ کھڑکیاں رکھوں جسے پن بھری پروائی ہوائیں تیز آ کر پسینے کے بادل کو اوڑا کرلے جائیں۔ اسی فکر میں لپٹے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ گوڑ شاہ کا تکیہ ملا۔ آرام کی جگہ دیکھ کر ادھر تو کھوائی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں شل کر رہے ہیں او گھٹنے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہوا سر پھر کی صورت چکرا رہا تھا اس وجہ سے سر کو خم کیے تکیے کی طرف بوجہ عظمت سر کے بل چلے، جب اندر آئے تو شاہ صاحب کو گبرو جوان پایا، چہرے کا رنگ بوجہ کیفیتِ روحانی قند کا ٹکڑا، جسم سرخ بانات سلی تاگے سے درست، منکا بھید بتا تا ان کا اوئی کھیل اس کی تسبیح میں دانائی سے مصروف ہیں۔ گاڑھے خاں نے دیکھا کہ شاہ صاحب تاتاری کلاہ زیب سر، جامہ دار گلے میں، بلغر تکیہ زیر بغل، بنگا بناری کمر میں لپیٹے بھاگل پوری لنگی باندھے، کرک کی لکڑی کی کھڑاویں سامنے رکھیں کچھ فاصلے سے ایک کنڈی میں دبی ہوئی آگ جس کا دود دخاں تاگے کی طرح باریک کچھ بلندی تک تو سیدھا اٹھتا ہے اور پھر تھرتھراتا ہوا چکر کھا کر ہوا میں پھیل جاتا ہے۔ ایک طرف کنڈلے میں بوئی بھنگی، گاڑھے کا بے منتا دیوار سے لگا گاڑھے خان نے کچھ جھک کر اپنے ہاتھ کو تانا اور سلام کیا شاہ جی یا تو جھکے بیٹھے تھے یا تنے اور جواب دیا پھر غور سے دیکھا اور کہا آہا کہو میاں کہاں کہاں گھومے اور بل مارے یہ کہو اب تو پکے ہو گئے ہو گے اور طمل جان کے بڑے بڑے کام کیے ہوں گے کہ ملک ملک نام ہو گیا ہوگا۔ گاڑھے خاں نے کہا ہاں سچ تو یہ ہے کہ جان لڑا دی اور طمل جان کا بول بالا رکھا۔ گوڑ شاہ نے گاڑھے خاں سے یہ سن کر کہا میاں تم کس الجھن میں پڑے ہاں یہ تو کہو طمل جان سے کے بچے ہوئے اور وہ کہاں ہیں گاڑھے خاں نے کہا ہیں سب سہی لیکن مرض تفرق اور اتصال میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ مرض ایسا پیچیدہ ولپٹا ہے نہ دیکھیے کہ اس مرض میں جاتے ہیں کہ رہتے ہیں۔ ہاں بڑی لڑکی رنگو دو بارہ برس کی ہے اس

کی تو صورت اچھی ہے کہ یہ باعتبار تن و توش کے عریض اور طویل ہے اور چھوٹی مُنّھی کو تو خدا بچائے اب تو رات بھی نہیں چلا جاتا چھدرا کر چلتی ہے۔ اس جھگڑے نے دونوں کا تو نچلا نکال دیا اب نہ وہ اس کے واسطے مفید ہے اور نہ کچھ میرے ہی کار آمد۔ میرے بدن کے ٹکڑے بھی مجھ سے الگ ہیں اور میرا تو وہ نقشہ ہے:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

شاہ صاحب نے فرمایا اب کدھر رہو گے اِدھر یا اُدھر گاڑھے خاں نہ جواب دیا کہ اب تو ڈھاکے والی سے غرض رکھوں گا، اِدھر اُدھر رہ کر تو روٹی کے لالے پڑ گئے تھے کبھی کہیں دودھ دبک کر پی لیا، کبھی کندہ کھایا اور صبر کیا کئی دفعہ اندر سے کی گولیاں بھی کھائیں، جان بڑی میٹھی ہے اور جب ڈھاکے والی تھیں تو منوں غذا رہتی تھی اور اس کے علاوہ کبھی بھاگل پور سے مل دار خاں جمعدار سامنے سے فرسر کرتے آ رہے ہیں۔ کبھی کالپی سے مصری خاں کوزہ پشت تشریف لا رہے ہیں اور ان دنوں میں تو منوں کی جگہ سیر اور سیر کی جگہ چھٹنکیں اور وہ بھی مشکل سے زردار خاں اپنی جگہ وہ چھتا پرزہ چھوڑ گئے جو کسی کام کا نہیں۔ ذرا سی بات میں جل جاتا ہے اور ایک عادت ایسے غضب کی ہے کہ روپیہ دو تو لے لیتا ہے اور طلب کرو تو لوٹ ہو جاتا ہے وعدہ کر کے پورا کرتا نہیں اور یہ بھی ہے کہ حکم چلا کر کام نکال دیتا ہے۔ جہاں جاتا کوئی خوش نہیں رہتا اور جب اس سے پوچھتے ہیں کہ بھائی تو کسی کام کا بھی ہے تو کورا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری ماں بھالو سے پوچھو سو وہ دور ہیں وہ ایسی کب سنتے ہیں اور کہو تو ان کے کان پر بقول جُوں تک نہیں رینگتی۔ شاہ جی نے فرمایا کہ اب تو جاتے ہی گھٹ جاتا، کوئی مل کی نہ لیتا اور اب بھی چکر لائے تو خیر۔

بہادر شاہ بادشاہ کا مولا بخش ہاتھی

میر باقر علی

مولا بخش اتنا بلند ہاتھی تھا کہ اس کے قد کے برابر ہاتھی نظر سے نہیں گزرا، دلی کے کسی دروازے سے نہیں نکل سکتا تھا، بہادر شاہ نے لاہوری دروازے کو مولا بخش ہی کے واسطے تڑوا کر بنوایا تھا، کہ مع عماری کے گزر جائے اور صرف لاہوری دروازے ہی کو کیوں توڑا؟ وجہ تھی کہ عید و بقرا عید کی سواری عید گاہ کے قریب ہونے سے اسی دروازے سے گزرتی تھی، لاہوری دروازے کے دو دروازے تھے۔"

ہاتھی تمام جانوروں سے زیادہ عقلمند ہے کیوں کہ اس کا سر بڑا ہے، اس وجہ سے اس میں عقلِ سلیم زیادہ ہے۔ جنگلی ہاتھی آدمی کا سخت دشمن ہے، جس وقت کسی آدمی کو دیکھ لیتا ہے، جہاں تک اس کا بس چلتا ہے ہزار تدبیر سے اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ایک دفعہ کا شکاریوں کا گزر ہوا واقعہ جو انھوں نے خود مجھ سے بیان کیا نہایت تعجب خیز ہے۔ سب ساتھی تو ایک پہاڑ پر چڑھ گئے ایک شکاری کسی وجہ سے اکیلا پہاڑ کے دامن میں رُک گیا، ایک نر ہاتھی نے اس کو دیکھا اور نہایت تیزی سے اس کی طرف دوڑا، اونٹ گھوڑے کے ہاتھ نہیں آتا اور ہاتھی جب تیز بھاگتا ہے تو اونٹ کی ہستی نہیں جو اس بلا بے درماں کو چھو لے، غرض یہ شکاری ایک نہایت تناور اور بلند درخت پر چڑھ گیا اور ہاتھی آ گیا، پہلے تو اس ہاتھی نے سونڈ کو بلند کیا، پھر کھا اس کی شاخوں کو توڑا، پھر مستک سے ریلا، پاؤں سے اس کی جڑ کو کھودا، جب یہ درخت نہ گرا تو اس نے کچھ آوازیں دیں، تھوڑی دیر میں ایک ہتھنی آ گئی، اس نے اس ہتھنی کو درخت کے پاس کھڑا کیا اور خود چلا گیا، آدھ گھنٹے کے بعد آ کر اپنے پیٹ میں سے پانی سونڈ کے ذریعے سے نکالا اور اس درخت کی جڑ میں ڈالا اور پھر مستک سے زور کیا، اس کے ہمراہی پہاڑ میں چھپے ہوئے دیکھ رہے ہیں غرض یہ دوسری دفعہ پھر پانی لینے گیا، اس عرصے میں ایک ڈار ہاتھیوں کی قریب سے گزری اور یہ ہتھنی اس میں جا ملی، اس وقت یہ بے چارہ اُتر کر بھاگا اور اپنے ہمراہیوں میں آ کر ملا۔

جب ہاتھیوں کی ڈار گزرتی ہے تو ایک ہی راستے سے گزرتی ہے بلکہ قدم کے نشان پر قدم رکھتے ہیں، سب سے بڑا ہاتھی آگے ہوتا ہے اور اس سے چھوٹا اس کے پیچھے، غرض بلحاظ عمر کے آگے پیچھے چلتے ہیں اور اگلا ہاتھی اپنی سونڈ میں ایک درخت کا ٹہنا لے لیتا ہے، جب اس ٹہنے سے زمین کو دیکھ لیتا ہے، تب آگے قدم دھرتا ہے۔ رات کو جہاں یہ سوتے ہیں تو بڑا میدان صاف دیکھ لیتے ہیں اور نر چھوٹی عمر کے الگ اور مادہ الگ لیکن بڑا ہاتھی مادینوں کے پاس ہوتا ہے اور نگرانی کرتا ہے۔

ہاتھی دو قسم کا ہوتا ہے، ایک مکھنا دوسرا دوگھیل مکھنا کے دانت نہیں ہوتے اس کی کیا وجہ ہے کہ نر تو ہے لیکن دانت مثل مادہ کے ندارد۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر جانور بہت سی باتوں میں انسان کے خواص اور افعال میں متحد ہیں جیسے حمل کا ذب کتیا کو بھی اکثر دیکھا گیا ہے۔

انسانوں میں بعض مولود ایسے ہوتے ہیں کہ ہیں تو وہ مرد لیکن قدرتاً اوئی مرگئی میں لگ جائے آگ، مجھ نگوڑی کو کیوں چھیڑتے ہو، بات کرنے میں ناک پر عورتوں کی طرح انگلی رکھ لیتے ہیں، راستہ کر لچکا کر نہایت نزاکت سے چلتے ہیں اور بعض عورتیں ہوتی تو ہیں وہ عورتیں لیکن ان کی حرکات مردانہ ہوتی ہیں، پنڈلیوں پر بال ہوتے ہیں، لب بالا پر سبزی ہوتی ہے، آخر عمر میں ان کے منہ پر ڈاڑھی نکل آتی ہے۔

عورت کا مزاج قدرت نے ٹھنڈا پیدا کیا ہے البرد مجمد مقبض اس وجہ سے مسامات عورت کے تنگ ہوتے ہیں اور بال پیدا نہیں ہوتے، طبیہ قاعدے کے موافق ایسی عورت سے شادی کرنی درست نہیں۔ ہمارے ملک کی عورتیں اگر یہ مسئلہ سمجھ لیں کہ عورت کی قوت مصورہ کا اثر جنین پر کیوں کر پڑتا ہے تو وہ چاہیں تو مولود بادشاہ پیدا ہو سکتا ہے اور اگر فقیر چاہیں تو فقیر۔ لندن میں دو عورتوں نے جس روز سے حمل قائم ہوا ایک نے تو مصوری کی اور ایک نے اقلیدس کی شکلوں کو حل کرنا شروع کیا، جب دونوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے تو جس نے مصوری کی تھی اس کا بچہ ڈھائی برس کا ہوا تو اتفاقاً کاغذ اور پنسل اس بچے کے ہاتھ آ گئی، اس نے پنسل سے جو لکیریں کھینچیں تو پورے انگلینڈ کا نقشہ بنا، جو اس وقت عجائب خانے میں لندن کے موجود ہے اور دوسرا لڑکا زبردست عالم ہوا اور جس نے نقشہ کھینچا تھا وہ مشہور انجینئر ہوا۔ جس وقت عورت کو حمل رہے تو گھر والوں کو مناسب ہے کہ حاملہ کا کمرہ الگ کر دیں اور اس میں ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کو دیکھ لیں اور اس کمرے میں ایسی چیزیں رکھیں کہ جو دلچسپ اور نظر فریب ہوں، جو لوگ حاملہ کے پاس جائیں تو اس سے ایسی باتیں کریں جو فرحت خیز ہوں اور حمل قائم ہونے کے دن سے حاملہ کو مناسب ہے کہ اپنے خیال کو بچے کی نشو و نما اور اس کے اخلاق، شکل و صورت کو اپنے حمل میں خیال کرے تو انشاء اللہ بچہ ویسا ہی پیدا ہوگا جیسا اس کی ماں کا خیال ہوگا۔ اس سے یہ بات ثابت ہے کہ اگر عورت چاہے تو بچہ بادشاہ پیدا ہو اور اگر فقیر چاہے تو فقیر۔ ہندوستان کی عورتیں جب تک حمل کا زمانہ رہتا ہے یہ خیال کرتی ہیں کہ دیکھیے

کیا ننھا ہوتا ہے یا ننھی، غرض کھنا بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ ہاتھی میں مثل گھوڑے کے زیادہ عیب نہیں ہوتے خوبیاں یہ ہیں کہ مستک بلند ہو، پائل ہو، جھول ہو، ناخن سولہ، اٹھارہ یعنی طاق نہ ہوں، دم کا پورا اٹھا ہو، کوکل پوچھا، قینچی دبا، جھاڑو پوچھا نہ ہو، دانت پلک دستا ہو، زیر دستا یعنی زمین کی طرف دانت والا اور سامنے کے دانت والا نہ ہو ہاتھی کی عمر کی شناخت یہ ہے کہ ہر دس برس کے ہاتھی کے کان کا بالائی کنارہ ، انگل بھر چہرے کی طرف پلٹ جاتا ہے، اگر چار انگل الٹا ہوا ہو تو ہاتھی چالیس برس کا ہوتا ہے، ہاتھی کی جب مستی شروع ہوتی ہے تو کنپٹیاں تر ہو جاتی ہیں اور ایک چکنا چکنا مادہ نکلتا رہتا ہے اور جب دونوں کوکوں کے ابھار سے چکنا مادہ شروع ہوتا ہے تو ہاتھی اس وقت بے ہوش ہوتا ہے، فیل بان اس مادہ نکلنے کو چاروں جھٹیاں بجنی کہتے ہیں۔ ہاتھی کی باگ نہیں ہوتی، فیل بان سوت کا کلاوہ ہاتھی کے گلے میں ڈالتے ہیں اور اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ بنا لیتے ہیں جس کو رکابیں کہتے ہیں، اس میں پاؤں رکھ کر پاؤں کے انگوٹھے سے ہاتھی کے کان کی جڑ کو چھیڑتے ہیں، اگر ہاتھی کو جلد چلانا منظور ہوتا ہے تو پاؤں کے انگوٹھوں کو جلد جلد لگاتے ہیں اور دوڑانا منظور ہوتا ہے تو ایڑی بھی ہاتھی کے شانے پر مارتے ہیں، اگر موڑنا منظور ہے بائیں کو تو داہنا انگوٹھا لگاتے ہیں اور دائیں کو بایاں، ہاتھی کے سر پر مارنے کا آلہ اس کو گجباگ کہتے ہیں۔ ہاتھی کی نشوونما تقریباً چالیس سال تک ہوتی ہے اور یہ کلیہ ہے کہ جس ذی روح کا جتنا زمانہ نمو کا ہوتا ہے اس سے اس کی عمر طبعی تگنی ہوتی ہے، بیل تین برس کا جوان ہوتا ہے، تین چھ نو برس کا بیل بڈھا، چنانچہ اکثر طبیب عمر انسانی کے نمو نے کا زمانہ اٹھائیس زیادہ و تر تیس بعض چھتیس برس کہتے ہیں، اس حساب سے اسی نوے برس کا آدمی طبعی عمر کا ہوتا ہے لہٰذا ہاتھی کے نمو کا زمانہ تیس یا پینتیس سال ہوتے ہیں، ہاتھیوں کو اودگی یا اودھی سے گرفتار کیا جاتا تھا۔ اودھی زمین میں ایک گڑھا کر دیتے تھے اور اس پر کمزور لکڑیاں پاٹ کر اور تنکے رکھ اس پر مٹی ڈال کر کچھ ایسا سبزہ بو دیتے تھے جو ہاتھی کو مرغوب ہوتا ہے، جب ہاتھی اس کے کھانے کو آتا تھا تو اندر گر جاتا تھا، اکثر کے ہاتھ پاؤں میں چوٹ لگنے سے ہاتھی بے کار ہو جاتا تھا لیکن وہ گڑھا اتنا نیچا ہوتا تھا کہ جنگلی ہاتھی سونڈ سے سونڈ ملا کر باہر نہ نکال لے۔ دوسری ترکیب یہ تھی کہ ہتھنیوں کو سکھایا جاتا تھا کہ یہ جنگلی ہاتھی سے خوش فعلیاں کر کے ڈار سے الگ کر لیتی تھیں، ان ہتھنیوں کو طلیلیں کہتے تھے اور خود اس طلیل کے کان کے پیچھے چھپ جاتے تھے یہ طلیل فیل بان کو ایسا چھپاتی تھی کہ جنگلی ہاتھی اس کو دیکھ نہ سکتا تھا، یہ فیل بان جنگلی ہاتھی کی مستک پر پھندا پھینکتا تھا، ہاتھی اس پھندے کو اپنی سونڈ سے ٹٹولتا تھا، وہ پھندا اس کے گلے میں آ جاتا تھا جس طرح ہمارے ملک کے جاہل طرح طرح کے پھندے اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں، اب گورنمنٹ عالیہ نے احاطے مقرر کیے ہیں، ان میں ہاتھی آ جاتے ہیں دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، جس ہاتھی کو پکڑنا منظور ہوتا ہے اس ہاتھی کو روک لیا جاتا ہے باقی نکال دیے جاتے ہیں ہاتھی پر گورنمنٹ نے فی کس کے اوپر کچھ محصول لگایا ہے، جب ہاتھی کو گرفتار کرتے ہیں تو مہینوں بھوکا رکھتے ہیں، پھر اس کے پاس آتے

ہیں، آگ دوز روشن کرتے ہیں، کچھ اس کو کھانے کو تھوڑا دیتے ہیں، رات کو جگاتے ہیں، پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، آتش بازی چھوڑتے ہیں، ڈھول بجاتے ہیں اور پھر اس کو آواز پر لگاتے ہیں، میل آگے چلنے کو، دست پیچھے ہٹنے کو، جنش گھوم مڑنے کو، دوے پانی پینے کو، ہاتھی کی جتنی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کا چہرہ سفید ہوتا جاتا ہے۔ مولا بخش ہاتھی کو ایک سوداگر اکبر بادشاہ کے زمانے میں لایا تھا، شاہجہاں نے امام جامع مسجد اور امام عید گاہ خاص تراش اور فیل بان بخارا سے صحیح النسب سید بلوائے تھے کہ بادشاہ کی جانب سے پشت کرنا ترک ادب ہے۔ فیل بان کو مہابت خاں کا خطاب دیا اور جاگیر دی قریب شہر، جو اب تک مہابت خاں کی ریتی کہلاتی ہے یہ سید صاحب اس کے فیل بان تھے اس قصے میں جہاں مولا بخش کا نام آئے گا وہ اسی ہاتھی سے مراد ہوگی، جب مولا بخش جوان ہوا تو اس کی مستی شروع ہوئی، مولا بخش اتنا بلند تھا کہ جب اس پر عماری کسی جاتی تھی تو دہلی کے کسی دروازے سے نکل نہیں سکتا تھا چاروں گھٹنے ٹیک کر شہر کے باہر آتا تھا اور اسی طرح اندر داخل ہوتا تھا اس وجہ سے بادشاہ نے لاہوری دروازے کو تڑوا کر بجائے ایک دروازے کے دو دروازے نہایت بلند بنوا دیے تھے جن کو کمپنی نے توڑ کر صاف کر دیا اور لاہوری دروازہ کیوں تڑوا دیا وجہ اس کی یہ تھی کہ قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر چاندنی چوک کی سڑک جو مشہور ہے، نہایت کشادہ ہے، چاندنی چوک یہ بازار چاندنی چوک کہلانے کا اس وجہ سے مستحق ہے کہ چاند کے طلوع سے غروب تک ہر موسم میں اور ہر وقت چاندنی اس بازار میں پڑتی ہے، اس بازار سے گزر کر دوسرا بازار کھاری باؤلی ہے، کہ یہ بھی دہلی کے اور قدیم بازاروں سے کشادہ ہے، اس کے خاتمے پر لاہوری دروازہ تھا اور دروازے سے عید گاہ جو شہر کے باہر ہے، قریب ہے!

تمام ہاتھیوں کی مستی سردی کے موسم میں ہوتی ہے اور گرمیوں میں جو مسامات کشادہ ہو جاتے ہیں وہ مادہ مسامات کے ذریعے سے نکل جاتا ہے جیسا کہ اونٹ کے کانوں کے پیچھے، گردن کے اوپر کچھ سیاہ بال ہوتے ہیں، جب اونٹ مست ہوتا ہے تو ان بالوں سے کالا چیپ سا بہتا ہے، جس وقت تک یہ چیپ بہتا رہتا ہے اونٹ مست ہوتا ہے۔ مولا بخش کی مستی جب سے شروع ہوئی ختم نہیں ہوئی تا حیات مست رہا۔ ایک روز مولا بخش نے سید صاحب کو مستی کی بے ہوشی میں مار ڈالا، شتر کینہ تو مشہور ہے لیکن ہاتھی اور بھینسا یہ دونوں انسان کے سخت دشمن ہیں یہ دونوں آدمی کو نڈی طرح مارتے ہیں مولا بخش نے مستی کے عالم میں سید صاحب کو غافل پا کر سونڈ میں لپیٹ ایک پاؤں اپنے پاؤں کے نیچے اور ایک ٹانگ سونڈ میں پکڑ کر چیر ڈالا، سید صاحب کی بیوہ کے ننھا سا بچہ دو ڈیڑھ برس کا ان کی گود میں تھا، خاوند کے غم میں روتی پیٹتی آئی اور اپنے بچے کو اس کے آگے بٹھا کر کہا کہ لے موئے اس کو بھی مار ڈال، مولا بخش نے اس بچے کو اپنی گردن پر سونڈ سے پکڑ کر بٹھالیا، اس روز سے یہ بچہ جب تک مولا بخش کے سامنے رہتا تھا مولا بخش سے جو کچھ وہ کرتا تھا اور جب یہ بچہ مولا بخش کی آنکھ سے اوجھل ہوا اور مولا بخش نے دنگا

کرنا شروع کیا اس بچے کا نام رحمت علی تھا، جب یہ بچہ بڑا ہوا تو اس کے ہم عمر بچے اس سے کھیلنے کو آتے تھے اور مولا بخش بھی ان سے کھیلا کرتا تھا اگر کسی بچے نے سید صاحب سے کہا کہ یار گنا نہیں کھلواتے تو سید صاحب مولا بخش سے کہتے تھے کہ مولا بخش ہمارے یار کو یاری دو تو مولا بخش گنا چھیل کر جس بچے کو سید صاحب کہہ دیتے تھے یہ دے دیا کرتا تھا۔ فیل خانہ جامع مسجد کے شرقی دروازے کے آگے جو سڑک ہے، جس جگہ سے یہ سڑک قلعے کے قریب مڑ جاتی ہے اس موڑ پر فیل خانہ تھا، اب تمام دن گنوں کے لالچ سے لڑکے جمع رہتے تھے، کوئی لڑکا کہتا تھا کہ مولا بخش یار چڑھی دلواؤ تو یہ اپنی سونڈ پر سے یا پاؤں کو ٹیڑھا کر کے اس لڑکے کو اپنے اوپر چڑھا لیتا تھا، جب لڑکے زیادہ ہوتے تھے اور کوئی لڑکا ان میں سے کہتا تھا کہ مولا بخش یاری آوے تو مولا بخش گنا چھیل کر سونڈ میں لے لیتا تھا، اور تمام بچوں کی نظر بچا کر اسی لڑکے پر گنا پھینک دیتا تھا اور مولا بخش کو جب چرکٹا روٹی دیتا تھا تو یہ ہر نوالے میں سے ایک کنارہ روٹی کا اپنی باچھ سے باہر نکال دیتا تھا، جو لونڈا پاس کھڑا ہوتا تھا وہ دوڑ کر اس کے منہ سے نکلے ہوئے ٹکڑے کو پکڑ لیتا تھا۔ ہاتھی کی روٹی دو تین انچ موٹی ہوتی ہے، یہ بچہ اس کو زور کر کے توڑنا چاہتا تھا اور مروڑتا تھا، مولا بخش بھی سر ہلاتا تھا گویا اپنی زبان میں یہ کہتا تھا کہ نہیں، غرض بہ ہزار وقت جب ٹکڑا اس بچے کے ہاتھ آ جاتا تھا اور بچہ وہ ٹکڑا لے کر بھاگ جاتا تھا اس وقت مولا بخش وہ نوالہ کھاتا تھا، ہر نوالے میں سے جب تک کوئی بچہ ٹکڑا نہ لے لیتا یہ روٹی نہ کھاتا تھا لڑکوں سے مولا بخش کا یارانہ بھی تھا، جہاں کسی لڑکے نے مولا بخش سے کہا کہ مولا بخش لنگی آوے تو مولا بخش اپنا ایک پاؤں اٹھا لیتا تھا اور وہی لڑکا جب گھٹنے کی کہتا تھا تو مولا بخش زمین پر پاؤں رکھتا تھا اور اگر فیل خانے کے کسی آدمی نے بچوں کو دھمکایا کہ جاؤ اور وہ چلے گئے بگی مانگ کر تو مولا بخش اپنا پاؤں اٹھائے رہتا تھا، ہر چند سید صاحب کہتے تھے کہ بیٹا وہ بچہ تھا چلا گیا لیکن مولا بخش کب سنتے تھے، جب اسی لڑکے کو بلا کر لاتے تھے اور وہی لڑکا کہتا تھا کہ مولا بخش گھٹنے کی تو پاؤں زمین پر رکھتا تھا۔ مولا بخش جب بادشاہ کے روبرو آتا تھا تو دونوں گھٹنے ٹیک کر اور سر جھکا کر سلام کرتا تھا۔ اس کی مستک اتنی بلند تھی کہ سید صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے اور جب بادشاہ سوار ہوتے تھے تو نہایت ادب سے سرنگوں چلتا تھا۔

سید وارث علی! شاہی کبوتر باز نے ایک ساتھ سبزوں کا تیار کیا اور ان کی تہ اور قفل ایک ہاتھی پر بنائی، جب بادشاہ عید کی نماز کو سوار ہوئے تو کبوتر بادشاہ کے سر پر گردش کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

مولا بخش جب اپنے گنے لاتا تھا، اور بازار میں کوئی لڑکا کہتا کہ مولا بخش لنگی آوے تو مولا بخش قیں کر کے ایک پاؤں اٹھا لیتا تھا، چرکٹا ہر چند کہتا تھا کہ بیٹا چل لیکن کیا ممکن جو یہ آگے سرک جائیں جب تک گھٹنے کی وہی لڑکا نہ کہے یہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔

ایک روز فیل بان نے بادشاہ سے عرض کی کہ حضور مولا بخش تمام گنے اور راتب کی روٹیاں بانٹ دیتا ہے،

پہرے پر حکم دے دیا جائے کہ کوئی لڑکا نہ آنے پائے چناں چہ بادشاہ نے حکم دے دیا۔ صبح کو مولا بخش نے حسب معمول لونڈوں کا انتظار کیا، جب کوئی لڑکا نہ آیا تو مولا بخش نے گنے نہ کھائے، شام کو راتب نے کھایا، پانی نہ پیا، دوسرا روز گزرا فیل بان نے ہر چند کہا کہ بیٹا روٹی کھالے لیکن مولا بخش نے کچھ نہ کھایا، جب تیسرا روز ہوا تو فیل بان کو خیال ہوا کہ یہ تو مر جائے گا اگر نہ کھائے گا مجبور بادشاہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ حضور مولا بخش نے تین روز سے کچھ نہیں کھایا، یہ سن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ بھائی میں بھی فقیر ہوں اور میرا ہاتھی بھی ایسا ہی ہے، خدا نے ہم کو اس واسطے دیا ہے کہ ہم بانٹ کر کھائیں، پہرے پر حکم دو کہ کسی لڑکے کو نہ روکا جائے، غرض جب لونڈے آئے تو مولا بخش نے راتب اور گنے بانٹ کر کھانے شروع کیے۔

نواب احمد بخش خاں صاحب نے جو فیروز پور کے نواب تھے ایک ہاتھی کھنا بڑا اقد آور تیار کیا کہ مولا بخش سے اس کو لڑوائیں گے چناں چہ جب یہ ہاتھی تیار ہو گیا تو نواب صاحب موصوف نے بادشاہ کو ایک عرضی لکھی کہ حضور مولا بخش سے میں کھنا کو لڑاؤں گا۔ بادشاہ نے اس پر حکم لکھ دیا کہ تم میرے بچے ہو، میں تم سے کیوں کر ہاتھی لڑا سکتا ہوں، اگر مولا بخش نے مار لیا تو مجھ کو رنج ہو گا اور اگر کھنا نے مارا تب بھی مجھ ہی کو صدمہ ہو گا، ہاں اگر کوئی میرے برابر والا مجھ سے ہاتھی لڑائے تو میں لڑا سکتا ہوں لیکن اس حکم کا نواب صاحب پر کیا اثر ہوتا، نواب صاحب ہزاروں روپیہ کھنا ہاتھی پر صرف کر چکے تھے، اپنے فیل بان کو حکم دیا کہ جب مولا بخش نہانے کو جمنا پر جائے تو تو کھنا کو مولا بخش پر ہول دے۔ ایک روز گرمی کا موسم دوپہر کا وقت چرکٹا مولا بخش کو نہلانے لے گیا، مولا بخش جمنا میں نہا رہا ہے، وہ جمنا کا نیلا نیلا لہردار چمکتا ہوا ریتا، سورج نصف آسمان سے کچھ ڈھلا ہے اور جمنا کے دونوں کناروں پر خربوزے اور تربوز کی بیلیں جو اپنی جو لیوں سے بنی ہوئی پھونس پر کہنیاں ٹیک ٹیک کر اور بوکو پھونس سے لپٹ لپٹ کر اوپر آئی ہیں، ان کے ہرے ہرے پتے اور زرد زرد پھول، باد صموم کے جھونکوں سے اٹھکیلیاں کر رہے ہیں لیکن کھیت والے دریا کے کنارے ڈھکیلیاں، اور برو ھے چلا رہے ہیں کہیں تیز تیزی فضائے آسمان میں ٹک ٹک کہتی ہوئی نہایت بے قراری سے بول رہی ہو کہیں کلکلا دریا پر ہوا میں ایک جگہ پھر رہا ہے، اور جب کوئی مچھلی نظر آتی ہے تو پانی میں ڈوب کر پھر بولتا ہوا، ہوا میں چکر لگا کر پھر کسی دوسری جگہ پانی پر قائم ہو جاتا ہے، کہیں کنڑاڑے کے نیچے سرخاب کو جوڑا بول رہا ہے، کہیں دور تا ضمیں کسی کھیت میں اتری ہوئی ہیں، کسی جگہ دریا اترنے کی وجہ سے نالا پونکل آیا ہے تو وہاں لوہا، سارنگ اور مرغابیاں، بگلے، بیٹھے کریال کر رہے ہیں، کہیں دریا کے بیچ میں جو کسی بڑی مچھلی نے اُبال کیا ہے تو اُس سے حلقہ دار موجیں یعنی مرکز اضطراری پیدا ہوا ہے اور بہاؤ کی طرف جانے والی موجوں سے لڑ کر بروئے آب آفتاب کی ترچھی شعاعوں کے پڑنے سے سنہری، روپہلی، ماہی پشت کا جال بن بن کر مٹتا ہوا نظر آجاتا ہے، دور کنارے پر دھوبی چھوا چھو کر رہے ہیں، تانوں پر کپڑے لٹکے ہوئے سوکھ رہے ہیں، ایک طرف لال قلعہ

بادشاہی، جھروکے کے دیوان خاص اور رنگ محل جو سنگ مرمر سے بنا ہے نور کا قبہ نظر آتا ہے، اور مثمن برج اور محلات شاہی اور عمارتوں کا عکس محل نظر پر دریا کی لہروں میں لہرا لہرا کر گھٹتا بڑھتا نظر آتا ہے، کہیں دور تک اس دریا میں کوئی بگولہ چکراتا ہوا جا رہا ہے اور میاں مولا بخش کو فیل بان جمنا میں نہلا رہا ہے کہ مولا بخش کے نہانے کی خبر نواب صاحب کے ایک سپاہی نے جا کر دی کہ سرکار مولا بخش اس وقت نہا رہا ہے اور اچھا موقع ہے۔ نواب صاحب نے اُسی وقت اپنے فیل بان کو حکم دیا کہ تو جلد جا چناں چہ یہ روانہ ہوا، جب دریا کے قریب پہنچا تو مولا بخش کے چرکٹے نے آواز دی کہ میاں کھنا کو ہٹا لو لیکن یہ فیل بان نواب صاحب کا آیا اسی واسطے ہے، یہ کب سنتا تھا چناں چہ اس نے کھنا کو دریا میں ڈال دیا، مولا بخش کا منہ دوسرے کنارے کی طرف تھا، کھنا نے جاتے ہی مولا بخش کے پیٹ پر ایک ٹکر دی کہ مولا بخش آگے رل گیا، کھنا نے دوسری ٹکر اور دی مولا بخش اس ٹکر میں ذرا آڑا ہوا، تیسری ٹکر کھنا دینے نہ پایا تھا کہ مولا بخش سامنے ہو گیا اور تین ٹکریں اور ہوئیں کہ کھنا ذرا دبا، پیچھے ہٹا اور مولا بخش باہر آیا اور اب کنارے پر آ کر جو مولا بخش نے ایک ٹکر لگائی تو دریا کا کنارہ گونج گیا اور کھنا بھاگا، آگے آگے کھنا اور پیچھے پیچھے مولا بخش شہر کے اندر آیا، بازار میں بھگو مچ گیا۔ دہلی والے کسی کی جوتی سڑک پر، کسی کی ٹوپی رہ گئی، دکان داروں نے کواڑ دکانوں کے بند کرنے شروع کر دیے اور مولا بخش کے پیچھے لڑکوں کی فوج، کچھ میاں کے یار آوازے دیتے، ہاں بیٹا مولا بخش لے اس کھنا کو غرض کھنا کہاں جاتا اپنے تھان میں آ گیا، اب مولا بخش نے اس کو مارنا شروع کیا تھوڑے عرصے میں اُس کا فیل بان آیا اور آواز دی مولا بخش تو بڑا بہادر ہے لیکن مولا بخش غصے میں کب سنتے تھے، غرض بادشاہ سے عرض ہوئی کہ حضور مولا بخش کھنا کو مار رہا ہے اور کسی کی نہیں سنتا، بہادر شاہ نے ہوادار منگایا اور سوار ہو کر خود تشریف لائے اور مولا بخش کو خود حضور نے آواز دی بیٹا بس، یہ آواز سن کر مولا بخش تھان سے باہر آیا، بادشاہ نے اپنے ہاتھ پر رومال رکھ کر ہاتھ آگے بڑھایا اور مولا بخش نے بادشاہ کے ہاتھ پر سونڈ رکھ دی اور آنکھوں سے مولا بخش کے آنسو جاری تھے۔ بادشاہ اس کی سونڈ کو ہاتھ میں لیے ہوئے مولا بخش کے تھان میں آئے اور مولا بخش کو باندھ دیا، مولا بخش کے یہ واقعات جن شاہزادوں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے تھے وہ میں نے لکھے ہیں۔

میرزا دلیر شاہ عرف میرزا ابلاقی صاحب کے ہاں میں داستان کہا کرتا تھا اور تمام شاہزادے عجیب عجیب واقعات بیان کرتے تھے، اگر ان کو لکھا جائے تو دفتر بھی کم ہے، ایک روز میرزا دلیر شاہ صاحب نے فرمایا کہ غدر سے پہلے میں اکثر فیل خانے میں جایا کرتا تھا، فیل خانے میں ایک ستون کاٹ کا تھا جس پر سیندور، سید صاحب نے لگا رکھا تھا، صاحب عالم نے فرمایا کہ جو عورت فیل خانے میں آئی اور اس نے اتفاق سے ہاتھ اس پر رکھ دیا، سید صاحب نے جب تک حکم نہ دیا وہ فیل خانے سے باہر نہ گئی، وہ فرماتے تھے کہ سید صاحب کچھ سحر بھی جانتے تھے۔

اکبر شاہ صاحب کا انتقال ہوا اور بہادر شاہ تخت پر بیٹھے، پہلی عید کی سواری آئی بہادر شاہ نے ایک ہاتھی کھنا

پالا تھا، یہ بھی بڑا شاندار ہاتھی تھا، بہادر شاہ نے حکم دیا کہ کل گھنا پر عماری کسی جائے، زمانہ شاہی کی عید، رات کے دو بجے سے قلعے میں دھوم شروع ہوئی، جب صبح قریب ہوئی تو اس وقت کا سماں، بہادر شاہ کی پہلی عید وہ صبح کا ہونا، زہرہ کا جھلکنا، ستاروں کا ڈوبنا، مشرق کی طرف عمود سحری نمود، شبنم سے بھیگا ہوا گرد و غبار، دھلا ہوا آسمان اور وہ ہوا پرانی سی نوبت کی دھن، شہنا کی آوازیں وردی، نوازوں کے باجوں کا شور، گھڑیالوں کے گجر، دیوان خاص کے آگے تنگیرہ کا ہوا سے جھومنا، بھیرا پلٹن کا آنا، اگریٰ پلٹن کا گزرنا، ایک طرف سانڈنی سوار شتری، بانانی دگلے گلوں میں پہنے، سرمئی پٹیاں تلہ دار سروں پر، ڈاڑھیاں، رخساروں پر رخ کے پیچ میں کھبہ دار پشتوں پر، نیچے زیب کمر، گھٹنے سفید، موزے سیاہ پاؤں میں، ایک ہاتھ میں مہار دوسرے میں تازیانہ سانڈنیوں کی گردنیں گودوں میں لیے سانڈنیاں بل کرتے جن کے گلوں میں گھونگرو، جھانجن، سرخ قند کے رومالوں سے زانوؤں پر رکے، دوہری کاٹھیاں پشتوں پر جن پر حاشیہ، بانات سبز کی زریں بیل اور ترنجوں سے درست کاٹھیوں پر پڑے، ایک طرف چوراسی گھنے دار جھولتی قرزیاں جن پر سنہرے، روپہلے جھلے چڑھے، سانڈنیوں کی دمیں قراریوں سے باندھے، دو دو سوار (جھم جھم) کرتے دیوان عام کے آگے سے گزرے اور آگے سانڈنی سواروں کے ان کا افسر بلند سانڈنیہ پر سوار مندیل مغرق سر پر باندھے، گلے میں زریں وردی پہنے، ہاتھ میں مہار، سانڈنیوں کے بعد سواروں کا رسالہ، آگے آگے ان کا رسالدار نواب مرزا سر پر خود، زرہ گلے میں، چار آئینہ پہنے، دستانہ فولاد کا مرقع، کاندھے پر، تلوار صیقل اور مصقل سے نہایت آبدار عریاں لیے لگام مرکب بائیں ہاتھ میں سپر دامن گرداں پشت پر چکلا سینہ بازوؤں کی مچھلی پٹی ہوئی، کمر پتلی، گردن تیار، ڈرا دھاجے حاہوا، مشکی گھوڑے پر سوار جس کی چھوٹی کنوتیاں، ٹیلی بیٹھی آنکھیں ابلی ہوئی، نتھنے پھیلے ہوئے، تھوتھنی غنچہ سی، گردن... مور کی سی، سینہ چکلا، ایال کے بال باریک اور پتلی جلد، باریک رواں، چھوٹا اور نرم، پیٹھ چھوٹی، پیٹ بڑا، کمر پتلی، ساغر چوڑی، ٹانگیں چھوٹی سم بڑے، انگریز بھونری کو نہیں مانتے، یہ سچ ہے کہ بھونری کیا چیز ہے لیکن ہزار گھوڑوں سے غیر طبعی ہے اس وجہ سے ہندوستانی بھونری کو عیب میں داخل کرتے ہیں۔ اس سردار کے پیچھے ایک رسالہ جن کے گھوڑوں کی یک رنگ چوکڑیاں، جن پر سواران جرار، نیزہ ہاتھوں میں لیے سنانیں چمکتیں، پھریریں دو رنگی، ہوا سے لہراتی، ان کے عقب میں چوبدار، مردھے، پیادے چکردار پگڑیاں، جن پر سنہری چمک اور لیس لگی ہوئی، گلوں میں سرخ بانانی دگلے، برکے پاجامے سفید پاؤں میں زردوزی جوتا، عصا چاندی کے جن پر سنہری آڑی بیل بنی ہوئی، بچتے ہوئے تو جزاؤ کاندھوں پر دوہرے گزرے، اب شاہزادوں کی نالکیاں پالکیاں، بوچہ، ہوادار اور تن جام آنے شروع ہوئے، اس وقت کا ہجوم عید کی خوشی، چہروں سے ٹپکی پڑتی تھی، ہر شخص لباس فاخرہ پہنے، کوئی اپنے بچے کی انگلی پکڑے، ایک طرف شاہی ہوادار، کہار وردیاں پہنے کاندھوں پر دوہرے استادہ نقار خانے سے نوبت جھڑ رہی ہے، دہلی کی عید غدر سے پہلے اور آج کل کی میں

نے لکھی ہے، جن صاحب کو شوق ہو وہ درویش پریس سے طلب فرمائیں، بہادر شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں ایک گھنا ہاتھی پالا تھا جو نہایت بلند اور خوبصورت تھا، بہادر شاہ نے حکم دیا کہ مولا بخش اب بڈھا ہو گیا ہے، عماری گھنا پر کسو، چناں چہ گھنا کمال شان سے آیا کہ بھونڈا اسیندور اور سبزہ زرد و سیاہ رنگ سے نہایت خوبصورت منقش جھول تاباشنا لگی جس کی کلابتونی جھالر حرکت کرتی ہوئی ریشم اور منقش کی ڈوریوں میں سریلے گھنٹے دونوں جانب آویزاں جن کی سریلی جھنکار ہوا کی لہروں میں دور تک جاتی تھی اور جو لوگ دور تھے ان کو آگاہ کرتی تھی کہ حضور کی سواری آ گئی، جب سید صاحب کو حسب معمول حکم نہ آیا کہ مولا بخش کو تیار کرو تو یہ خود دیوان عام کے پاس گئے، اور کہا کہ حضور کا حکم ہے کہ مولا بخش بڈھا ہو گیا ہے، آج کی سواری گھنا پر ہوگی، سید صاحب کو ہر سواری کا انعام ملتا تھا، یہ سن کر سید صاحب مولا بخش کے پاس آئے اور اس کے آگے بیٹھ کر اپنا سر پکڑ لیا اور کہا کہ بیٹا مولا بخش آج سے ہم بھی بڈھے ہو گئے اور تو بھی بڈھا ہو گیا، گھنا پر حضور سوار ہوں گے، تھوڑی دیر تو مولا بخش نے انتظار کیا پھر جب دیکھا کہ سواری کا وقت گزر چلا تو اس نے پاؤں کی زنجیر توڑی اور آہستہ آہستہ دیوان عام کی طرف چلا، جب گھنا کے قریب آیا تو اس کے اوپر جو عماری کسی ہوئی تھی اس میں اس نے ہاتھ ڈال دیا اور گھنا نے مولا بخش کو مارنا شروع کیا لیکن مولا بخش مکھنے سے چنگھاڑا اور کچھ جواب گھنا کو نہ دیا، اب ہر چند دونوں مہاوتوں نے چاہا کہ ان دونوں کو آپس سے جدا کریں لیکن ان سیاہ دیوؤں کو کون سمجھائے، یہ خبر بادشاہ کو ہوئی، بادشاہ خود تشریف لائے اور مولا بخش سے کہا کہ بیٹا میں تجھ ہی پر سواری لوں گا چھوڑ دے، یہ سن کر مولا بخش نے چھوڑ دیا اور اپنے فیل بان کے ہمراہ فیل خانے میں آیا، یہاں گھنا کا مزاج بگڑ گیا تھا، یہ کس کی سنتے اور عماری کھولنے دیتے تھے، غرض بہ ہزار خرابی گھنا پر سے عماری کھولی گئی اور مولا بخش پر کسی گئی اس روز نماز ایک بجے دن کے ہوئی۔ ایک روز بہادر شاہ بادشاہ ہوادار پر سوار چلے جاتے تھے کہ ایک جگہ دلی کے کچھ لڑکے کھیل رہے تھے لیکن یہ بچے ایسے تھے کہ کوئی ان میں ہوشیار نہ تھا، پانچ پانچ سات سات برس سے زیادہ نہ تھے، ایک نے ان لڑکوں میں سے بادشاہ کو سلام کیا بادشاہ نے ہوادار پر تھپکی ماری، کہار فوراً ٹھہر گئے، ایک بچے نے پوچھا تم کیسے ہو بادشاہ نے جواب دیا کہ جب سے میں تم سے جدا ہو گیا ہوں، سخت بے چین رہتا ہوں، ایک اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ایک مہتال پیشب کی بادشاہ کے حضور میں پیش کی اور عرض کی کہ حضور اس کا کیسا اچھا موتیا رنگ ہے اور سنگ اچھا ہے، بادشاہ نے فرمایا کہ ہاں اچھا ہے، حکیم صاحب نے پھر عرض کی کہ ملاحظہ ہو، بادشاہ نے فرمایا کہ کل، چناں چہ دوسرے روز جب حکیم صاحب تشریف دربار میں لے گئے تو بادشاہ اٹھ کر محل میں تشریف لے گئے اور کامل دو گھنٹے کے بعد باہر تشریف لائے تو ہاتھوں پر کچھ گرد تھی اور پیچھے دو اژدہا کنیاں سروں پر دو ٹوکرے رکھے ہوئے لائیں، مجھ سے خود حکیم صاحب فرماتے تھے کہ وہ دونوں ٹوکرے مہتالوں سے بھرے ہوئے تھے، کوئی مہتال زمرد کی، کوئی یاقوت کی، کوئی نیلم کی ہے تو کوئی

پکھراج کی غرض بلور کی، ایک بھی سنبھال نہ تھی، میں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور دل میں نہایت شرمندہ ہوا ایک روز بادشاہ ہوادار پر سوار ہیں اور ہاتھ ہوادار کے کنارے پر ہے، ہاتھ میں بادشاہ کے ہیرے کی انگوٹھی تھی، ایک چور دوڑے، گھونگرو والا قریب آیا اور انگوٹھی اتارنی شروع کی اور اتنی قوت کی... کہ بادشاہ کی انگلی اتر گئی، اس وقت بادشاہ نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا بھائی تیری قسمت کی نہیں ہے۔

میرزا فخرو، ولی عہد کے پاس ایک استاد مراد آباد کے رہنے والے جو نہایت اچھی جنوٹ جانتے تھے آئے! میرزا فخرو بہت خوش ہوئے اور کچھ انعام بھی دیا، استاد نے کہا کہ صاحب عالم بہادر میرا چہرہ دفتر شاہی میں چڑھا دیجیے، میرزا فخرو نے وعدہ کیا اور بادشاہ کے پاس لے گئے، استاد کی تعریف کی، بادشاہ نے بھی پسند کیا، اس وقت میرزا فخرو نے عرض کی کہ حضور استاد چاہتے ہیں کہ سلسلہ بندگان عالی میں منسلک فرمایا جائے، بادشاہ نے فرمایا کہ اس وقت کوئی جائیداد خالی نہیں، ایک جونک والی، جونک چونکہ خود کثیف ہے اس وجہ سے کثیف خون چوستی ہے اور یہ ایجاد ہندوستان کی ہے، جونک والی مرگئی تھی اور اس کے اٹھارہ روپے ماہوار تھے، ہر چند تلاش کیا کہ کوئی اس کا وارث ہو تو یہ تنخواہ اس کے نام ہو جائے لیکن کوئی نہ ملا۔

میرزا فخرو نے عرض کی کہ حضور جونک والی کی جائیداد خالی ہے، بادشاہ نے فرمایا کہ روے بھئی اماں اگر کوئی اس کا وارث آ گیا تو میں اس کو کیا جواب دوں گا، میرزا فخرو چپ ہو گئے اور چھ مہینے کے بعد انھیں استاد سے عرضی دلوادی کہ جونک والی میری نانی تھی جس وقت عرضی حضور میں پیش ہوئی تو میرزا فخرو بھی حاضر تھے، بادشاہ نے استاد کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی تم کہاں تھے، تمھیں یہ بھی خیال نہیں کہ میرا کوئی مرتا جیتا تنخواہ لیے بیٹھا ہے، جاؤ اور خزانے سے تنخواہ لو اور میرزا فخرو کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ میاں اگر تمھارے کہنے میں آ کر تنخواہ کر دیتا تو میں اس وقت اس کو کیا جواب دیتا۔

غدر کے زمانے میں بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں تشریف رکھتے تھے اور کھانا کئی وقت سے میسر نہ آیا تھا، کئی وقت کے بعد کچھ کھچڑی بادشاہ کے سامنے آئی تو بادشاہ نے کہا کہ میں نہیں کھاتا، حکیم صاحب اور میرزا الٰہی بخش نے عرض کی کہ حضور کیوں نہیں نوش فرماتے، بادشاہ نے جواب دیا کہ میرے بچے بھوکے ہیں، میں کس طرح کھالوں اس وقت حکیم صاحب نے باقی لوگوں کو بلوایا اور بادشاہ خود چبوترے کے کٹہرے کے قریب آئے، حکیم صاحب نے فرمایا کہ تم سب قسم کھاؤ کہ کھانا تم سب نے کھایا یا نہیں، جب سب نے قسم کھائی کہ ہم سب کھا چکے تو بادشاہ نے کھچڑی نوش کی۔

جس روز بادشاہ گرفتار ہوئے تو مولا بخش مست ہو گیا اور اپنے فیل بان کو بھی سواری نہیں دی، اول تو سوائے حضور کے کسی کو سواری ہی نہیں دی لیکن بادشاہ کی گرفتاری کے بعد بھوکا پیاسا، ہر وقت آنکھوں سے آنسو

جاری، ایک سید صاحب اس وقت زندہ ہیں، انھوں نے بچشم خود دیکھا ہے، غرض فیروز شاہ کا کوٹلہ جو دلی دروازے سے قریب ایک فرلانگ یا ڈیڑھ فرلانگ کے ہے اس میں جا کر مر گیا، میں نے اپنی آنکھ سے مولا بخش کا کلہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی کی منڈیر پر رکھا ہوا دیکھا ہے۔

..................☆☆☆..................

اخلاق کی کمی سے آج کل ہندوستان میں وہ برا اثر پڑا ہے کہ جس سے آبرو تو در کنار زندگی دشوار ہے۔ اخلاق ہی سے آدمی! آدمی کہلانے کا مستحق ہے ورنہ جینے کو تو جانور بھی جیتے ہیں۔ داستان نے رواج شاہان مغلیہ کے عہد میں کیوں پایا اس کی وجہ یہ تھی کہ لائق داستان گو قصے کے تحت میں ہر طرح کی معلومات اور علوم کے مسئلے بیان کرتے تھے اور ان قصوں کو ایسے دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے تھے کہ چھوٹے بڑے سب نہایت دلچسپی سے سنتے اور یاد رکھتے تھے۔ آج کل مجھ جیسے داستان گوؤں نے اپنی نامعقولیت سے ایسے مخرب الاخلاق مضامین بیان کرنے شروع کیے کہ جس کی وجہ سے اس شریف اور لطیف فن پر بری نگاہیں پڑنے لگیں۔ میں دلی میں ایسا داستان گو ہوں کہ جہاں روکھی نہیں وہاں ارنڈ روکھ غنیمت ہوتا ہے لیکن مجھے فخر ہے کہ مجھ کو علی گڑھ کالج نے بلانے کی عزت بخشی اور جب میں بیان کر چکا تو نواب محمد اسحاق خاں صاحب موصوف نے تمام علما اور طالب علموں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگوں نے سنا کہ تمھارے ملک کا کیسا شریف اور مفید فن ہے، اب تم کو مناسب ہے کہ جس طرح میر صاحب نے بیان کیا تھا تم بھی کوشش کرو اور اسی طرح سے اپنے بیان میں قوت پیدا کرو علاوہ اس کے دلی کی کمیٹی نے دو دفعہ مجھے لاٹ صاحب کے سامنے پیش کیا اور لاٹ صاحب نے چیرز سے تعریف فرما کر عزت بخشی علاوہ ریاست فریدکوٹ نے اپنی شادی کے موقعے پر مجھے یاد فرما کر لاٹ صاحب کے سامنے پیش کیا تو اب سمجھ لیں کہ قصہ اور داستان کیا شے ہے اور اس کے سننے سے کیا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

باتوں کی باتیں

میر باقر علی

دیباچہ

رات دن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے تمام امورِ زندگی اور کام کاج کے بگڑنے اور سنورنے میں بولنے اور بات کرنے ہی کو بڑا دخل ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے روح کو بدن کے ساتھ جب انسان میں کوئی مرض یا کسی طرح کی کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو یہی روح جوہر رب اور شیخ کے قول کے موافق بلاشعور مدبر بدن ہے۔ یہ ہر وقت مرض کا اس طرح مقابلہ کرتی رہتی ہے جیسے سورج کے ساتھ دن اور دن کے ساتھ سورج کہ جہاں دن وہاں سورج، جہاں سورج وہاں دن۔ سورج اور دن بالقوہ ایک آن کے واسطے آپس میں دونوں ایک سے ایک الگ نہیں ہوتے۔ یہی مثال ہمارے معاملات اور کاموں کے ساتھ بولنے اور بات کرنے کی ہے۔ روح بگڑی تو بدن بگڑا اور زبان بگڑی تو الف سے یے تک ہماری زندگی کا ڈھچر بگڑ گیا۔ اے دلی والوں اور اردو کے جاننے والوں زندگی کی روح جو بول چال ہی پر موقوف ہے اب تو مہربانی کر کے زبان سنبھالو، ذرا تو غور کرو کہ ہماری بات بگڑی جاتی ہے۔ اگر بات بگڑ گئی تو پھر آدمیوں میں ہمارا شمار نہ ہوگا۔ بولنا تو جانور بھی جانتا ہے لیکن ترکیب اور تفصیل نہیں جانتا تو کیا بات کرنے سے جانور کچھ اپنا کام نکال سکتا ہے اور اس کی سن کر اس پر کوئی عمل کرتا ہے۔

مجھے تو اپنے اوپر بار بار یہ افسوس آتا ہے کہ میں نے دنیا میں آ کر کچھ بھی نہیں کیا اور زمانے نے جو مجھے فرصت کا وقت دیا تھا اُس کا گھنٹہ بج گیا۔ بس اب بھی زبان نہ سنبھالی تو اس سے اور آگے ڈر ہے کہ زمانہ ہمیں مٹی کا تھوا بنا کر نہ رکھ دے اور ہم کسی کام کے نہ رہیں۔ دیکھو اب بھی خیال کرو اور کچھ کرو ایسا نہ ہو کہ زمانہ آگے چل کر ہم سے پہلو تہی کرے اور بیلوں اور گدھوں کے سے کام لیے جائیں اور سوائے بوجھ اٹھانے اور گاڑیاں کھینچنے یا ہل چلانے کے کسی اور کام کے قابل نہ رہیں۔ ابھی تک بھی اگر سنبھل جائیں تو ہمارا بگڑا ہی کیا ہے۔ ہاں اتنا تو ضرور ہو

گیا ہے سو وہ بھی ہماری غفلت سے کہ غیر زبانیں جا اور بے جا اردو میں اپنا دخل دے کر کچھ کام کرنے لگیں ہیں اور وہ اس طرح سے کہ ایک صاحب رستے میں مجھ سے ملے، نہ تو اسلام کے طریقے پر انھوں نے زبان سے سلام وعلیکم ہی کہا اور نہ انگریزی طریقے پر سر سے ٹوپی اتار سکے کہ ململ کی دوپلڑی ٹوپی منڈے ہوئے سر پر گھسی ہوئی اور منڈھی ہوئی تھی اور چھوٹے چھوٹے بال ململ کے خانوں سے باہر نکل کر جلد کا کام دے رہے تھے۔ فرمایا ہا میر صاحب (ہو ہاؤ ڈو یو ڈو) میں نے جواب دیا کہ خدا کا شکر ہے لیکن آج کل زندگی کا مزا نہیں تو جواب میں فرمایا ہاں میر صاحب دنیا کا ٹیسٹ ہی بدل گیا ہے۔ اے بھائی جب اس کم سن مفلس بے سری اور محتاج اردو میں مزے اور لذت کے واسطے، ہر موقعے اور محل کے واسطے اتنے لفظ تو مجھے یاد ہیں۔ مثلاً کھانا نوش فرمانا، نوش جان کرنا، چکھنا، ملاحظہ کرنا، ذرا سا دیکھو تو سہی کہ اس کا مزہ کیسا ہے۔ نگلنا، انتی سار کرنا، حلوہ بھکتی کرنا، ٹھورنا، زہر مار کرنا، ٹھونسنا، چیریاں کتاری ڈالنا، سوز کرنا، مزہ لینا، چکھو تو ذرا سا، دیکھو تو سہی، زبان ہی پر رکھو، بطور چٹنی ہی سہی، اس کی لذت تو دیکھو، چکھ کر بتاؤ، ذرا سا مزا تو لو، زبان پر رکھو تو سہی، کھانا نہیں تھوک ہی دینا۔ اے یاروں جب ہر جگہ کے واسطے اتنے لفظ موجود ہوں اور مزا یہ ہے کہ ہم اچھی طرح سے ان کے برتنے کا محل اور غیر محل بھی جانتے ہوں اور پھر بلا ضرورت اپنی زبان مادری کا خون کریں۔ بھائی یہ زبان ہے زبان ذرا تو سنبھال کر بولو۔ بگڑی ہوئی زبان کی کوئی بات تنگ سخنی گوارا نہیں کرتا ذرا تو سوچ لو کہ ہم کو کیا کہنا ہے۔ اپنی تو تم جانو لیکن زبان تو سب ہی کی ہے اس طرح سے تو ناحق گنڈ منڈ نہ کرو ہاں یہ اختیار ہے اردو بولتے ہو تو اردو بولو اور انگریزی بولتے ہو تو کیا مضائقہ ہے اچھا انگریزی ہی سہی۔ یہ کیا کہ مثل مشہور ہے کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ اتنا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ زبان میں خلط ملط وہ صاحب کرتے ہیں جن کو احساس ہی نہیں کہ ہم کرتے کیا ہیں۔ اچھا غیر زبان کا جاننا حسن ہے عیب نہیں لیکن اتنا تو خیال رکھو انگریزی بولتے ہو تو بولو اور اردو بات کرتے ہو تو اردو ہی سہی لیکن ایسی انگل بچو زبان جو سنے گا منہ سے نہ کہے لیکن دل میں تو اس کو خیال آئے گا کہ یہ صاحب یا تو انگریزی اچھی طرح سے جانتے ہی نہیں یا یہ اردو میں کورے ہیں۔ ناحق اپنی زبان مادری کو کیوں کلنک لگاتے ہو، یہ کیا کہ جو سمجھ میں آیا الٹا سیدھا دے مارا اور پھر سے بول اوٹھے ہاں یہ بات میں نے اکثر بنگالیوں میں دیکھی ہے وہ غیر زبان کے کیسے ہی عالم کیوں نہ ہوں لیکن آپس میں جب بات چیت کرتے ہیں تو زبان بنگلہ ہی میں بات کرتے ہیں کیوں کہ جو تازگی روح کو اور لگاؤ زبان مادری سے ہوتا ہے ایسی فرحت اور انبساط دوسری زبان میں نہیں۔ دلی والوں آپ دور کیوں جائیں پنجابی صاحبان کو دیکھ لیجیے کہ وہ آپس میں جب بات چیت کرتے ہیں تو پنجابی ہی بول کر خوش ہوتے ہیں۔ (گو پنجابی زبان مستقل زبان نہیں ہے بلکہ اردو سے نہایت قریب کی بچکیا ہے۔) ہاں بے شک یہ بھی ہمیں ماننا پڑے گا کہ اردو میں ابھی کافی لفظ نہیں جو آج کل کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں جیسے اسٹیشن کہ اردو میں اس کے واسطے کوئی نام نہیں یا جنگ شن۔ ہاں اگر ہم تلاش کریں تو

جنکشن کے واسطے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دہلی ریلوں کا بڑا مرکز ہے اور اسٹیشن کے واسطے پڑاؤ اتارا۔ موقف غرض اور بہت سے لفظ ہو سکتے ہیں نہیں ہیں تو بناؤ۔ دنیا میں دلی والوں اردو زبان تو تمہاری ہر وقت کی خادم اور تمہارے ہاتھ کا بھانڈا ہے اس کو تو صاف کرو جو بھرا تو ہو گیا اب اگر یہی ہماری غفلت ہے تو آگے چل کر ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ نظر آتا ہے کہ ہم ہر کام کے واسطے ایک ایک کا منہ دیکھیں گے۔ الٹا سید ھا جو وہ بتادیں گے ویسا ہی کرنا پڑے گا۔ میرے شہر والوں تمہارے ہر کام میں کامیابی زیادہ تر اردو ہی سیکھنے اور جاننے پر موقوف ہے۔ اس وقت تم غیر زبانوں کے پیچھے پڑ کر کیوں اپنی مٹی خراب کرتے ہو اور از سر تو کورے بنتے ہو۔ علم پڑھو محنت کرو دنیا میں آئے ہو۔ زمانہ بھتا چلا جاتا ہے اور ہم اتنے پیچھے رہ گئے ہیں کہ دنیا کی منزل طے کرنے والوں تک اب ہماری آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اچھا صرف زبان کی درستی میں تو تمہارا کسی طرح کا ذرا سا بھی حرج نہیں۔ ہاتھوں سے کام کرو، پاؤں سے چلو، آنکھوں سے دیکھو، زبان درست کرو کیوں کہ زبان درست کرنے میں تو اور کوئی عضو بھی معطل نہیں ہوتا۔ کوری زبان ہی کو حرکت ہے اور زبان کی طرف غور نہ کرنے سے ذرا یہ تو غور کرو کہ ہم پر کیا گزری اور کیا کا کیا ہو گیا۔ بھائی پہلے علم ہی کو لو کہ علم ہی دنیا میں نہایت ضروری اور ہمارے تمام کاموں کا وکیل ہے۔ غیر سلطنت آئی تو اس نے دیکھا کہ یہاں تو جہل ہی جہل ہے اس وجہ سے پہلے زبان سکھائی اور واقعی انصاف یہ ہے کہ سلطنت کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ ہماری اردو زبان سیکھتی اور پھر ہم کو کچھ بتاتی اور کیوں ایسا کرتی کہ نہایت اوچھی اور تنگی زبان اور کم مایہ۔ یہ سچ ہے کہ اردو کو آج آئے ہوئے اللہ رکھے دنیا میں کے دن ہوئے ہیں۔ اس کی تو وہ مثل ہے کہ کے آدمی و کے پیر شدی اور اس پر جس ملک کی زبان تھی اس ملک کے مجھ جیسے کم ہمتوں نے سوائے دنیا میں سونے اور اینڈنے اور ڈھنڈورے بجانے کے کیا ہی کیا ہے۔ زمانہ تو نہایت عادل ہے یہ تو محنت کرنے والے کو ٹھونک بجا کر مزدوری دیتا ہے۔ ہم نے نہ محنت کی نہ زمانے نے ہم کو کچھ دیا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ زبان بھولنے سے ہم پر کیا مصیبتیں پڑیں۔ اول تو ہم گرم ملک کے رہنے والے جذب کی وجہ سے عمر میں کم اب ذرا خط استوا کی رہنے والی عورت کو دیکھیے کہ یہاں کی عورت نو اور دس برس کی عمر میں جوان ہو جاتی ہے اور ٹھنڈے ملک کی عورت بائیس برس میں جوان ہوتی ہے اور قدرت کا اٹل قانون یوں مقرر ہے کہ ہر ذی روح اس میں کوئی ہو جتنا اس کی نمو کا یعنی بڑھنے کا زمانہ ہو گا تو اس زمانے سے سہ چند اس کی عمر طبعی ہو گی مثلاً بیل تین برس میں جوان ہوتا ہے تو تین چھے نو دس برس کا بیل بڈھا ہو گیا۔ گھوڑا پانچ برس میں جوان ہوتا ہے تو پانچ چھے پندرہ بیس برس کا گھوڑا کیا کسی کام کا ہو گا۔ سارا جھگڑا چھوڑیے اب آدمی کو لیجیے جو حضرت دنیا کے موضوع ہیں۔ میں تو ہندوستان اور خاص دلی والوں ہی سے بحث کروں گا یہاں کے رہنے والے کا اٹھائیس یا تیس یا بتیس برس میں بڑھنے کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ اب آپ نوے برس والے سے ذرا بات کر دیکھیے کہ یہ حضرت اس زمانے میں کیا کہتے ہیں اور حضرتے حضرتے کیا جواب دیتے ہیں اور اس وقت کیسے مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ اب ہماری

زندگی تو یہ ٹھہری اور قدرت کا قانون اٹل اور تعلیم ضروری اور بعد تعلیم کے ہم دنیا میں آتے ہیں اور دنیا کے دھندے کرتے ہیں اور زندگی کا اچھا زمانہ کل دس برس (حضرت علی علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا کہ جناب آدمی کی زندگی کا زمانہ کتنا تو آپ نے فرمایا کہ دس برس اس نے عرض کی حضور مرے والد تو سو برس کے اب تک زندہ ہیں آپ نے فرمایا کہ بھائی آدمی ساٹھ برس تک کام کا رہتا ہے)

اب ساٹھ برس میں تیس برس تو سونے میں گزرے اب رہ گئے تیس، پندرہ برس ایسے گزرے کہ ہم کو آپے کی بھی خبر نہ تھی تو پندرہ باقی رہے، پندرہ میں سے پانچ برس مرض کے سمجھ لو تو دس برس باقی رہے اور انگریزی زبان پندرہ برس میں مشکل سے وہ بھی اتنی آتی ہے کہ اچھی طرح سے بول چال لیں اور اس عرصے میں ہم کوئی تخیل کریں گے تو مادری ہی زبان میں کر سکتے ہیں کیوں کہ انگریزی زبان تو علمی زبان ہے۔ کیا سہل بات ہے کہ انگریزی زبان والے جتنا کام کر چکے ہیں اور رستہ طے کر چکے ہیں ہم نکلے ان کے برابر۔ ہلدی کی گرہ ہاتھ آنے سے پنساری کا دعویٰ کر بیٹھیں غلط اور کس قدر غلط ہاں ہم کو اگر دنیا میں کچھ حاصل کرنا ہے تو پہلے اپنی مادری اردو کو درست کریں اور اردو میں تعلیم لیں تاکہ جس وقت سے ہم کو صرف حرف ملانے آجائیں تو اسی وقت سے کچھ سلسلہ علم کا شروع ہو جائے اور ہم کچھ بن نکلیں ورنہ ہماری تو وہ مصداق ہوگی ہے کہ شعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

میں نے اپنے خیال کے موافق اپنے دِتی والوں اور اردو جاننے والوں کو مشورہ دیا ہے کہ دیکھو یہ میدان ہمارے واسطے بہت قریب اور بڑا وسیع اور پر بہار ہے۔ تم اور دلچسپیاں چھوڑ کر ذرا یہاں کی بھی بہار دیکھو۔ بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔

اللہ برحق محمدؐ بیشک

ہماری زندگی باتیں ہی کرنے پر موقوف ہے کیوں کہ؟ انسان بالطبع محتاج ہے حرکت، سکون، ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان، عیش و آرام کا اور ان تمام باتوں کا اظہار باتوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ اب اچھا بولنے والا اپنی بات منوا لیتا ہے اور بڑے بڑے قائل منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ زبان ہی امورِ زندگی کے واسطے نہایت ضروری ہے تو پھر کیسا افسوس ہے کہ ہم بات کرنے کا طریقہ نہ سیکھیں کہ کیوں کر بات کرتے ہیں اور بات کرنے میں کس کس بات کا خیال رکھیں۔ بات کرنے میں پہلی شرط یہ ہے کہ الفاظ کا ذخیرہ پاس ہو۔ پھر مخیلہ کو مطلق العنان چھوڑ دو بس پھر میدان تمھارے ہی ہاتھ ہے اور بات کرنے سے پہلے اپنے آپ کو بات کرنے کے قابل بنا

لو۔ اس کی ترکیب یہ ہے جو بات دل میں ہو اس کو ترتیب دے کر زبان سے نکالو۔ جو بات ہو غلطی سے پاک ہو، جو فقرہ ہو، جچا ہوا ہو، مرغوب ہو، آگے پیچھے نہ ہو، بے ساختہ ہو، جو بات ہو برمحل ہو، باتیں مطلب کے قالب میں ڈھلتی چلی جائیں اس پر اتنا بولو جتنی بولنے کی ضرورت ہو کیوں کہ کلام مجموعے کا نام ہے۔ بات کرنے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو کہ ہماری بات نیچی نہ ہو۔ اگر بات بگڑ گئی تو دنیا میں پھر جینا دشوار ہے اس لیے باتیں کرنے میں ان چار باتوں کا خیال رہے۔ اوّل تو جو لفظ تمھاری زبان سے نکلیں وہ ایسے ہوں کہ سننے والے کو سن کر ان لفظوں سے نفرت نہ ہو۔ دوسرے سخت اور بوجھل نہ ہوں، کوئی کلام میں قید نہ ہو۔ تیسرے صرفی نحوی قاعدے سے گرے ہوئے نہ ہوں اور لفظوں میں وزن نہ ہو، لہجہ نرم ہو، کلام میں بناوٹ نہ ہو۔ غرض مطلب صاف صاف کھل جائے جو لفظ زبان سے نکلیں تو جھجک نہ ہوں۔ وہ لفظ بولو جس کے معنی مشہور ہوں۔ کلام میں نسبت ہو تو حقیقی ہو، جو کچھ کہو سچ کہو اور سچ کے معنی یہ ہیں جو واقعے کے مطابق ہو خلاف واقعہ نہ ہو کہ ہو کچھ اور کہو کچھ۔ اس وجہ سے جو طریقے مجھے بھلے معلوم ہوئے اور میں دیکھتا ہوں کہ لوگ بھی پسند کرتے ہیں اور مفید بھی ہیں میں نے لکھ دیے کہ ہر شخص کے واسطے شاید بہتر ہوں۔ بولنا کوری زبان ہی کا نام نہیں بلکہ لفظوں کا اثر ٹھنڈا، گرم، معتدل غرض سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند باتیں پیش کرتا ہوں مثلاً جس شخص نے ارادہ کر کے اپنی عمر میں ایک بار بھی بدزبانی کی یا جھوٹ بولا اور گالی زبان سے نکالی تو پھر دماغ انسانی ایسا اکھل کھرا اور بے مروت عضو ہے کہ جب بھی دماغ پر کوئی دباؤ پڑتا ہے تو پھر دماغ صاحب دماغ کو جھوٹ بولنے یا گالی ہی دینے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ چند اشعار خوب ہیں۔ شعر:

بدزبانی کا برا انجام ہے — بدزباں انساں سدا بدنام ہے
آدمی کو بدزبانی ہے بری — یہ زباں ہے گوشت کی چلتی چھری
تیز چاقو اپنے منہ میں جو رکھے — پہلے وہ ہی زخم کی لذت چکھے
بدزباں کا پہلے خود نقصان ہے — پر وہ اس کے بھید سے انجان ہے
گر بدی پر زخم ہو تلوار کا — اچھا ہو جاوے اگر کیجیے دوا
پر جو گھاؤ ہو بری تقریر سے — وہ نہیں جاتا کسی تدبیر سے

غرض جس کو بات کرنی آ گئی وہ مستغنی ہے اور ٹھنڈی، گرم و معتدل کسی شے کی دنیا میں اس کو ضرورت نہیں، اس کے تمام کام اس کی مرضی کے موافق ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر ایک حکایت ہے اور کتنی سچی اور اچھی مثال ہے۔

حکایت:

ایک حکیم بوٹیوں کی تلاش میں، بوٹیوں کے مزاج، ان کے رنگ و بو سے اور مزے سے دریافت کرتا جنگل

پہاڑ گھومتا ایک روز ایک ایسے چٹیل میدان میں اس کا گزر ہوا کہ جہاں سنگلاخ زمین اور خشک و سیاہ پہاڑی ٹیکروں کی گرم چٹانیں اور کچھ نہیں، وہ گرمی کا موسم خدا کی پناہ، دوپہر کا وقت، دھوپ تیز، لو چلتی، ہوائے سراب کے پانی کا نام نایاب، ایک ایک لو کا طمانچہ عذاب دوزخ کا نمونہ، کملائے اور مرجھائے ہوئے پتے، خشک جھاڑیوں میں تھراتے درخت ہرا نام کو نہیں، ہرن اور چکارے پیاس کے مارے منہ کھولے خشک زبانیں نکالے ان ہی سوکھی جھاڑیوں میں لو سے منہ چھپائے ہانپ رہے ہیں، پتھر اور تالابوں میں بجائے پانی کے بھاپ نکلتی اور وہ جلتی ہوئی بالو کی ہوا سے لہردار آراستہ کیے ہوئے ٹیلے جن کا گرم ریت ہوا کی چھیڑ سے دریائے ریگ رواں نظر آتا ہے۔ گنبد فلک غبار آلود، پرندے پیاس سے پانی کی تلاش میں منڈلاتے۔ حکیم صاحب کو پیاس کی ایسی شدت کہ جس سے زندگی سے یاس اور اس چلچلاتی دھوپ میں طائر نظر بھی آشیانۂ جسم میں پھڑک رہا ہے۔ اسی اضطراب اور بے قراری میں اتفاق سے ایک ٹیکرے پر ایک چھوٹی سے سیاہ جھونپڑی نظر آئی جس کو دیکھ کر حکیم صاحب کی جان میں جان آئی۔ اس بے قراری میں خیال آیا کہ شاید یہاں کوئی ہو اور بوند پانی میسر آجائے تو اس وقت جان بچ جائے۔ غرض حکیم صاحب جوں توں کر کے بہ ہزار خرابی اس جھونپڑی کے پاس آئے تو دیکھا کہ ایک فقیر کوئی پچاس برس کا سن سانولا رنگ، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں بال سر پر الجھ کر پھول گئے ہیں، جڑوں میں بالوں کی میل کچیل اٹا ہوا، ننگے گلے بدن پر کپڑے کا تار تک نہیں صرف ایک میلی لنگوٹی وہ بھی پرانی اور چھوٹی بال کی تاگڑی میں اڑسی، اسباب دنیا سے جھونپڑی میں اللہ کا نام۔ ہاں پانی جو حرکت اور ہوا کے بعد سب سے بڑی نعمت اور روح کا ایندھن ہے، اس کا گھڑا کورا نہایت سوندھا ایک کونے میں دھرا۔ کوری زمین پر شاہ صاحب آسن مارے اللہ اللہ میں مصروف دنیا میں علاوہ نماز روزے کے تین عبادتیں اور بھی ہیں اور ان تینوں عبادتوں کو جو قضا کرے گا تو اس کی سزا موت ہوتا ہے وہ تینوں عبادتیں یہ ہیں۔

اول: عبادت نفس کہ نفس پاک وصاف اور ملکوتی ہو، دوسری عبادت خیال کہ خیالات نیک ہوں، تیسری عبادت بندگان خدا کی کہ یہ خوش ہو جائیں۔ زیادہ تشریح طول ہے سمجھدار خود ہی سمجھ لیں گے۔ اب حکیم صاحب جھونپڑی میں آئے شاہ صاحب پر نظر پڑی اور کونے میں کورا گھڑا پانی سے بھرا دیکھ کر جان میں جان آئی، روح تازہ ہوگئی۔ غذا تو غذائے بدن اور پانی غذائے روح ہے۔ غرض حکیم صاحب نے اندر جھونپڑی کے قدم رکھا ہی تھا کہ فقیر صاحب نے تعظیم دی اور بڑی گرم جوشی سے اور تپاک سے آؤ بھگت کی اور حکیم صاحب کو پیاسا دیکھ کر شاہ صاحب خود اٹھے اور کورے آبخورے کو پہلے پانی سے ٹھنڈا کیا کچھ ادھر اُدھر دیکھتے رہے اس ٹال سے غرض شاہ صاحب کی یہ تھی کہ ایسی شدید گرمی اور سخت محنت کے بعد کہ پسینہ بھی بدن پر بہہ رہا ہو یکایک ٹھنڈا پانی ڈگڈگا کر پی لیا جائے تو احتمال سخت نقصان کا ہے۔ شیخ کا قول ہے کہ پانی کو تیر سمجھ کر تیرے، اوپر آرہا ہے اسے بچ بچا کر اپنا کام

نکال۔ حدیث میں بھی یہی حکم ہے کہ تین دفعہ اور وہ بھی ٹھہر ٹھہر کر اپنی پیاس بجھاؤ اور ممکن ہو تو پانی چوس کر پی۔ آپ دور نہ جائیں جب چاہیں ڈگڈگا کر پانی پی کر دیکھیں تجربہ ہو جائے گا اور پانی ہی کیا کھانا جس کو ہم زندگی کا سبب سمجھے ہوئے ہیں ذرا ڈٹ کر کھا دیکھو، دیکھو بعد کھانے کے تفریح ہوتی ہے یا کیا اس طرح کھانے کے بعد تکلیف ہوگی اور جس کھانے یا پینے کے بعد طبیعت بے لطف ہو وہ کھانا بدن کا جز نہیں بنے گا۔

گو شاہ صاحب کی یہ حرکت اور دیر حکیم صاحب کو شاق تھی۔ یہ اتنی دیر زہر کے سے گھونٹ پیتے رہے۔ شاہ صاحب نے نہایت تساہل سے پھونک پھونک کر قدم دھرتے پانی لائے اور حکیم صاحب کو پانی دیا لیکن اتنا تھوڑا سا کہ حکیم صاحب کی پیاس نہ بجھی۔ حکیم صاحب نے پانی پی کر اور پانی مانگا شاہ صاحب نے دوبارہ پھر اتنا پانی دیا کہ جو لعنت بہ پیچ۔ حکیم صاحب کو کچھ تسکین ہوئی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بابا پانی اور حکیم صاحب نے فرمایا کہ ہاں تھوڑا سا اور غرض پانی پیا کچھ اوسان درست ہوئے، جان میں جان آئی۔ اس عرصے میں چند گنوار ایک جوان مریض کو لائے جس کا رنگ بدن سرخ، چہرہ تمتمایا ہوا، بخار کی وہ شدت کہ چھوتا تو ایک طرف پاس بیٹھنے والوں کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہم اس وقت دہکتی ہوئی بھٹی کے قریب ہیں۔ ان گنواروں نے جو مریض کو لائے تھے شاہ صاحب سے کہا شاہ جی اس کا بخار اتار دو یہ غریب ہے، مزدور ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا اچھا بابا اچھا یہ کہ کر شاہ صاحب نے قریب آ کر اللہ شافی اللہ کافی کہہ کر دم کیا سانس جو گھبرایا ہوا جلد جلد آ رہا تھا اسے تسکین ہوئی۔ پانچ منٹ میں کلبلایا اور آنکھیں کھول بھلا سا اٹھ بیٹھا اور اپنے بدن کی مٹی جھاڑتا ہوا چلا گیا۔

حکیم صاحب یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ یا اللہ یہ تشخیص اور ایسا سخت مرض نہ منضج نہ مسہل نہ تبرید، چٹ روٹی پٹ دال نہ مرض بڑھا نہ ٹھہرا نہ گھٹا۔ ہم مریض کو دوا پلاتے ہیں، دواؤں کے تجربے کرتے ہیں، نسخہ تجویز کرتے ہیں، دواؤں کو کوٹتے پیستے، جوش دیتے، چھانتے ہیں، بھگوتے ہیں، ملتے ہیں۔ شربت خمیرہ، لعوب جوارش اور دعا اور دوا سب ہی کچھ کرتے ہیں لیکن مریض کو آرام یقینی نہیں کہ مریض اچھا ہی ہو جائے گا اور مرض بھی کم ہوتا ہے تو تل تل گھٹتا ہے اور یہاں تو صرف اللہ کا نام ہی ہے۔ یہ خیال کر کے حکیم صاحب نے شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ جناب میں حکیم ہوں۔ دواؤں کا اثر اور مرض کی حقیقت جانتا ہوں لیکن جناب کی کچھ نہیں سمجھ میں آئی کہ اس میں کیا اثر ہے کہ نشانہ گیج اور برجستہ لگا۔ شاہ صاحب نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ بابا تم اب جب واپس آ ؤ گے تو انشاءاللہ فقیر بتا دے گا کہ اس میں کیسی قوت اور کیا اثر ہے۔ حکیم صاحب یہ جواب سن کر یہ خیال کرتے ہوئے باہر آئے کہ اس کا وجود ہی کیا ہے جو فقیر اس کا جواب دیتے۔ غرض باہر تشریف لے گئے اور ایک عرصے کے بعد پھرتے پھراتے پھر اسی جنگل میں دیکھ بھال کرتے اس جھونپڑی کے پاس آئے اور جھونپڑی پر نظر پڑی تو حکیم صاحب کو یاد آیا کہ یہ وہ جھونپڑی ہے جس میں ہم نے پانی پیا تھا اور فقیر نے اس مریض کو جو تپ محرقہ میں مبتلا تھا اس کو چھو

سے اچھا کیا تھا۔ آؤ فقیر صاحب سے بھی ملتے چلیں شاید وہ ننگا فقیر میرے سوال کا جواب دے دے۔ یہ خیال کر کے نہایت خوش اور بشاش جھونپڑی میں قدم ہی رکھا تھا کہ شاہ صاحب نے ایک ہی نہ دو بیسیوں گالیاں ایسی بے تکی جو دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں ان حکیم صاحب کو سنانی شروع کیں۔ گو حکیم صاحب انسان کامل تھے بایں ہمہ حکیم صاحب کو ایسا غصہ آیا کہ دماغ غصے سے بھر گیا اور آپے سے باہر ہو گئے۔ حکیم صاحب نے بھی بے سوچے سمجھے اتار کر پاؤں سے جوتی اپنی مانی شاہ صاحب کو اتنی جوتیاں ماریں کہ حکیم صاحب کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ شاہ صاحب نیچی نظر کیے خاموش جوتیاں کھاتے رہے اور مسکراتے رہے کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ حکیم صاحب نے دو جوتیاں اور ماریں کہ یہ پاجی ہے اور ہے اسی قابل جب حکیم صاحب جوتیاں مار چکے تو جوتی ہاتھ سے زمین پر ڈالی تو جوتی زمین پر الٹی پڑی حکیم صاحب نے جوتی کو پاؤں کے انگوٹھے سے سیدھا کر پاؤں میں پہن کر چاہتے تھے کہ باہر جائیں کہ شاہ صاحب نے فرمایا بابا دور سے آئے ہو ذرا تو فقیر کے پاس دم لو چلے جانا تو ہے ہی ذرا فقیر کی بھی سنتے جاؤ۔ اب یہ سن کر حکیم صاحب کو خیال آیا کہ یہ جوتی خوردہ ہی ہے اور ہے بڑا ڈھیٹ اگر کسی اور پر یہ جوتیاں پڑتیں تو اس کے ہوش بجا نہ رہتے اس کی تو وہ مثل ہے کہ نہ سوتلے میرے ڈنڈے پہ لکھے اب اس کی مرضی کے موافق مار پڑی تب اس کے ہوش درست ہوئے یہ خیال کر کے ذرا حکیم صاحب ٹھٹکے ہی تھے کہ فقیر صاحب نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ بابا فقیر پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ فقیر کو ہوش نہیں رہتا اور اپنے آپے کی بھی خبر نہیں رہتی بابا اگر کوئی بات فقیر سے مرضی کے خلاف ہوئی ہو تو بابا عنداللہ معاف فرمانا اور ہاں بابا اس روز آپ کا کیا سوال تھا اس وقت میں سمجھا نہیں تھا۔ ہاں اب ارشاد ہو کہ وہ سوال کیا ہے۔ یہ سن کر حکیم صاحب اب سمجھے کہ افسوس یہ فقیر تو نہایت لائق ہے اور ذکی ہے مجھ سے سخت غلطی ہوئی خیر اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب مناسب ہے کہ اپنے قصور کی معافی مانگو۔ یہ سوچ کر نہایت شرمندہ ہوئے اور بڑی لجاجت اور منت سے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب خطا ہوئی للہ معاف فرما دیجیے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ نہیں حکیم صاحب میں تو آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے تو میری دوا کر دی۔ میرا مزاج بگڑا ہوا تھا اب ایک عرصے کے واسطے درست ہو گیا۔ سخت گھبراہٹ تھی چین سا آ گیا اور ہاں بابا اس روز آپ کا کیا سوال تھا میں اس وقت سمجھا نہیں کہ سوال آپ کا کس کے متعلق تھا کم کے متعلق تھا یا کیف کے۔

حکیم صاحب نے فرمایا کہ جناب اس روز تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایسا شدید بخار جس کی حرارت اکثر دیکھا گیا ہے کہ موت کے بعد ہی اترتی ہے اور ایسے مریض کا دماغ اور معدہ تک بھن جاتا ہے آپ نے تو کمال ہی کیا کہ ایک چھو سے سب چھو ہو گیا۔ میں اپنے اور باپ دادا کے نسخے جو تیر بہدف ثابت ہوئے ہیں، جن نسخوں کی وجہ سے ان بزرگوں کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا اور ہم بھی بہت سوچ سمجھ کر اور جانچ جانچ کر دوا دیتے ہیں لیکن فائدہ فوری تو ایک طرف یقینی بھی نہیں ہوتا ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ کم و بیش ہو جاتا ہے لیکن میں تو چھو کے اثر سے، جواب

تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اثر کس سردی گرمی کا تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بابا یہ چھو کا بڑا وسیع میدان ہے کہ جس میں کوسوں منزل کا پتہ نہیں لگتا اور وہ دریائے ناپیدا کنار ہے جہاں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا نہیں ملتا۔ دنیا میں دو چیزیں ہیں مخصوص جو ہمارے حواس سے مخصوص ہوتی ہیں ایک مادی دوسرے مجرد مادے سے لیکن بذات قائم جن کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے اور مادے کی چیزوں کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ حکیم صاحب معاف فرمانا جناب ابھی مادی اشیا سے بھی فارغ نہیں ہوئے اب جو چیزیں مادے سے مجرد نہیں کیا جائیں اور بابا آپ تو مادے کے افعال اور خواص کو ٹھنڈا گرم تو سمجھ لے اور مجھ کمبخت کو تو مادے کی ابھی ہوا تک بھی نہیں لگی دیکھو بابا آپ نے میرے پاس کیا دیکھا۔ اچھا خیر اب آپ سے فقیر کا ایک چھوٹا سا سوال ہے اگر ناگوار نہ ہو تو فقیر عرض کرے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ آپ ضرور کہیں اگر میرے علم میں ہے تو جواب دوں گا۔ فقیر صاحب نے فرمایا میں تو صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ بادا میں نے آپ کو کیا سونے کا کشتہ کھلایا تھا کہ آپ اتنے گرم ہو گئے اور ایک ضعیف و ناتواں عاجز کو مارا جو آپ سے کسی شے کا سائل نہیں اور خدمت کرنے والا ہے اور وہ کون سا نسخہ کا ہویا خرقہ دراز کندو کے پانی میں کافور ملا کر پلایا جو آپ یکا یک پانی پانی ہو گئے کہ ابھی تو جوتیاں ماری تھیں اور ایک آن نہ گزرنے پائی تھی کہ آپ نے مجھ سے زیادہ اپنے آپ کو عاجز بنالیا۔ وہ بادا چھوئی تو تھی۔ بس اونا تجربے کار جاہل تو کیا جانے کہ مادہ کیا ہے اور روح کیا، تو بندہ گان خدا کو دھوکا دیتا پھرتا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت جو انتہائی مزے کا تھا بے کار گزر گیا اب میرے پاس اتنا وقت کہاں جو تجھ جیسے بھیڑیے سے باتیں کروں۔ ہاں جب تو اہل بن جائے گا تب آئیو اس وقت فقیر کچھ سمجھادے گا اور تیری بری صحبت نے اتنا برا اثر پیدا کیا کہ اس وقت میں بھی اتنے وقت کے واسطے جاہل بن گیا۔ یہ فرما کر فقیر صاحب نے حکیم صاحب کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ حکیم صاحب تو یہ سن کر یک دھک رہ گئے اور یہ خیال کرتے ہوئے جھونپڑی سے یہ کہتے ہوئے باہر آئے کہ افسوس تم دنیا میں آئے اور کچھ نہ جانا۔ شعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
گئے دونوں جہان سے ہی وائے ستم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اور جو قدرت کی نعمتیں دنیا میں انبار در انبار ہیں وہ تو خیر لیکن زبان جو سب سے زیادہ ضروری اور یہی تو وہ جادو کی پڑیا ہے کہ ساری قدرتی خوبیاں اس میں بھری ہیں جس کے بغیر دنیا کا اچھا برا کوئی کام ہی نہیں چلتا اس کا تھوڑا سا بھی علم نہ سیکھا۔ ہم نے کیا کیا آج معلوم ہوا کہ زبان ہی وہ بجلی ہے جو گرنے سے پہلے اپنا کام کر جاتی ہے۔ ادھر زبان سے پورا فقرہ ختم نہیں ہونے پاتا کہ سننے والے پر اپنا کامل اثر شروع کر دیتا ہے اس لیے ہر شخص کو مرد ہو یا عورت کوئی ہو زبان کا علم سب سے پہلے حاصل کرے۔ معلوم ہوا کہ انسان تو اشرف المخلوق ہے اگر جانور ایک آدھ فقرہ ٹوٹا پھوٹا سیکھ جاتا ہے تو سب کی نگاہ میں محبوب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کو مناسب ہے کہ جو جو

باتیں میں نے لکھ دی ہیں ان کو بہ نظر غور پڑھ لے اور سمجھ لے۔

انسان پہلے بات کو تولے پھر منہ سے بولے اور جب بات کرے تو چہرہ بات کرنے سے پہلے بشاش ہو کر تم سے بات کرنے والے کا بھی دل شگفتہ ہو جائے اور جی کھل جائے اور بڑی بات یہ ہے کہ تمھاری سُن لے جب تک سننے والے کو مزا نہ آئے گا کہنے والا بھی نہ کہہ سکے گا۔ اب سننے والے کو یہ دیکھ لو کہ تمھاری بات سے اس کو انکار ہے یا وہ ذہن سے خالی ہے اور جس وقت تم بات سنو تو دل لگا کر سنو اور مخاطب کا حال اس کی باتوں سے کھل جائے گا کہ سمجھدار ہے یا کم سمجھ، اگر سمجھ اس کی کم ہے تو اس سے سیدھی اور سہل بات کرو اور اتنی بات ہو جو اس کی سمجھ میں آ جائے اور تمھاری بات سے تفکر اور تردد میں نہ پڑ جائے۔ خوبی بات کرنے کی یہ ہے کہ سننے والا بے تکان سمجھ جائے اور اس کا شک زائل ہو جائے۔ جو بات ہو برمحل ہو اور وقت پر ہو اور تم وہ بات زبان سے نکالو کہ جس کے معنی صحیح ہوں، مبالغہ نہ ہو، مقتضا ظاہر ہو۔ جملہ آسان ہو۔ جو بات کہو سچ کہو واقعے کے خلاف نہ ہو اور سچ بھی نہایت سمجھ کر بولو۔

حکایت:

ایک بادشاہ دربار کر رہا ہے، تختِ حکومت پر بیٹھا ہے، سر پر تاج جواہر نگار اور چتر زرکار گردش کر رہا ہے، گلے میں چار قبائیں شہنشاہی، سینے پر موتیوں کی مالا جس کے بڑے بڑے موتی چمک دار نہایت گول سڈول صاف ستھرے زانوؤں پر تلوار آبدار باقبضہ جواہر نگار۔

اوپر نیچی داہنے بائیں دنگل و کرسی جن پر سرداران نامدار دلیر اور بہادر، دعویدار سلطنت رونق افروز، چوکی وزارت پر وزیر ہاتھ باندھے سر خم کیے استادہ۔ بادشاہ ہر شخص سے بات نہیں کرتا کہ اس کی سمجھ کے موافق جواب دینے والا کون ہے۔ بادشاہ ہر علم اور فن کا ماہر ہوتا ہے، بادشاہ کے آگے جا کر عرضِ حال کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ مکمل انسان ہوتا ہے۔

ایک روز بادشاہ نے وزیر سے فرمایا کہ وزیر خدا کی نعمتوں میں کون سی ایک ایسی نعمت ہے کہ انسان دنیا میں جس کے سہارے اچھی طرح سے زندگی بسر کرے وزیر نے دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت وہ عقل اور سمجھ ہے کیوں کہ ہر شخص عقل اور سمجھ کا محتاج ہے اور عقل مند کسی کا محتاج نہیں ضروری سامان سب کچھ عقل مند کا اسی کے دروازے پر چل جاتا ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ اگر کسی میں عقل اور سمجھ نہ ہو تو پھر کیا، وزیر نے کچھ تامل کے بعد عرض کی کہ قبلہ عالم خیر پھر ادب ہو کہ ادیب بھی اپنی آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہے کہ اس کا دشمن دنیا میں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ اس کے ارشاد ہوا بالفرض محال اگر یہ بھی نہ ہو تب کیا یہ سن کر وزیر نے تیوری پر بل ڈال کر عرض کی کہ تب دولت کہ یہ بہت سے عیبوں کو چھپا لیتی ہے لیکن اس کو قیام نہیں ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے آئی اور گئی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وزیر اگر دولت بھی نہ ہو تب تو وزیر نے تڑپ کر عرض کی کہ بادشاہ ظل اللہ ہوتا ہے جلد دعا فرمایئے کہ ایسے پر بجلی گرے اور دنیا سے دور ہو جائے۔

بی گالی

جب کسی قوم یا ملک میں یا کسی خاندان میں بی گالی قدم دھرتی ہیں تو اس کو ملیا میٹ ہی کر کے چھوڑتی ہیں۔
میں پہلے اسی رسالے میں عرض کر چکا ہوں کہ لفظوں کا اثر ٹھنڈا گرم سب ہی کچھ ہوتا ہے اور گالی تو سخت گرم وخشک ہے جب گالی دینے والا گالی دینے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے گالی دینے والے ہی کا مزاج گرم ہوتا ہے اور مزاج گرم ہوا تو صحت خراب، اب آپ ہی تصور فرمالیں کہ صحت خراب ہوگی تو نسل خراب ہوگی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد نام ونشان اس ملک یا خاندان کا باقی نہ رہے گا۔ یہ مرض متعدی یا اُڑ لگتی بیماری ہے کہ ایک سے دوسرے کو اُڑ کر لگتی ہے جب گالی دینے والا گالی کو دوسرے کی طرف روانہ کرتا ہے تو دوسرا اس کو خلعت دے کر واپس کرتا ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ آواز کو فنا نہیں یوں دیکھنے میں تو آواز کی رسائی منہ سے کان ہی تک ہے جس کا فاصلہ تین انچ یا چھ انگل کا ہے جب آدمی بات کرتا ہے تو ہوا میں لہریں پیدا کرتی ہیں جو کان تک پہنچتی ہیں چوں کہ ان لہروں کا کوئی روکنے والا نہیں اس وجہ سے کرۂ زمین پر جو ہوا کئی میل یا کئی سو میل ہے اس ہوا میں یہ لہریں برابر چلی جاتی ہیں اور چلی جائیں گی یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے گی، اگر حرکت نہیں تو لرز ہی باقی رہے گی، جب ہوا گرم ہوئی تو ہم گرم اس لیے آتش پرست بھی یہ ہدایت کرتے کہ لفظ اچھے بولو۔
یہی مقیدِ اور آزاد للو جو گھر بیٹھے سینکڑوں گھر کھا لیتی ہے اور بھُس میں چنگی ڈال جمالو دور کھڑی ہے۔ زبان آپ تو کہہ کر اندر ہو جاتی ہے اور مصیبت تمام اعضا کو سہنی پڑتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زبان کا اثر جادو سے زیادہ تیز ہے جس کی وجہ سے رات دن مصیبتیں سہنی پڑتی ہیں اور رات دن آفتیں اٹھانی پڑتی ہیں تو پھر کیسا افسوس ہے کہ ہم اس چھوٹے سے عضو کو جو چند محدود غدودوں کا مجموعہ ہے ایک لوتھڑے کی صورت اور اعضا تو جسامت میں بھی بڑے اور تعداد میں بھی اکثر دو دو ہیں ان پر قابو نہ سہی تو زبان پر تو قابو آدمی کا ہو۔ یہ زبان تو باطن کی کنجی ہے دنیا میں اگر اس کنجی کو کڑا نہ پکڑا تو یہ کنجی تو تمام اعضا کو ناچ نچوا دیتی ہے۔ اس کو تو مناسب ہے کہ سوچ سمجھ کر ہی حرکت دو کیوں کہ بے سوچے تو دنیا میں زندگی وبال ہے۔ دیکھو جب تم کسی اپنے یا غیر سے ملتے ہو تو اس وقت نہ تو حسن صورت کام آتا ہے جس کو ہم تمام عمر جمیل بنا کر رکھتے ہیں اور نہ قوت جس کو ہزاروں طرح کی غذاؤں کے چٹخارے سے سنبھالے رہتے ہیں بلکہ سب سے پہلے زبان ہی آگے قدم رکھتی ہے یہ بگڑ گئی تو تمام کام بگڑ گئے اور یہ درست ہے تو مثل مشہور ہے کہ زبان شیریں اور عیش فیریں۔

مثال

ایک جنگل میں، پرانا بن ہے جس میں عمارتی کام کے لائق بڑے بڑے تناور اور گھنیرے درخت ہیں، ہزاروں بڑھئی اور آرہ کش لکڑیاں اور کڑے تختے نکالتے ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک نہایت موٹا اور لمبا درخت آرہ

کشتوں نے لاڑے پر چڑھا رکھا ہے اور بیچ میں کرونت یا آرہ ڈال کر نصف سے کم سوت چیرا ہے اور تختے آپس میں نہ مل جائیں اس وجہ سے خانہ ٹھوک رکھا ہے جس سے شگاف کھل کر آرہ نہ رکے۔ شام کو یہ بڑھئی تو اپنے اوزار لے کر چلے گئے اور خانہ ٹھکا ہوا چھوڑ دیا ہے۔ اتفاق سے ایک شیر نہایت زبردست پہنچا اور اس نصف چرے ہوئے سوت کے شگاف میں دونوں پنجے ڈال کر جانور ہی تو ہے منہ سے اس خانے کو نکال لیا، خانے کا نکلنا تھا کہ زبردست گیلی لکڑی کا شگاف بند ہو گیا اور شیر کے دونوں پنجے پھنس گئے۔ اب شیر غریب کیا کرتا ہر چند زور کیا تو ناخن پنجے سے نکل کر گیلی لکڑی تو تھی ہی لکڑی کے اندر گھس گئے اب لکڑی کے دباؤ سے پنجے کا خون جمع ہونا شروع ہوا اور ورم ہو کر شیر کے دونوں پنجے مٹی ہو گئے۔ اس جانور کو قدرت نے ضبط کا مادہ خاص عنایت فرمایا ہے شیر تو شیر ہی ہے بلی کو دیکھو جو اس سے شکل میں مشابہ اور نہایت کمزور ہے، کتنا ہی بلی کو مارو پیٹو چپ رہتی ہے اور ایک پرندوں میں کبوتر۔ کتا جو بلی سے بڑا اور طاقت دار بھی ہوتا ہے مارنا تو ایک طرف صرف لکڑی دکھا دو اتنا غل مچائے گا کہ محلہ سر پر اٹھا لے گا۔ اب یہ شیر جانور کم سمجھ، گرم مزاج، گوشت خوار، غصہ زیادہ اس نے جھلا جھلا کر اپنے ہاتھ اور لکڑی پر منہ مارنے شروع کیے ہاتھ تو دبے ہوئے تھے ہی اب منہ بھی زخمی ہو گیا۔ اس حالت میں صبح ہو گئی ہے اور اتفاقاً ایک بڑھئی اوزاروں کا تھیلا بغل میں، کمانی ہاتھ میں، بسولا کاندھے پر اکیلا اپنے کام پر جا رہا ہے کہ یکا یک شیر کے ڈکارنے کی اور وڑو کنے کی آواز بے ترکیب اس کے کان میں آئی یہ سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے اور دل دھڑکنے لگا۔ اکیلا تھا جب اس نے یہ دیکھا کہ آواز ایک ہی جگہ سے نہایت دردبھری آ رہی ہے۔ آدمی تھا اس وجہ سے اس کا دل دہل گیا گو آواز بعید ہے کہ جس کے کوئی معنی نہیں لیکن حقیقت میں یہ بڑی معنی خیز ہے۔ بڑھئی کو خیال آیا ذرا پاس چل کر دیکھو تو سہی کہ کیا ماجرا ہے اور ایسی شیر پر کیا بپتا پڑی جو یوں بے قرار ہے اور ڈکار رہا ہے۔ غرض ڈرتے ڈرتے آڑ پکڑتے ہوئے اب ایسی جگہ آ گیا کہ جہاں سے شیر صاف نظر آیا تو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمام منہ شیر کا لہولہان ہے، خشک زبان منہ سے باہر ہے، آنکھیں ابلی آتی ہیں، ہاتھ ورم کر گئے ہیں۔ بڑھئی کو یہ حال دیکھ کر رحم آیا اور خیال کیا کہ شعر:

جو اور کسی کی جان رکھے تو حق اس کی بھی جان رکھے
جو اور کسی کا مال رکھے تو حق اس کا بھی مال رکھے
جو یاں کا رہنے والا ہے ان باتوں کو وہ جان رکھے
یہ چلتا پھرتا نقشہ ہے اس نقشے کو پہچان رکھے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف و عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرے اس ہاتھ ملے یہ سودا دست بہ دستی ہے

خیر جو کچھ ہو سو ہو تو نیکی کر، یہ مثل مشہور ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ ہاں یہ خوف ہے کہ معلوم نہیں کب

سے بھوکا پیاسا ہے، عقل مند نہیں جانور ہے اگر کہا گیا تو مفت میں جان جائے گی خیر ہر چہ بادا باد جو کچھ ہو نظیر اکبر آبادی نے خوب کہا ہے، شعر:

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں، جو سے جو، چاول سے چاول پائے گا
جو آج جیسا دیوے گا ویسا ہی وہ کل پائے گا
کل دیوے گا کل پائے گا کل پائے گا کل پائے گا
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کتنا اچھا خیال ہے۔ غرض بڑھئی دل کڑا کر کے شیر کے قریب آیا تو دیکھا کہ شیر کو کچھ ڈھارس سی بندھی اور شیر چپ ہو گیا۔ تھا شیر لیکن بلی کی طرح دم ہلانے لگا، شعر:

آں کہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

بڑھئی نے دیکھا کہ وہ نکلا ہوا خانہ وہیں پڑا ہے۔ بڑھئی نے وہی خانہ ڈرتے ڈرتے اٹھایا اور شگاف میں لکڑی کے رکھ کے چند لئے بسولہ مارے کہ لکڑی کا چراؤ کھل گیا اور شیر نے اس بلا سے نجات پا کر مردہ کی صورت زمین پر گر گیا۔ بڑھئی کو شیر کا بے ہوش ہو کر گرنا غنیمت ہوا، اپنا تھیلا سنبھال کر بغل میں مار سر پر پاؤں دھر کر بھاگا۔ اب شیر کو ہوش آیا تو یہ لنگڑاتا لنگڑاتا اس بڑھئی کی بو اٹھاتا وہاں آیا جہاں اور بہت سے بڑھئی تھے اور یہ بڑھئی بھی کام کر رہا تھا اور بڑھئی تو سب ڈر کے مارے بھاگ گئے لیکن یہ ٹھہرا رہا، ہر چند اور بڑھئیوں نے غل مچایا، کسی بہادر نے پتھر مارا لیکن اس شیر نے کسی کی پروا نہ کی گردن ڈالے اسی بڑھئی کے پاس آیا اور محبت بھری نگاہ سے شیر نے بڑھئی کو دیکھا اور اس کے پاؤں پر منہ رگڑا کر اپنی بلی کی طرح اس کی رانوں سے لگائی، دم ہلائی اور کچھ کچھ غرغراتا رہا تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔ اب اس روز سے شیر کا یہ وتیرہ ہو گیا کہ روز صبح کو بڑھئی کے پاس آتا، اس کو سونگھتا ہے، چاٹتا ہے، اچھلتا ہے، کودتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ چند روز کے بعد بڑھئی کا بھی دل شیر سے کھل گیا۔ اب جب شیر آتا ہے تو یہ بڑھئی بھی اس کو پیار کرتا ہے۔ لوگ تماشا دیکھتے ہیں، تعجب کرتے ہیں تھوڑے عرصے کے بعد بڑھئی کے دماغ میں بجائے جو ہر دماغ کے لکڑی کا برادہ بھرا ہوا ہے یہ تو نہ سمجھے کہ یہ جانور ہے، شیر ہے، ہم کو کیا مناسب ہے، مصرع:

بندہ باید کہ حد خود داند

بلکہ چند روز میں یہ تو ایسے کھل کھیلے کہ کبھی اس کو چانٹا مار بیٹھتے ہیں، کبھی منہ میں ہاتھ دے دیتے ہیں، کبھی

شیر پر سوار ہو جاتے ہیں لیکن ان کندۂ ناتراش کو یہ خبر نہیں کہ شیر کی کمر نازک ہوتی ہے غرض روز صبح کو لوگوں کا مجمع ہوتا ہے۔ ایک روز بڑھئی صاحب شیر سے کھیل رہے ہیں کہ میاں بڑھئی نے خوشی میں آ کر، بیڈول اور اکھڑ تو تھے ہی، یہ کہہ کر ایک چانٹا مارا کہ اے جا گیدڑ کی کے بچے شیر نے یہ سنتے ہی تڑپ کر جست کی اور جنگل کی طرف نکل گیا اور دوسرے روز موافق عادت کے پھر صبح کو آیا لیکن آج تو شیر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا نہ اس کی وہ للڈونی چال ہے نہ وہ جھومتا ہے نہ دم ہلاتا ہے، غضبناک صورت بڑھئی کے آگے آ کر کھڑا ہوا اور اس طرح سے غرایا کہ بڑھئی سہم گیا اور شیر نے غرا کر گردن اس کے آگے جھکا دی اور تھوڑی دیر کے بعد منہ اٹھایا اور پھر گردن ڈال دی جب چند بار ایسا ہی کیا تو بڑھئی کا حوصلہ نہ پڑا کہ روز کی طرح اس کے ساتھ خوش فعلیاں کرتا۔ لوگ جو بدستور تماشائی ہیں ان میں سے کسی عقل مند نے بڑھئی سے کہا کہ دیکھو تو سہی یہ کہتا کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ کیا اس کی گردن میں کوئی جانور لپٹا ہوا ہے یا کوئی کانٹا چبھا ہے آخر ہے کیا۔ بڑھئی نے شیر کی گردن چاروں طرف سے ٹٹولی لیکن کچھ معلوم نہ ہوا شیر نے پھر وہی حرکت کی اس سے ظاہر ہوا کہ یہ شیر یہ کہتا ہے کہ میری گردن پر کچھ ہتھیار مار، بڑھئی نے ایک لکڑی ماری شیر نہایت جھلایا اور پھر گردن نیچی کی جس سے بڑھئی سمجھ گیا کہ اس شیر کا مقصد یہ ہے کہ میری گردن پر کوئی گہرا زخم لگا۔ آخر بڑھئی نے ایک بسولہ مارا جس سے شیر کی گردن میں اچھا گہرا زخم ہو گیا، خون بہنے لگا، شیر زخم کھا کر چلا گیا چند روز کے بعد آیا اور گردن جھکائی بڑھئی نے دیکھا کہ زخم اچھا ہو گیا اور زخم کھانے سے شیر کا مقصد یہ تھا کہ دیکھ زخم اچھا ہو گیا ہے لیکن بری بات کا زخم اچھا نہیں ہوتا اس وجہ سے میری یہ عرض ہے کہ جو بات کرو سوچ سمجھ کر بولو، زندگی میں تمام کاموں سے پہلے زبان درست کرو۔ دن رات کا تجربہ بتا رہا ہے کہ جب کوئی قوم دنیا سے نیست و نابود ہونے والی ہوتی ہے تو پہلے اس قوم یا ملک کی زبان ہی خراب ہوتی ہے اور چند روز کے بعد وہ قوم غلامی کرتی ہے اور غلام بن کر اس قوم کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ زبان بدلنے سے کوچہ بدلنا بہتر ہے۔ برے فعل کا اثر تو جب ہی ہوتا ہے کہ جب اس کا راز کھلتا ہے اور بد زبانی سے تو رات دن کے جھگڑے نتنے ہزاروں طرح کے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ برے کاموں کا اثر تو کم و بیش مٹ جاتا ہے لیکن بات کا مارا تو پانی بھی نہیں مانگتا اور زبان مضبوط اور وزنی تو اتنی ہے کہ نہ دھری جائے نہ اٹھائی جائے جو کہہ دیا کہہ دیا پتھر کی لکیر کہ کوئی اس کو میٹ ہی نہیں سکتا اور بودی اتنی کہ نہ زبان کو ہاتھ لگا سکتے ہیں نہ پکڑ سکتے ہیں بقول کسی کے کہ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے لیکن کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ پھر کیسا افسوس ہے کہ ہم انسان ہو کر طرح طرح کی مصیبت اٹھائیں اور پھر وہی حرکت کریں جو حرکت جانور نہیں کرتے اور بات ہی بگڑنے سے ہم کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں لیکن اٹھاتے ہیں اور خیال تک نہیں کرتے تو ایسے مجھ جیسے لوگ جانور سے بدتر ہیں کیوں کہ جانور غلطی کھا کر سنبھل جاتا ہے اور ہم انسان ہو کر نہ سمجھیں۔ اب دور نہ جائیں آپ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چونا لگی

کی سفید دیوار سے گھوڑے کو ٹکر کھلا دیں اور پھر ایک سفید کاغذ کی دیوار بنا کر ذرا پھر تو گھوڑے کو ٹکرائیں گھوڑا جان دے دے گا لیکن ٹکر نہ کھائے گا۔ گالی کا اثر صحت پر خراب پڑتا ہے۔ گالی دیتا ہی وہ ہے جو ناقص ہوتا ہے جب کسی ملک یا قوم میں گالی کا استعمال شروع ہو جاتا ہے تو اس ملک اور قوم کی جلد حالت خراب ہو جاتی ہے اور وہ قوم ضعیف ہو جاتی ہے کہ برے الفاظ سنتے سنتے کہنے والے اور سننے والے کا خون گرم ہو جاتا ہے۔ جس سے صحت خراب ہوتی ہے اور جب صحت ہی خراب ہے تو نسل بھی خراب، جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو روح دفع دشمن کے واسطے باہر کی طرف آتی ہے اور روح کا گہوارہ خون ہے۔ جس کی وجہ سے رنگ چہرے کا لال ہو جاتا ہے اور روح بلا شعور مدبر بدن ہے اور حار ہے حرارت کا یہ قاعدہ ہے کہ جتنی حرارت باہر آتی ہے اتنی اندر نہیں جاتی بلکہ بکھر جاتی ہے اور جتنی ہے اور جب روح ہی کمزور ہوگئی تو زندگی کا سہارا اس پر یہ وجہ ہے قوموں کی خرابی کی کہ اچھے خیال آتے ہی نہیں آخر مفلس اور محتاج رہ کر دنیا سے مٹ جاتی ہیں۔ گالی کا اثر صحت پر ہوتا ہے مثال کے طور پر ایک حکایت پیش کرتا ہوں۔

حکایت:

سنا ہے کہ ایک بادشاہ بڑا رحم دل اور نہایت منصف اور ایماندار تھا، بادشاہ کی نیت کا اثر رعیت پر پڑتا ہے اسی بادشاہ کے زمانے میں ایک شخص نے ایک زمین شہر میں مکان بنانے کو خریدی اور جیسا اس کا جی چاہا اس نقشے کے موافق بنیادیں کھدوائیں اتفاق سے نیو کی باڑ میں ایک دیگ کا پیٹ اور قلعی نظر آئی مزدور نے آواز دی میاں دیکھو تو یہ آپ کی کیا چیز دبی ہوئی نکلی ہے۔ زمین والا دوڑ کر آیا تو دیکھا کہ ایک بڑی دیگ کا پیٹ و قلعی نظر آ رہی ہے۔ جس کی قلعی اور تانبے کو مٹی جگہ جگہ سے کھا گئی ہے، اس نے مزدور سے کہا کہ ذرا سی مٹی اس کے منہ پر سے اور ہٹاؤ چناں چہ مزدور نے دیگ کے منہ پر سے مٹی اور ہٹائی تو دیکھا کہ دیگ کے منہ پر ایک مٹی کا کونڈا ڈھکا ہے لیکن اتنا اجلا اور کورا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی آوے میں سے نکالا ہے۔ دنیا کی بہت سی صنعتوں میں سب سے زیادہ ٹھیکری کی عمر ہوتی ہے کہ چھوٹی ہو کر ضرب سے نکل جاتی ہے اور پھر ہزاروں برس پڑی رہتی ہے غرض مالک نے مزدور سے کہا کہ ذرا کونڈے کو ہٹا کر دیکھو اس میں ہے کیا غرض مٹی ہٹی تو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ دیگ میں سوا سوا اشرفیاں ایسی نئے سکے کی بھری ہیں نہ جس میں زنگ ہے نہ سیاہی نہ میل مٹی اس نے دیکھتے ہی حکم دیا کہ جلدی دیگ کے منہ کو بند کر دو یہ میری نہیں ہیں۔ جس نے زمین فروخت کی ہے اس کی ہیں اور وہ اس رقم کو دبا کر بھول گیا۔ اب ایک مزدور سے کہا کہ تم جا کر اس زمین کا جو پہلا مالک تھا اسے بلا لاؤ۔ چناں چہ مزدور گیا اور بائع کو بلا لایا جب بائع آ گیا تو مشتری نے کہا کہ بھائی اتنی غفلت، دیکھو یہ تمہاری اشرفیاں ہیں ان کو لے جاؤ بائع نے جواب دیا کہ بھائی میری ہوتیں تو میرے پاس ہوتیں میری کہاں یہ تو تمہاری ہیں نہ میں نے رکھیں نہ میری ہیں مشتری صاحب بولے نہیں جناب نہیں آپ یاد کریں شاید ذہن میں آ جائے کیوں کہ میں نے زمین خریدی ہے اشرفیاں نہیں خریدیں بائع نے

جواب دیا واہ جناب واہ جب میں نے عرض کر دیا کہ میری نہیں ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ تو حق اور انصاف سے نہیں ٹلتے میں ٹل جاؤں کہ دنیا میں آرام سے رہنے کے واسطے ایک یہی تو ذریعہ ہے کہ ہر شخص امیر ہو یا غریب حق اور سچائی کے سہارے آرام سے زندگی بسر کرسکتا ہے آپ تو اپنے اوپر سے یہ بوجھ ٹالتے ہیں اور مجھ کو اس گناہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ الغرض بعد گفتگو کے یہ قصہ بادشاہ تک پہنچا بادشاہ یہ سن کر سجدۂ شکر بجالایا کہ یا اللہ میری رعیت میں ایسے ایسے ایمان دار ہیں کہ اتنی بڑی رقم اور وہ بھی نقد کی صورت میں بلاکسی حجت اور تکرار کے اور دونوں کو لینے سے انکار۔ اب بادشاہ نے یہ خیال کر کے حکم دیا کہ جاؤ دونوں کو بلا لاؤ۔ چناں چہ حسب الحکم چوبدار گئے اور ان دونوں کو بلا لائے جب دونوں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے زمین خریدنے والے سے فرمایا کہ یہ اشرفیاں تمہاری ہیں تمہاری زمین سے نکلی ہیں کوئی دعوے دار نہیں پھر کیا اس نے عرض کی کہ شہنشاہ عادل میں اگر لے بھی لوں گا تو کے کال کھاؤں گا اور جو موت آ گئی تو سب کچھ یہیں چھوڑ جاؤں گا:

جب چلتے چلتے منزل پر یہ گوند تر ڈھل جائے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پائے گی
یہ گوند جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جائے گی
دھی پوت جوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آئے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ
عالی جاہا یہ امر خادم سے ہرگز نہ ہوگا

اب بادشاہ نے بائع سے فرمایا بھائی یہ اشرفیاں تیری زمین سے نکلی ہیں تجھ کو لینے سے کیا انکار ہے۔ اس نے دست بستہ عرض کی غریب پرور میں آئے دن کا روگی پہلے ہی گناہوں کے بوجھ سے سیدھا نہیں ہوسکتا اس پر یہ اتنی بھاری گٹھری۔ میں رات دن دیکھ رہا ہوں ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ رباعی:

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لب ریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

مجھ کو خداوند اس آفت میں نہ ڈالیے نہ میری ہیں اور نہ میں لوں گا۔ یہ سن کر بادشاہ اور خوش ہوا اور خیال کیا کہ یہ عجیب مقدمہ ہے اس کا فیصلہ بھی عجیب اور انوکھا ہو۔ یہ خیال فرما کر بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر میں جو بڑھے سے بڑھا ہو اسے لے آؤ۔ چناں چہ نوکر گئے اور تلاش کے بعد ایک ایسے بڈھے کو لائے کہ جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے سفید

اور وہ بھی چھدرے بال۔ جن بالوں میں سے سر کا تامڑا چمک رہا ہے اور ان سفید اور الجھے ہوئے بالوں پر میلی سفید ٹوپی جو کئی جگہ سے پھٹی گوٹ مسکی ہوئی، سر پر گھسی ہوئی کانوں کی لویں، رعشے سے ہلتی پیشانی پر سینکڑوں بل بھویں سفید جن کے بڑے بڑے اور مڑے ہوئے موٹے بال آنکھوں پر جھکے، آنکھیں اندر دھنسیں غور سے دیکھو تو یوں چمکتی ہیں جیسے اندھے کوئیں میں میلا پانی بائیں آنکھ کے کنج اصغر یعنی چھوٹے کوئے کے قریب ایک رسولی لیکن اتنی کہ جس سے گٹھلی گلانی ہوئی ہے، آپ نے اپنی آنکھوں کا پانی نکلوایا ہے جس وجہ سے محدب تالوں کی عینک جس کے میلے تال جو دونوں ٹوٹ گئے ہیں تو ان پر انگریزی اخبار کے کاغذ کی چپیاں لگیں تالوں پر بید کا پوست چڑھا، تاڑیوں کی جگہ دو میلی دھجیاں ایک سفید ایک لال جن کی گرہ گدی کے سفید بالوں پر سُرک پھندے کی لگی ناک پر کمانی کے مقام پر لال دھجی موٹی لپٹی ناک کی نوک کچھ جھکی اور نوک میں ناک کی رطوبت کا ایک بندہ لٹک رہا ہے گلے اندر کو دھنسے اور ان پر جھریاں، تھوڑی جیسے آم کی سیپ کی گٹھلی کی نوک جب منہ ہلاتے ہیں تو یہ تھوڑی ناک کی نوک سے ٹکرا جاتی ہے ریش بچہ اور تھوڑی کے بال تھوڑی اونچی ہونے سے کھڑے ہو گئے ہیں۔ پان بکثرت کھاتے ہیں بن کئی میں کوٹ کر ہی سہی۔ اب پان کی پیک جو ہونٹوں کی جھریوں سے بہہ کر آئی اور آپ کو گرم گرم پیک سے جو سل سلاہٹ معلوم ہوتی ہے تو آپ گزھے دار ہتھیلی سے پونچھ لیتے ہیں جس کی وجہ سے چار انگل ڈاڑھی اور ہتھیلیاں دونوں بدرنگ ہیں۔ چار انگل ڈاڑھی بدرنگ سی لال باقی سفید نمونوں کے خضاب جو لوگوں نے تجربے کے واسطے بڑی ڈاڑھی دیکھ کر کبھی کبھی مفت دے دیے ہیں تو ہر خضاب نے اپنا اپنا رنگ نیلا، زرد و زنگاری ڈاڑھی میں پیدا کر دیا ہے جس سے گیدڑ بھی دم دبا کر بھاگے، سخت رعشہ جس سے نہ پاؤں پر قابو نہ ہاتھ بس میں۔ ہاتھ میں بانس کی پرانی لکڑی کئی جگہ سے پھٹی آواز جو جھری میلی دھجیاں لپٹی ہوئیں لکڑی کے نیچے کا سرا گھستے گھستے بانس کے ریشے پلٹ پلٹ کر ایک گیند کا سا گچھا ہو گیا ہے، گلے میں دوہرا گاڑھے کا پرانا اونچی چولی کا میلا چٹ انگرکھا جس کا ابرا تو چولی پر سے تمام پھٹ گیا ہے ہاں مسکا ہوا استر باقی ہے سو وہ بھی دونوں شانوں اور کہنیوں پر سے پھٹا، کہنیاں نکلیں کرتا گلے میں نہیں جس کی وجہ سے بایاں حصہ چھاتی کا کھلا ہوا، پاجاما سا ایک برکا گھاڑے کا ٹانگوں میں اور گول پنچے کی پرانی گٹنے کٹی پنچہ گھسی اڑیاں دونوں نکلیں، جوتی کاندھے پر گز بھر کا میلا رومال جو کبڑے ہونے کی وجہ سے آدھا پیٹ پر بچھا آدھا سائیس کے میلے جھاڑن کی طرح آگے لٹکتا دونوں پاؤں کو آپ اونچا کر کے آہستہ آہستہ اٹھاتے اور دھم سے رکھتے اور لکڑی کا ہاتھ آپ بلند اٹھاتے اور کھٹ سے لکڑی کو کھٹ کھٹاتے ہانپتے کانپتے حضور میں حاضر ہو کر آداب بجا لائے۔ بادشاہ نے غور سے دیکھ کر ارشاد فرمایا میاں بڑے صاحب آپ کے خیال میں کوئی صاحب عمر میں آپ سے بھی بڑے ہیں۔ بڑے میاں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکڑی زمین پر پھینک کر موٹی زبان سے رُک رُک کر کہا کہ حضور میرے والد ہیں بادشاہ نے فرمایا کہ پھر ان کو لاؤ چناں چہ بڑے میاں کے والد آئے تو بادشاہ نے دیکھا

کہ ان بڑے کا سید حا قد، سر پر کڑ بڑے بال، چہرا ابھرا ہوا، بدن پر پانی بھرا، سر پر دستی پگڑی سفید بندھی، انگرکھا اوپر نیچے کرتا پائجامہ بر کا لیکن اجلا، انھوں نے حاضر ہو کر حد ادب سے سر تسلیم خم کیا بادشاہ نے ان سے دریافت کیا کہ بس اب شہر میں تو آپ سے زیادہ عمر کے کوئی اور صاحب نہ ہوں گے انھوں نے عرض کی خداوند نعمت میرے والد ماجد قبلہ بفضلہ زندہ ہیں بس تو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ ان صاحب کو لے آ ؤ غرض اب جو دادا صاحب بڑے میاں کے آئے تو بادشاہ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان بزرگ کا رنگ سرخ و سفید، خون چہرے سے ٹپکا پڑتا ہے، کسرتی بدن، ڈنڑ آئے ہوئے سینے پر گوشت کمر پتلی مچھلے بلی گردن تیار، رانوں کی مچھلے گھٹنوں تک پلٹے پنڈلیاں سختیں ہوئیں، ڈاڑھی پر خضاب ہے لیکن مثل اصل بالوں کے ڈاڑھی دونوں طرف رخ کیے، دانتوں کا چوکا سلامت، پگڑی گلابی آڑی بندھی، بالوں میں تیل پڑا ان بڑے صاحب نے نہایت ادب سے آداب بجالایا، بادشاہ نے ان صاحب سے بھی دریافت کیا کہ آپ سے بھی بڑی عمر کسی مرد یا عورت کی ہے ہمارے شہر میں یا اب کوئی اور آپ سے بڑا نہیں، بڑے صاحب نے دست بستہ عرض کی خداوند مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اب کوئی مجھ سے بڑا اس شہر میں نہیں۔ اب بادشاہ نے دریافت کیا کہ تم سے ایک مقدمے کے متعلق کچھ حال دریافت کرتا ہے لیکن مجھ کو سخت حیرت یہ ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے خدا کے فضل سے تندرست اور آپ کے صاحبزادے اپنے فرزند سے اچھے اور پوتا آپ کا تو دونوں صاحبوں سے گیا گزرا ہے یہ بات مشاہدے اور تجربے کے خلاف ہے۔ ان دادا صاحب نے نہایت ادب سے دست بستہ عرض کی کہ خداوند میری زبان تو کبھی برے لفظوں سے آشنا بھی نہیں ہوئی میں جو کچھ بات کرتا ہوں نہایت سوچ کر سمجھ کر بات کرتا ہوں اور ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ میری بات سے سننے والے کے دل کو ٹھیس نہ لگے اور یہی میری بیوی کا حال ہے۔ میں خدا کی یہ عجیب شان دیکھتا ہوں کہ خاوند اور جورو اکثر ایک ہی سے مزاج کے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک فارسی مثل سچ ہے کہ خدا ناہموار نیست لیکن تختہ را با تختہ خوب می بندد۔ اکثر ایسا ہی دیکھا گیا ہے کہ خاوند اپنی جورو کو جو نہایت نیک اور عقل مند بھی ہوتی ہے اپنی بد مزاجی سے اس کو بھی بد مزاج بنا لیتے ہیں اور بعض تو خود اور جورو دونوں ہی بد مزاج اور کم سمجھ ہوتے ہیں۔ غریب پرور خدائے تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں اور میری بیوی دونوں ہم خیال ہیں کبھی کوئی بات میں اس کی مرضی کے خلاف نہیں کرتا اور نہ وہ کبھی میری مرضی کے خلاف کرتی ہے ہر وقت دونوں خوش رہتے ہیں۔ دن عید اور رات شب برات ہے اور یہ جو میرے صاحبزادے ہیں چار دن خوش چار دن ناراض اور یہ بڈھے صاحب جو ان کے نور نظر ہیں یہ دونوں خصم جورو تو سبحان اللہ دونوں کا مزاج ایسا ہے کہ ان کھوں تیل ہی نہیں ایک دوسرے کو دیکھ کر جلے جاتا ہے، ہر وقت کی جوتی پیزار تو تو میں میں، جھگڑے ٹنٹے تھک کا فضیتی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ جھگڑا کس بات پر ہوتا ہے۔ باہر کا رنج تو گھر میں نکل جاتا ہے لیکن گھر کا رنج تو جنجال ٹھنے کر گھر پکڑ لیتا ہے۔ دونوں کی حالت جلتے جلتے ایسی ہو گئی ہے کہ ملاحظہ ہو۔ ناک بگڑے دم نکلتا ہے، بدزبانی کا اثر صحت پر پڑتا ہے

کر زندگی خراب ہو جاتی ہے تو پھر کیسا افسوس ہے کہ ہم انسان ہو کر زبان کو نہ سنبھالیں اور بولنے اور بات کرنے کے قاعدوں کو نہ سیکھیں۔

الغرض بادشاہ نے ان بڈھوں کو تو رخصت کیا اور ان دونوں اشرفیوں والوں سے فرمایا کہ تم دونوں کی اولادیں ہیں کیا اور ہیں تو کیا کیا ہیں، ایک نے عرض کی کہ میرا بیٹا ہے جوان دوسرے نے عرض کی کہ خادم کی ایک غلام زادی ہے۔ بس یہ سن کر بادشاہ نے فرمایا کہ بس تم دونوں آپس میں اپنے بچوں کی شادی کرلو اور یہ اشرفیاں خرچ کرواؤ باقی انھیں دونوں کو دے دو۔

اب جناب نے سنا کہ بدزبانی کا اثر کیسا نمایاں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام کاموں سے پہلے بات کرنے کے قاعدے سیکھو جب بات کرو بہ کشادہ پیشانی، چہرہ بشاش پہلے سمجھ لو ایسا نہ کرو کہ جو دل میں آئے بے دھڑک کہہ دو، ایسا نہ کرو کہ کاتا اور لے دوڑے۔ جذبات کے برابر کوئی شے انسان کو دھوکا دینے والی نہیں، ایک ایک جملہ الگ الگ اور ایک ایک فقرہ جانچ جانچ کر بولو۔ جب بات کرو تو پہلے یہ خیال کرلو کہ کوئی بات اخلاق سے نہ گرے اور کوئی حرکت بے جا نہ ہو۔ سوچ لو کہ کیا کہنا ہے بولنے میں گھبراؤ نہیں، بات کرنے میں جلدی نہ کرو۔ نہ اتنا زیادہ بولو کہ سننے والا اکتا جائے۔ بلاغت یہ ہے کہ لفظ تھوڑے ہوں اور معنی اور مطلب زیادہ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی حکیم سے سوال کیا کہ آپ مجھ کو ایسی بات بتادیں کہ نہایت آسان ہو اور مفید زیادہ ہو تو حکیم صاحب نے اتنے بڑے سوال کا صرف یہی جواب دیا کہ بھائی کم بولا کر۔ غرض یہ ہے کہ جتنا کہنا ہو اتنا کہو۔ لفظ دبا کر اور چبا کر نہ ادا کرو اور مطلب کی بات ادا ہو جائے۔ کوئی دقیقہ رہ نہ جائے، لہجہ نرم ہو۔ کیسا اچھا شعر ہے:

سخن بسیار دانی اندکے گو

یکے را صد مگو صد را یکے گو

جو لفظ زبان سے نکلیں پسندیدہ ہوں۔ سمجھ لو سمجھ ہی ایک ایسی نعمت ہے کہ کیسا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو لیکن سمجھدار کا ہی بول بالا ہے۔ جھوٹا کب کہتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں لیکن واقعے میں ہوتا ہے اور اس کی باتوں ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔ بس اگر کوئی جھوٹ بولے تو سمجھدار کا فرض ہے کہ خود سمجھ لے بولنے والے کو شرمندہ نہ کرے اور تم ایسا سچ بھی چار آدمیوں میں نہ بولو جس کا یقین چھ مہینے میں آئے۔

مثال کے طور پر حکایت:

ایک بادشاہ کا ذکر ہے کہ ایک روز شکار کھیلنا گھوڑے پر سوار ایک سبزہ زار سے گزر رہا ہے، اس زمانے میں بہار کا موسم ہے۔ درختوں میں شگوفہ پھوٹا ہوا نکلتا، جاڑا بری ہوئی مہاوٹ بھیگی بھیگی زمین دھلا دھلا نیلا نیلا آسمان، گرد و غبار بیٹھا ہوا اور میر شکار ساتھ ہے اس کے ہمراہ تمام جانور ان صید گیر مثل لگڑ جھگڑ، کوہی کو بیلا، جرا، باشا،

باشین، باز، بحری، بزحتی، چپک، دوتی، موسا، بہولی، یہ تمام جانور ان گلابی چشم و سیاہ چشم ان جانوران شکاری کو ہاتھوں میں لیے جنگل میں چاروں طرف پھیلے ہوئے شکاری کتے جن کی ڈوریاں کتے رکھنے والے ہاتھوں میں سنبھالے، سیاہ گوش والے سیاہ گوشوں کو گودیوں میں دبائے چیتوں کے تانگے کہ جن میں جوڑیاں گاوان گجراتی کی جتی ان پر چیتوں کے پلنگ بندھے جن پر چیتے بیٹھے اور آنکھوں پر ٹوپیاں، چیتوں کے چرمے چیتے والے چیتوں کے کمروں میں ڈوریاں ڈالے ہاتھوں میں لیے پلنگوں پر بیٹھے۔ ہرن دور ایک سبزہ زار میدان میں چر رہے ہیں، یہ تانگے سے ان پر داؤں کرتے چلے جاتے ہیں، بادشاہ سبزے کی سیر کرتا، وہ جنگل کے چتر دار اور گھنیرے درخت کہ جن کے فاصلے کا نظر فیصلہ نہیں کر سکتی چاروں طرف باغ کی صورت نظر آرہے ہیں اور میدانوں میں گیہوں کے سرسبز اور شاداب کھیت ان کی منڈیروں اور نالیوں میں پانی بہتا، جگہ جگہ چولاوے کوئیں چل رہے ہیں، بارہ ڈولوں کی سریلی آواز رین سروں میں ڈوبی ہوئیں دور دور سے آرہی ہیں بارہ ولائی بولال جھولا۔ ارے میرا لال سنائیلال جھولا اور گیہوں کے سبزہ زمردیں میں سرسوں کی نالیاں جن کی نازک نازک شاخوں میں سرسوں پھولی تھوڑا سا دن باقی ہے اور ایک طرف آفتاب پہاڑوں کی پست و بلند چوٹیوں کی آڑ پکڑ رہا ہے، بادل کے چھٹے چھٹے ٹکڑے مختلف رنگ کے جو برس کر ہلکے ہوئے ہیں اور شادوی انجم ہوا کی بلندی میں آفتاب کے گرد اتنے بطئی السیر ہیں کہ جن کی حرکت نظر محسوس نہیں کرتی ان پر ترچھی شعاعیں پڑ کر اچٹ رہی ہیں اور ان کا عکس جو پانی کی نالیوں اور رہٹوں اور چشموں اور تالابوں پر پڑ کر زمردیں فرش میں یاقوتی جدولیں اور نگینوں کا کام دے رہا ہے اور چتر دار گنجان درختوں کی نرم نرم زرد اور سبز و سرخ کونپلوں میں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ کسی کسی درختوں کی کونپلوں اور بلند چوٹیوں پر بیسیوں ڈیروں نے اپنے اپنے سریلے دم بول بول کر جنگل کو سر پر اٹھا رکھا ہے:

کہوں کیا سماں آخری روز کا
مسیحائی کرتی تھی واں کی ہوا
ہوا سے درختوں کا وہ جھومنا
وہ آپس میں شاخوں کا منہ چومنا
شعاعوں کی زردی وہ سبزے کا روپ
ملائم ملائم وہ دھانوں پہ دھوپ
بھلی لگتی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
غرض زندگی کا وہاں تھا مزا

اسی کیفیت و بہار میں بادشاہ وزیر سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے کہ وزیر نے بے سوچے عرض کی کہ جہاں پناہ

آب وہوا کا کتنا بڑا دخل ہے کہ یہی گیہوں کے پودے جو خدا کا ہزار ہزار شکر ہے اچھی حالت میں ہیں لیکن زمین سے دس بارہ گرہ سے زیادہ اونچے نہیں نمک خوار کے ملک میں اتنے بلند ہوتے ہیں کہ بالیں بلند سے بلند ہاتھی کی عماری سے اونچی آتی ہیں۔ بادشاہ نے یہ سن کر وزیر کی طرف سے منہ پھیر لیا وزیر کو یہ فقرہ کہہ کر سخت شرمندگی ہوئی سمجھا کہ میرا عرض کرنا حضور کو خلاف معلوم ہوا۔ اب بادشاہ شام کو شکار سے واپس آیا اور وزیر بھی اپنے گھر آیا لیکن یہ بات وزیر کے دل میں کھٹک رہی تھی اسی وقت ایک تیز رفتار سانڈنی سوار کو بلایا اور حکم دیا کہ دیکھو ہمارے وطن جاؤ اور وہاں سے چند گیہوں کے پودے بڑے سے بڑے نہایت احتیاط سے لمبے لمبے صندوقوں میں حفاظت سے بند کر کے لاؤ یہ سمجھا کر حکم دیا کہ بس اسی وقت چلے جاؤ۔ چناں چہ سانڈنی سوار، سوار ہو کر اسی وقت روانہ ہوا اور بعد طے منازل وزیر کے وطن میں آیا تو معلوم ہوا کہ ابھی گیہوں کے بونے کا زمانہ نہیں ہے یہ غریب کیا کرتا ٹھہر کر انتظار کرتا رہا۔ جب گیہوں بونے کا موسم آیا تو سانڈنی سوار نے نہایت عمدہ کھیت دریافت کیا اور ہر طرح سے پانی اور کھاد اور ہل سے زمین کو بنایا، جب گیہوں بونے کا وقت آیا تو اچھا نیا طاقت ور تخم لے کر اس کا امتحان کیا اور بو دیا۔ گیہوں کی کھیتی چھ مہینے کی ہے ٹھہرا رہا اور کھیت کی خدمت کرتا رہا جب گیہوں کے پودے تیار ہوئے تو اس سانڈنی سوار نے بڑے بڑے پودے معہ جڑ کے نہایت احتیاط سے صندوق میں بند کیے اور روانہ ہوا۔ جب وزیر کے پاس آیا تو وزیر سخت انتظار کر رہا تھا بہت خوش ہوا اور اسی وقت دربار جانے کی تیاری کی اور دربار میں حاضر ہو کر آداب بجالایا اور دعائے جاں درازی کو ادا کیا:

خسروا تجھ سا کوئی دوراں بہم پہنچائے تو
باب تخت سلطنت ایسا ہمیں دکھلائے تو
اس در دولت پہ یوں بوئے سلیماں آئے تو
اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو
زیب تاج و نگیں از گوہر والائے تو

خداوند کی عمر دراز ہو، اس روز نمک خوار نے جو عرض کی تھی کہ خادم کے ملک میں گیہوں کے پودے نہایت بلند ہوتے ہیں ملاحظہ ہو یہ عرض کر کے وزیر نے خود ہی بکس کھولے اور چند پودے نکالے بادشاہ نے ملاحظہ فرمایا تو فی الحقیقت جیسا وزیر نے عرض کیا تھا اس سے کہیں بلند پایا۔ اس وقت بادشاہ نے وزیر سے فرمایا کہ اے وزیر جو کچھ تو نے کہا ٹھیک ہے لیکن آدمی کو مناسب نہیں کہ چار آدمیوں میں بے سوچے سمجھے ایسا سچ کہے جس کا یقین ایک سال میں آئے انسان کو کہنا مناسب نہیں اور کوئی شخص اگر ایسا بے سروپا جھوٹ بولے کہ کل میں نے ایک عجیب تماشا دیکھا کہ ایک لدو بھینسا ایسے ریتیلے میدان میں کھڑا تھا جہاں پاؤں رکھنے سے ٹخنے تک ریت میں پاؤں اتر جاتا تھا

اور اس بھینسے کے پیچھے پچاس کراچیاں چوپہیہ جن کے پٹھوں پر نہایت پتلے لوہے کی دھوئیں چڑھی اور ان کراچیوں میں پچاس پچاس ہزار من لوہا لدا ہوا اور پچاس کراچیوں کو بھینسے والے نے اپنے اکیلے بھینسے کو جوت دیا۔ بھینسے کا یہ قاعدہ ہے کہ جب زور کرتا ہے تو زور کرنے میں کمی نہیں کرتا بخلاف بیل کے کہ بیل بوجھ کھینچنے سے کاندھے بھی دے جاتا ہے اور نہایت تیز چلنے والے دخانی جہاز کا انجن جس کے چار پہیے بڑے بڑے علاوہ چھوٹے پہیوں کے اکیلا لوہے کی سڑک پر کھڑا تھا اور اس وقت اتنا گرم تھا کہ انجن کے ڈھول سے زیادہ بھاپ خارج کر دینے والے نلوں سے جن پر نہایت سخت فنر لگا ہوا ہے جس کو انگریزی میں سیفٹی والو کہتے ہیں اس فنر کی کمانیوں کو اٹھا کر نکل رہے تھے اور انجن کا پانی تیز کھول رہا ہے جس کی آواز دور تک جا رہی ہے۔ اب انجن چلانے والے اور بھینسے والے میں یہ شرط ہوئی کہ پانچ سو میل ایک گھنٹے میں دیکھیں کہ پہلے کون طے کرتا ہے۔ چناں چہ انجن تو اپنی لوہے کی سڑک پر چلا اور بھینسہ صاحب پچاس گراں جھوں کو لے کر ریت میں دوڑے لیکن بھینسا کراچیوں کو لے کر پونے سات منٹ میں پانچ سو میل پہنچ گیا اور انجن صاحب بھینسے کے ساتھ ہی چلے تھے۔ نہ کہیں پانی لیا اور نہ کہیں ٹھہرے لیکن تیسرے روز بہ ہزار خرابی اور وہ بھی کہیں شام کو پہنچے۔ اب تم سمجھ لو کہ یہ امر محال عقلی ہے کسی طرح سے بھی نہ بھینسے کا اتنی سی دیر میں پہنچنا ممکن ہے اور نہ انجن کا اتنی دیر میں آنا لیکن تم بات کرنے والے کو سمجھ لو کہ وہ ذہن سے خالی ہے تم ہی اسے شرمندہ کر کے کیا کرو گے اور تمھارے ہی کیا ہاتھ آئے گا۔

زبان کا اثر جادو سے زیادہ تیز ہے بس اگر زبان کا ٹھیک استعمال نہ کیا جائے تو کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو جاہل سے بدتر ہے۔ سچ میں بظاہر شکست ہی سہی لیکن انجام میں فتح ہے لیکن تم صحیح جملے کو بھی بے سوچے سمجھے زبان سے نہ نکالو۔ بات کرنے میں یہ خیال رکھو کہ ہم کس سے بات کر رہے ہیں اور ہم کو کہنا کیا ہے لیکن یہ تمام باتیں بات کرنے سے پہلے سوچ لو تا کہ بات سننے والا بے تکان سمجھ جائے اور جو لفظ زبان سے نکالو اس کے معنی مشہور ہوں۔ جملے چھوٹے چھوٹے آسان اور معنی خیز ہوں۔ بے سوچے بولنے سے تم کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی اور بدزبانی سے تو سننے والے اور کہنے والے کا مزاج گرم ہو جائے گا جب ہر وقت گرمی بڑھے گی تو رطوبتیں خشک ہوتی جاتی ہیں سوداوی امراض جو اکثر اٹل ہوتے ہیں پیدا ہو جائیں گے جب صحت خراب ہوگی تو نسل خراب ہوگی اور اگر اب بھی بدزبانی کو نہ روکا گیا تو حالات تو خدا کا شکر ہے بدلتے چلے ہیں عجب نہیں کہ صورتیں بھی بدلنے لگیں اور آخر زادون کے خیال کے مطابق پھر وہی کیڑے بن کر رہنا ہو جائیں گے اور پھر بدزبانی کا چٹخارہ کہیں تم کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ اس واسطے ہم کو اب تو مناسب ہے کہ بات کرنے کے طریقے سیکھیں وہ لفظ زبان سے نکالو جو تلے ہوئے ہوں، غلطی سے پاک ہوں، بیساختہ ہوں، آگے پیچھے نہ ہوں۔ یہ کلیہ ہے کہ عورت ہو یا مرد بچہ ہو یا بڑا جس نے کہنا مان لیا اور ہمیں کہنا سن کر سمجھنے اور کہنے کو بھی بشرطیکہ وہ کہنا نیک ہو مان لینے کی عادت ہو گئی ہو بس وہ محکوم نہیں دنیا میں حاکم ہے:

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

مجھ کو تو سخت افسوس ہے کہ جس زبان پر دلّی والوں کو ناز اور کچھ بے جا ناز نہ تھا۔ دلّی کی خوبیاں باعتبار تقسیم اقالیم اور جائے وقوع کے بہت زیادہ ہیں۔ شرح چغمنی میں صاف لکھا ہے کہ دلّی سے وہ خط جو دوسری اور تیسری اقلیم کی تقسیم کا ہے خاص شاہجہاں آباد سے گزرا ہے اور دلّی خط استوا سے ۲۳ درجے ۳۰ دقیقے اور ۷ ثانیے پر واقع ہے جتنا کعبے جیسی متبرک جگہ کا بھی اتنا ہی ہے اب دہلی میں خاص خوبی کیا ہے وہ یہ ہے کہ دہلی مائل تو حرارت کی طرف ہے اور ملی ہوئی اقلیم معتدلہ سے ہے۔ چناں چہ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ دلّی کا پیدا ہوا لڑکا جو پانچ برس میں تعلیم حاصل کرے گا ٹھنڈے ملک کا دس برس میں۔ دلّی گرم ہے اور حرارت کی خوبیاں تو اتنی ہیں کہ میری تو زبان بھی خشک ہو جائے اور ایک خوبی کو بھی تمام نہ لکھ سکوں گا۔ آپ زیادہ فکر کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں آج کل تو گھر گھر بجلی ہے۔ کسی مدرسے کے ایک کمرے میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کو جس کا علم نہ ہو جس وقت سبق ہو رہا ہو اتنی دیر کے واسطے آپ اس کمرے میں برقی رو داخل کر دیجیے جب امتحان ہوگا تو جس کمرے میں برقی رو داخل کی گئی ہے سب سے زیادہ اس جماعت کے طلبا کامیاب ہوں گے اور دلّی میں تو قدرت ہر وقت یہ عمل کر رہی ہے۔ اب دلّی کے واقعات پر نظر ڈالیے تو تمام راجاؤں نے دلّی ہی کو کیوں پسند کیا اور راج دھانیاں بنائیں اور اب مسلمان آئے تو انھوں نے بھی اسی پرانی کھوسٹ کو دارالخلافہ قرار دیا۔ آپ دور کیوں جائیں اس وقت تو سلطنت برطانیہ جس کا قریب قریب تمام دنیا پر راج ہے اس کو بھی یہی شہر پسند آیا اور نئی دلّی کے نام سے تاج و تخت کی جگہ قرار دی۔ دلّی کچھ ایسے مقام پر واقع ہوئی ہے کہ تمام ہندوستان کا کم و بیش مرکز ہے اور محیط کا وجود ہی مرکز سے ہوتا ہے دائرے میں تو حرکت متدیرہ ہے لیکن سکون مرکز ہی میں میسر آتا ہے اور ہر شے سکون کی طالب ہے اس وجہ سے سب کا دل اسی طرف کھچا اور کھنچتا ہے اور کھچے گا اور سکون کا اثر آخر میں کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اب دلّی کی اردو زبان دلّی کے واسطے اچھی اور ہونہار ہے۔ بینے ٹھنڈے ملک کے رہنے والے بوجہ سردی کے ان کے گلو اور تار آواز ذرا سخت ہوتے ہیں ایسے مقامات کے رہنے والے جب تک گلے کو جھٹکا نہ دیں گے تلفظ ادا نہیں کر سکتے اور دلّی والوں کے گلو نہ خط استوا والوں کی طرح سے زیادہ سریع الحرکت ہیں اور نہ ٹھنڈے ملک کے رہنے والوں کی طرح ٹھوس ہیں بیچ میں ہیں ذرا سے اشارے میں کیسا ہی تیز حا تلفظ ہو فوراً ادا کر سکتے ہیں اسی وجہ سے تمام زبانوں سے اس زبان میں خاص خوبی ہے کہ کسی زبان کا لفظ ہو اور کیسا ہی نازک کیوں نہ ہو اردو اس کو جوں کا توں رکھتی ہے اور غیر زبان کا لفظ بھی اردو زبان میں آکر جلد گھل مل جاتا ہے اور اوپرا تا نہیں اوپرا نہیں معلوم ہوتا اور بڑی بات تو یہ ہے کہ اردو کی ماں سنسکرت اور باپ عربی ہے اور تمام دنیا کی زبانیں انھیں دونوں زبانوں کی

قریب یا دور کی رشتے دار ہیں اور یہی اردو کے ماں باپ اور زبان ان ہی دونوں زبانوں کی سب سے چھوٹی اور بڑھاپے کی اولاد ہے، ایسی ہی اولاد نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے اور چھوٹے بچے پر ماں باپ تو ایک طرف غیر بھی توجہ کرتے ہیں اور خاص محبت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو جس زبان کی پونجی چاہتی ہے اس کو اپنے تصرف میں لے آتی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ ابھی اس بچے کی تعلیم ناکافی ہے لیکن ہونہار ہے اور مثل مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان بہت جلد اس ملک کے واسطے سرمایہ دار بن کر رہے گی اور ضرور بن کر رہے گی۔ پیدا ہوتے ہی حیدرآباد کی گود گئی اور اب ۷۵ء کے بعد جو اس پر چتا پڑی اور اس کی آوارگی انتہا کو پہنچ گئی تو اس وقت بھی شاہ دکن عثمان علی خاں بہادر نے مرحمت خسروانہ سے اس کی پرورش شروع کی اور گرتے گرتے سنبھال لیا خدا شاہ دکن کی عمر اور دولت اور اقبال میں روز افزوں ترقی فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اردو کا ڈھچر

اردو کی اب جو حالت ہے اور حلیہ ملاحظہ ہو میرے محلے میں میاں شبو کارخانے دار رہتے ہیں وہ اپنے گھر آ رہے ہیں اور میں بازار جا رہا ہوں راستے میں ملے صاحب سلامت ہوئی میں نے دریافت کیا میاں شبو آپ کا مزاج کیسا ہے میاں شبو نے فرمایا میاں مجاز کیا آج کل تو بڑی حرقت میں جان ہے۔ کام تو کچھ ہو گیا ہے سب کرخنداروں سے خرفت اٹھائی تاخ کی پڑتی ہے۔ کل شکار کو گیا تھا اب آپ کے اگاڑو تا محروم کھڑا ہوں وہیں جنگا کام کو جاتا ہوں گھر کی بیگم صاحب کی زبان سے ناک میں دم ہے ادھر دونوں لونڈوں السیف اور اشاق اور دونوں لونڈیوں گپو اور عنوں نے اس تریوں۔ سے اور خب صورتی (خوبصورتی) سے جلا رکھا ہے میں حریان ہو گیا ہوں۔ اتنے میں میاں اسحاق کارخانے دار کے بیٹے ننگے سر ننگے گلے ننگے پاؤں پھٹی ہوئی اور لیریاں لگی ہوئی جانگیا پہنے بھٹے کی گلی کالا لٹو سر کے گرد پھراتے آ رہے تھے کہ میاں شبو نے آواز دی اَبے او بے اشاق ذلدی ورے آ اور دیکھیو ذلان میں چھوٹا تاخ ہے تا اس میں افورہ اور چکو ہے اور سب تا واں ہی میں ہے واں سے تا واں لے لے اور بھنو قصائی سے اخنی کا گوش لیجیو وہ جو مست کے پچھاڑو کے تلے والی دکان ہے تا وی سے لیجیو۔ مجھے ذخام ہے اور دسو کے برو بر تمباخو والا جو ہے وسے کڑوا تمبا کو جو نخالس ہو لائیو جو مات دل ہو ذرا اتفادے سے اور وہ جو دروذ قبوتر والا ہے وسے کہیو اب تو بڑی حریان گئی ہو چکی یہ سب کام ذلدی کر کے آئیو اور ایسا نہ کیا کرو کہ تم لمڈوں کے ساتھ چغندیں اوڑاؤ۔

اے دلّی میں آ کر بسنے والوں بس اب آپ اردو کو بہت لتاڑ چکے اب اس بے بس اور بے کس لاوارثی زبان کو سنبھالو نہیں تو بگاڑ دو بھی تو نہیں۔ یہ سب درست ہے کہ اب تم ہی دلی والے ہو اور زبان بھی تمھاری ہی ہے

جب نظر فریب لفظ اردو میں موجود ہیں تو دیدہ و زیب کی کیا ضرورت ہے یا لفظ نظر فریب دیکھتے دیکھتے ایسا خراب اور بے معنی ہو گیا کہ اس کی جگہ نیا لفظ گھڑنا پڑا۔ جتنی کتابیں اردو زبان میں لکھی جاتی ہیں وہ سب دلّی کی زبان کا اتباع کرتے ہیں۔ میں "جیر" یہ ہوں کہ زبان زندگی میں اتنی ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی کام ہی نہیں چلتا اور زبان کے درست کرنے میں تو جلدی گئے نہ پچھڑی یہ بات ذرا سی توجہ کے قابل ہے اور کچھ نہ کرو تو صرف اتنا ہی کرو کہ جو جو صاحب دلّی کے ہیں اور لوگ ان کی باتوں کو پسند کرتے ہیں تم بھی ویسے ہی محاورے بولو۔ اس واسطے میں نے اپنی سمجھ کے موافق یہ چھوٹا سا رسالہ لکھ دیا ہے اگر ملک نے اس کی قدر کی تو پھر انشاءاللہ فن تقریر پر کامل بحث کروں گا۔ مجھ میں کوئی خاص بات تو نہیں کہ مجھ کو فخر ہو ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں نے دلّی والوں کو بولتے، بات کرتے سنا ہے اب جو شخص بے موقع بات کرے تو جھوٹ بولنے والے کے دماغ کی قوت کسی وقت حاضر نہیں ہوتی کیوں کہ یہ قوت سے کام ہی نہیں لیتا اس وجہ سے بیکار رہ کر نکمی ہو جاتی ہے اور بچپن کا بولا ہوا جھوٹ تو دماغ کو سن کر دیتا ہے اور صاحب دماغ کو کسی مشورے کے متعلق پھر سچا مشورہ نہیں دیتا یا گالی کی عادت ہو تو بس تم اس کو سمجھ لو کہ اس کی طینت خراب ہے کیوں کہ کسی کی جب تک طینت خراب نہ ہو گی اس وقت تک تو ایسے لفظوں کا زبان سے نکلنا دشوار ہے اور جو بدسرشت ہے اس سے بھاگو کہ اس سے بات کرنے میں بھی گھاٹا ہے اور کچھ نقصان نہ سہی تو آپ کی زبان خراب ہو ہی جائے گی بس ایسے سے پناہ مانگو، دور بھاگو اللہ بچائے خدا ایسے کا پڑوس بھی نہ دے۔ میں نے پانچ پڑوس میں ایسوں ہی کا حال لکھ دیا ہے آپ ضرور دیکھیں اور اللہ ہمارے بچوں کو بچائے کہ بچپن میں بچوں کی لوح دل صاف ہوتی ہے اور بری باتیں سہل ہوتی ہیں اور انسان سہولت کی طرف جلد متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ ہر سہولت کے تحت میں معصیت ہوتی ہے۔ یہ مانا کہ ریل میں سوار ہو کر دلّی سے کلکتے کا جانا نہایت سہل ہے لیکن چار انگل کی لوہے کی پٹری اور چار روپیہ ماہوار والے کے ہاتھ میں ہزاروں لاکھوں کی جان ہے۔ جو یہ نہیں جانتا کہ آدمی جتا کیوں کر ہے اور ہوتا کس قیمت کا ہے۔ دنیا میں انسان ہی قدرت کی خاص صنعت ہے جب خدا کسی ملک یا قوم کے دن پھیرتا ہے تو نہ چیک کا ٹتا ہے اور نہ مٹی آوذ روانہ فرماتا ہے بلکہ آدمی پیدا کر دیتا ہے۔

اے اردو زبان جاننے والوں تمھارے سارے کام اردو بولنے پر موقوف ہیں ذرا سی محنت کر لو پھر دنیا میں تم ہی تم ہو:

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ	جو دنیا میں کرتے ہیں محنت زیادہ
اسی میں ہے عزت خبردار رہنا	بڑا دکھ ہے دنیا میں بیکار رہنا
بڑائی بشر کو اسی سے ملی ہے	نکمی جو گزرے وہ کیا زندگی ہے

حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں — اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں
جہاں میں اگر کیمیا ہے تو یہ ہے — غریبی کی دکھ کی دوا ہے تو یہ ہے
نہیں کرتے دنیا میں نادان محنت — جو سمجھیں تو سونے کی ہے کان محنت
میری جان غافل نہ محنت سے رہنا — اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

اردو کا لہجہ تمام زبانوں سے خاص ہے۔ سردار مرزا صاحب مرحوم میرے عنایت فرما میرٹھ کے رہنے والے نہایت تعلیم یافتہ ایک روز مجھ سے ملے اور فرمایا کہ میرے ایک میرٹھ کے رہنے والے ولایت بغرض تعلیم تشریف لے گئے تھے جب ولایت سے واپس آئے تو میں اور وہ گھڑ دوڑ میں گئے وہاں اتفاق سے ایک یورپین صاحب جو تازہ ولایت سے آئے ہوئے معلوم ہوتے تھے ایک طرف سب سے الگ خموش کھڑے تھے، سردار مرزا صاحب کے دوست نے سردار مرزا صاحب سے کہا کہ میں ان صاحب سے جا کر باتیں کرتا ہوں جب میں باتیں کر کے الگ ہو جاؤں تو آپ جا کر دریافت کریے گا کہ جناب یہ صاحب جو ابھی آپ سے باتیں کر کے گئے ہیں جناب کو تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ صاحب کہاں کے رہنے والے ہیں غرض یہ صاحب ان تازہ ولایت کے پاس گئے اور کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے اس کے بعد الگ ہو گئے صاحب نے جواب میں فرمایا کہ میں پہلے تو یہ سمجھا تھا کہ یہ صاحب فرانس کے رہنے والے ہیں پھر ان کے لہجے نے بتایا کہ نہیں یہ جرمن ہیں پھر اثناء گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ انگلینڈ کے ہیں، کبھی کسی اور جگہ کا خیال گزرا غرض کہیں کے ہیں مغرب کے رہنے والے، یہ سن کر سردار مرزا صاحب نے کہا کہ نہیں جناب یہ تو ٹھیٹھ میرٹھ کے باشندے میرے ہم جماعت ہیں ہاں ولایت تعلیم کے واسطے گئے تھے اور اسی ہفتے میں آئے ہیں یہ سن کر صاحب نے فوراً کہہ دیا کہ کوئی سند نہ پائی ہوگی سردار مرزا صاحب نے جواب دیا کہ بیشک سند وغیرہ تو نہیں ملی صحیح گئے سلامت آئے۔

یہ مثال اس واسطے لکھی کہ دہلی اور دہلی کے اطراف کے گلوں کی ساخت خاص ہے اور اردو زبان کے واسطے مختص ہے۔ اگر یہاں کے رہنے والے تھوڑی سی بھی توجہ زبان کی طرف فرمائیں تو یہ زبان نہایت ضروری ہے اور ہمارے کل کام اسی زبان پر موقوف ہیں۔ اگر انسان زبان پر قادر ہو تو ایسے آدمی کو ہر وقت تفریح ہے اور مگن رہتا ہے۔ جھوٹی تفریح کے واسطے لوگ بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں اور پھر تفریح کی تلاش میں ہزاروں طرح کے نقصان اٹھاتے ہیں اردو زبان ابھی تک تو یہاں کے رہنے والوں کے واسطے بہت آسان ہے کیوں کہ دنیا کی زبانیں اکثر قدیم تجربے کار اور سرمایہ دار ہیں اور اردو زبانوں کے سامنے ایسا طفلِ مکتب ہے کہ جس نے ابھی قاعدے کو بھی نہیں سیکھا اور سیکھنا تو ایک طرف ابھی ہاتھ تک نہیں لگایا لیکن پیدائشی ایسی اچھی صورت لے کر دتی میں

قدم رکھا ہے کہ جو اس کی صورت پر نظر ڈالتا ہے سمجھ لیتا ہے کہ ہونہار ہے، ذکی ہے، ذہین ہے گو یہ زبان ابھی طفل مکتب ہی سہی لیکن جو کچھ اس کو دے دو اس کو نہایت سنبھال کر رکھتی ہے اور وقت پر کام میں لاتی ہے اور جو کچھ سمجھا دو اسے بھولتی نہیں۔ جس وقت بات کرنے والا سننے والے کو سمجھا دیتا ہے تو سمجھانے والا بھی خوش ہو جاتا ہے اور سمجھنے والا بھی اپنی معلومات کو بڑھا کر ہمیشہ کے واسطے خوشی مول لے لیتا ہے لیکن حقیقی تفریح کا اندازہ دوسرا تو ایک طرف وہ خود بھی نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے میری اپنے شہر والوں سے یہ عرض ہے کہ ہزار کام چھوڑ کر پہلے بات کرنی سیکھیں اور بات کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ میری بات کس کو کڑوی تو نہیں معلوم ہوگی۔ اکبر کے خان خاناں یعنی کمانڈر ان چیف کا دوہا کیسا مثال کے قابل اور کیسی اچھی تشبیہ کی ہے:

کیرا سروں کاٹیے بھریے نیک بنائے
جس کڑوے مکھن کو ہوت یہ ہی سجائے

عقل کا فعل یہ ہے کہ کہنے والے کا علم صحیح سننے والے کو ہو جائے اور سچ پوچھو تو عقل کی حقیقت ہی کلام ہے۔ بس اگر کلام نہیں تو عقل جیسا جوہر لطیف اور وہ کیسا جوہر کہ اللہ جس پر کرم کرتا ہے اس کو عقل ہی عنایت فرما دیتا ہے بس اب اس جملے کو دل میں جگہ دو کہ اگر عقل ہی بیکار ہے تو پھر یہ کامل مخلوق یا خلیفہ خدا دنیا میں کس گوں کا ہے۔ ہر زبان میں ایک خاص جوہر ہوتا ہے کہ جس کے مزے صاحب زبان ہی لے سکتا ہے مجھے تو کہ میں جاہل ہوں اب تک یہ بھی نہیں سمجھا کہ دلی والے کے قول کے مطابق لفظ زبان ہے یا زبان یا جبان ہے مگر اتنا ضرور سمجھے ہوئے ہوں کہ اردو میں اور تو جو کچھ ہوگا وہ تو دلی والے ہی اہل زبان ہیں وہ سمجھیں لیکن یہ تو میں رات دن دیکھ رہا ہوں کہ اردو ہر زبان کی پونجی کو اس طرح سے لے لیتی ہے جیسے اس کے باپ ہی کا مال ہے۔

مثال:

بہادر شاہ بادشاہ، ان کی سلطنت آکھڑی چینٹ تخواہ دار بادشاہ لیکن بڑوں کی لاج کو سنبھالے (سنبھالے) ہوئے تھے۔ لال قلعے میں مہتاب باغ کہ جس کو محمد شاہ جیسے رنگیلے نے درست کیا اور محمد شاہ ہندوستان میں عیش کا مرکز تھا کہ تین سو ساٹھ عیش ہر وقت اس مرکز کے تصدق اور بلا گردان تھے اب جناب اس باغ کی بہار کو زیر نظر رکھ کر ملاحظہ فرمائیں کہ وہ باغ کیسا باغ ہوگا جس کا جل تھل اب تک اس بہار کی یاد میں پتھر کا کلیجہ کیے آج کل کے ہموار سبزے کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اسی باغ میں ایک درخت تھا پاکھر نام جس کا پھل حکیم احسن اللہ خاں صاحب جو ۱۸۵۷ء سے پہلے بہادر شاہ کے وزیر تھے ان کے ہاں میں نے خود اچار دیکھا ہے ویسا درخت نہ ہندوستان میں تھا نہ اب ہے۔ ہاں علم نباتات جاننے والوں کے آگے یہ کچھ بات تعجب کی نہیں یہ بنائیں تو ہر قسم کا پھل جیسا چاہیں چشمہ، پیوند، قلم، بندھ وغیرہ کے اصول سے بنا سکتے ہیں لیکن اس وقت تک تو نہیں تھا اب اور سنیے

اسی باغ میں وہ وہ دیسی آم تھے کہ جن کو کھا کر قلمی آم والوں کا جی چاہتا تھا کہ قلمیں توڑ دیں چنانچہ محمد شاہ نے ایک آم ایسا بنایا تھا کہ جس کا نام سیفہ آم تھا اور اس کا پھل بڑا، نہایت خوش رنگ، اچھی خوشبو، بے ریشہ، پتلا رس چھلکا پتلا غرض ہر طرح سے نظر فریب اور ہر شخص کا جی للچا دینے والا آم تھا۔ محمد شاہ کو جس سردار سے مذاق منظور ہوتا تو دسترخوان پر اس آم کے واسطے حکم ہوتا ہے کہ سیفہ آم لاؤ۔ اب کھانا کھانے کے بعد محمد شاہ نے جس سردار کو وہ آم دیا تو اس سردار کی مجال ہی کیا تھی کہ انکار کرے اور محمد شاہ کے حکم سے فوراً اس سردار نے آداب بجایا اور تندروی اور ادب سے بیٹھ کر کھایا بس اس آم کی قاش ساری کھائی تو رہی ایک طرف اگر معدے میں جب تک اس آم کا ایک ٹس بھی باقی رہتا تھا تو اس سردار کو برابر دست جاری رہتی تھی۔ غرض بہادر شاہ تک بھی مہتاب باغ میں ایسے ایسے خاص آم تھے کہ جس کا جواب ہی نہ تھا۔ بہادر شاہ کا قاعدہ تھا کہ ان آموں میں جب سے مور آتا اور کیری بیٹھتی تو بہادر شاہ ان کیریوں کو گن گن کر دن کاٹتے تھے اور ہر وقت پہرہ بیٹھا رہتا تھا۔ ایک روز مرزا فخرو ولی عہد بہادر اب یہ جوان ہیں مہتاب باغ میں ان خاص آموں کے قریب تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے کچھ پکے کچھ گدرائے ہوئے کچھ کچی کیریاں توڑیں گو سپاہی پہرے پر تھے لیکن کسی کی کیا مجال جو بڑھے بادشاہ کے ولی عہد کو روکے غرض ولی عہد تو آم کا ایک ٹوکرہ بھر کر اپنی ولی عہدی کے مکان میں تشریف لائے اور پہرے والوں کے جمعدار نے فوراً پرچہ گزارا، حضور کو نافرمانی پر غصہ آیا حکم ہوا کہ ولی عہد کو بلاؤ۔ ولی عہد حاضر ہوئے بادشاہ نے غصے سے فرمایا کہ دے بھئی اماں (بہادر شاہ جب کسی سے بات کرتے تھے تو پہلے دے بھئی اماں فرماتے تھے) یہ آم تم نے کیا سمجھ کر توڑے مرزا فخرو نے بے تکلف عرض کیا کہ حضور اپنے باپ کا مال سمجھ کر توڑے، اب کس کو مجال دم زدن تھی جو کچھ بولتا۔ بس اردو کا بھی یہی حال ہے کہ جس زبان کا لفظ چاہتی ہے لے لیتی ہے اور کسی کو بات تک کرنے کا موقع نہیں ملتا کتنے کام کی زبان ہے:

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اے اردو جاننے والوں تم بھی دنیا کے میدان میں آؤ اور کچھ کر دکھاؤ۔ میں اپنے کم مایہ ہونے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے رسالوں میں باتوں کی باتیں انشاء اللہ پیش کرتا رہوں گا۔ بات اس طرح کرو جیسے شطرنج کھیلنے والا کئی کئی چالیں پہلے سے سوچ کر چلتا ہے ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ اچھا شاطر وہی مانا جاتا ہے کہ جو پہلے سے اپنی چالیں اور دوسرے کا جواب سوچ لیتا ہے۔ بس اگر ہم بساط کلام کے شاطر بن جائیں تو پھر کرامات دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ کچھ ہیں اور معنی کچھ لیے جاتے ہیں جیسے پرنالہ چل رہا ہے، موری بہہ رہی ہے۔ نہ موری بذات خود بہتی ہے نہ پرنالہ اپنی جگہ سے چلتا ہے بلکہ اس بیان سے پانی بہنا مقصود ہوتا ہے ورنہ لفظوں میں تو بیان کچھ ہے اور واقعہ کچھ ہے۔ غرض اس ڈھب سے بات کرو کہ سننے والا باتوں باتوں میں سمجھ لے۔

یہ سوچ لو کہ کلام دوسرے کے سمجھانے اور فائدہ پہنچانے کے واسطے بولا جاتا ہے لیکن نسبت کا خیال رہے کہ ایک کلام کو دوسرے کلام کے ساتھ نسبت ہو۔ یہ کوشش کرو کہ جو شے بیان کر رہے ہو اس کی صورت سننے والے کے ذہن میں آ جائے لیکن اس شکل کو پہلے تم خوب اپنے ذہن میں سمجھ لو۔ اس واسطے مناسب ہے کہ بولنے بات کرنے کے طریقے سیکھیں اور دوسروں کے واسطے نہیں تو ہم کو اپنی سمجھ کے موافق ایسا اپنے واسطے قانون مقرر کرنا مناسب ہے کہ جس سے ہم کو ہر معاملے میں کامیابی ہو، مبالغے سے بچو کہ یہ شرمندہ کر ہی کے چھوڑتا ہے۔ قسم نہ کھاؤ کہ یہ تو دھوکا دینے کے واسطے کھاتے ہیں جو فصیح اور بلیغ ہیں ان کے واسطے بیجا قسم کھانا عیب۔ سچ بولو یہ بات کرنے والے کے واسطے بڑا جوہر ہے اور زندگی اسی سے سدھر جاتی ہے۔ جھوٹ بولنا تو عقل کے خلاف ہے۔ جھوٹ وہی بولے گا جس کو عقل نہ ہو اور جاہل ہو یا جس کا نفس مردہ ہو۔ یا نکما ہو یا عقل اسے چھو کے بھی نہ نکلی ہو۔ جھوٹے کے دماغ میں عقل کو دخل ہی نہیں۔ یا جھوٹ وہ بولے گا کہ جس کے کلام میں اثر نہ ہوگا یا عادت خراب ہوگی۔ جھوٹ وہ ہے کہ جس کے معنی نہیں، جھوٹ بدتر عیب ہے۔ کلام میں جھوٹ مکار بولتے ہیں یا جس کی عقل میں فتور ہے یا نیک و بدکی تمیز نہ ہو یا خلقت خراب ہو۔ انسان میں ایک عیب ہو تو ناقص ہے اور جھوٹا تو تمام عیبوں کا مجموعہ ہے۔ جو جھوٹے کی بات کا اعتبار کرے تو وہ نقصان سے محفوظ نہیں رہتا۔ بڑوں نے خوب کہا ہے کہ جھوٹ دس گھر لے کر ڈوبتا ہے۔ ضلع جگت پھبتی یہ پھکڑ میں داخل ہیں، یہ زبان کی قوت نہیں عیب ہے کیوں کہ اس میں زبان کے واسطے قید ہے اور قید عیب ہے۔ اتنا معلوم ہو جانے کے بعد زبان کا بناؤ اور بگاڑ تمھارے ہاتھ ہے۔ اگر انسان بولنا نہیں جانتا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اندھیری رات میں بے چراغ کا مکان اور جو بولنا جانتا ہے تو وہ مثل چراغ کے ہے۔ ہر شے کے واسطے موزوں ہوتا ہے۔ بات کرنے کے واسطے آدمیت درکار ہے۔ عود را گر بو نباشد ہیزم است۔ غور کرو جب تک خیال نہ کرو گے تم اس وقت تک اہل نہیں بن سکتے۔ بات کرنے میں بڑی بات یہ ہے کہ وقت کی حالت کے موافق ہو۔ جو بات ہو دل کش ہو اور مطلب ہاتھ سے نہ جائے۔ بات تچی ہو اور خوبی تمھاری عقل کی یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے فقرے معنی خیز ہوں، ضرورت کے موافق ہو، تلی ہوئی نہ کم نہ زیادہ جو سننے والے کی سمجھ میں آ جائے اور سننے والا معنی سمجھتا جائے اور معنی کا سمجھنا کہ سننے والا سمجھا یا نہیں سمجھا یہ بات تو تم اس کی حالت سے سمجھتے جاؤ گے اگر ذرا بھی غور کرو گے تو مشکل بات نہیں۔

آواز نہ بنا، لے نہ پیدا کرو، بیجا کوئی حرکت نہ ہو اور لطیف اشارہ ہو تو مضائقہ نہیں کیوں کہ اشارات سے بہت دور کے معنی سننے والے کے جلد سمجھ میں آ سکتے ہیں مثال: مثلاً آپ نے زبان سے تو یہ لفظ فرمایا:

صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

یہ تو زبان سے کہا اور اپنی ایک آنکھ بند کر لی اور ہاتھ سے بند آنکھ کی طرف اشارہ کیا گو لفظ تو بے عیب بتا رہے

ہو لیکن صنعتِ عنادیہ سے یہ ظاہر ہوا کہ جس شخص کو قاتل بے عیب بتا رہا ہے بے عیب نہیں بلکہ واحدالعین ہے۔ طرزِ تکلم اور ادائے بیان کا خیال رکھو اور جب کوئی فقرہ زبان سے نکالو اول تو ہر جملے کو الگ الگ کر کے کہو اور یہ خیال کرو کہ میں بکواس کر رہا ہوں، بلکہ سمجھا کر اور یہ کوشش کرو کہ وہ سمجھ جائے اور شرط یہ ہے کہ سننے والے کی سمجھ کے لائق ہو، بڑے بڑے لفظ عربی فارسی کے جو غیر معروف ہوں وہ زبان سے نہ نکالو، ہتلاؤ نہیں، ہکلاؤ نہیں تکیہ کلام بھی کلام میں عیب ہے۔ لفظ کو جھٹکا نہ دو۔ کلام میں مبالغہ سخت عیب ہے۔ مبالغے کے ساتھ کیسی ہی سچی بات ہو جھوٹی معلوم ہوگی۔ بات کرنے میں چہرہ مطابق کلام کے ہو۔ اگر خوشی کی بات ہے تو اپنے چہرے پر مسرت کا اظہار ہو اور رنج ہو تو چہرے پر بھی ملال کے آثار پیدا کرلو لیکن مقتضائے وقت نہ یہ کہ مثل نقالوں کے حرکات پیدا ہوں غرض اس سے میری یہ ہے کہ بطور کنایہ ہوں کہ سمجھنے والا سمجھ لے اور وہ تمام باتیں تمھاری عقل اور قدرت کے موافق ہوں اور بولنے کا ڈھب پیدا کرو جو بات کرنی آسان ہو۔ غرض بات کرنی آسان تو ایسی کہ بچہ بھی بولتا ہے اور مشکل اتنی کہ اکبر جیسا با اقبال اور حوصلہ مند، بارعب بادشاہ بات کرنے میں تھرا گیا اور بات نہ کر سکا۔ باتوں ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کے جتنے کام ہیں سب سنبھل سنبھل کر سمجھ کر کرو اور دتی والوں اور اردو جاننے والوں سے میری یہ التماس ہے کہ پہلے اردو پر قناعت کرنا سیکھو پھر خدا تمھاری مدد کرے گا بطور مثال ایک قصہ جو قریب قیاس ہے عرض کرتا ہوں۔

حکایت:

اگلے زمانے میں ایک بادشاہ تھا اور اس کے دو لڑکے جو نہایت ہوشیار جوان تھے بڑا بیٹا جو لائق سلطنت نہایت پھرتیلا ذکی الحس، لہو و لعب کی طرف رغبت اور چھوٹا نہایت منکسر المزاج، فروتنی کی عادت دنیا کے دھندوں اور لذتوں سے لاپروا۔ بادشاہ کو چھوٹے لڑکے سے بہت محبت تھی۔ دونوں بچوں کی عادتوں اور حرکات پر نظر ڈالتا رہتا تھا۔ بادشاہ کو ایک روز خیال آیا کہ سلطنت چھوٹے کو دوں تو دنیا کے دستور کے خلاف بڑے کو دوں تو ناتجربہ کار جب تک تجربے کی منزل طے نہ کرے گا تب تک ٹھوکریں کھائے گا اس میں معلوم نہیں کہ سلطنت کا کیا حال ہوگا اور اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ غرض ان تمام باتوں پر نظر ڈال کر بادشاہ نے ایک بڑا چوبچہ بنوایا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہاں خزانہ رکھا جائے گا۔ جب چوبچہ تیار ہو گیا تو وہاں پہرہ مقرر کیا اور سب سے چھپوا اس میں پتھر بھروا کر چوبچہ کو بند کیا اسی طرح سے اپنے ملک کی سرحد پر ایک مکان نہایت چھوٹا سا تنگ اور تاریک اور اتنا مختصر کہ ایک آدمی بھی مشکل سے رہ سکے اور اس مکان کا نام گوشہ قناعت رکھا۔ بادشاہ مر گیا بڑا بیٹا تخت پر بیٹھا بس اب کیا تھا خوشامدیوں نے آ کر گھیر لیا رات دن گل چھرّے اڑنے لگے۔ خوشامدی دنیا میں نہایت بے غیرت نکما کم ہمت ہوتا ہے اور خوشامدی پاس چند لفظ ہوتے ہیں انھیں کے ہیر پھیر میں، جس کا نمک کھاتا ہے اس کو دھوکا دیتا ہے اور جیب خالی کر دیتا ہے خیر جب تک بھی مضائقہ نہیں یہ کمبخت تو جواہر خانہ دماغ جو قدرت کی بے بہا دولت ہے اور ایسا چلتا

ہوا سکے ہے کہ کبھی رکتا ہی نہیں اس کو بند لگا دیتا ہے۔ غرض سامان نشاط مہیا ہو گئے سلطنت میں کچھ ہو بادشاہ کو کیا۔ اب چھوٹا بھائی جو سلام کو آتا ہے اس کا آنا بھی ناگوار گزرتا ہے آخر حکم دے دیا کہ ان سے کہو کہ تم شہر سے نکل جاؤ کہ تم شہر میں رہنے کے قابل نہیں۔ شاہی حکم یہ غریب کیا کرتا شاہی نظر بدلی ہوئی دیکھ کر جو اپنے تھے وہ بیگانے ہو گئے، مال و اسباب لٹ گیا یہ کیا کرتا ایسی حالت میں کہاں جائے غرض اسی گوشہ قناعت پر نظر پڑی غنیمت سمجھا اور تنہا بسر کرنے لگا۔ یہاں بادشاہ کی غفلت سے ملک میں اندھیر مچا۔ ایک بادشاہ نے لشکر کشی کی اس نے مقابلہ کیا خزانہ خالی ہو گیا تو خیال آیا کہ جو بچہ بھرا ہوا ہے اس کو کھولا تو پتھر نکلے شکست ہوئی اور چھوٹا بھائی جو گوشہ قناعت میں رہتا تھا اس تنگ مکان سے تنگ آ کر چاہا کہ کچھ بڑھالوں تا کہ روشنی ہو اور ہوا آئے یہ سوچ کر خود ہی نیو کھودی تو ایک بڑا خزانہ جو اس کے باپ نے یہی خیال کر کے اور انجام پر نظر ڈال کر یہاں دبوا دیا تھا وہ نکل آیا۔ چھوٹے بیٹے نے اسی روپے سے ملازم رکھے کچھ قدیم لوگ جمع ہو گئے آخر حریف سے مقابلہ کر کے فتح پائی اگر اردو زبان تمھارے واسطے شیر مادر ہے جس نے تم کو یہاں تک پہنچا دیا اور حقیقی تفریح۔ ایک قادر الکلام جس کے پاس علم کو پونجی بھی ہو اس کی اقلیم حکومت کی حد بندی کیوں کر کوئی کر سکتا ہے کہ کہاں تک اور کتنی بڑی سلطنت کا مالک ہے پھر تم اردو ہی کو کیوں نہ بڑھاؤ کہ تم پر علم آسان ہو اور علم کو علم کی غرض سے حاصل کرو علم کو آلۂ کار نہ بناؤ اور اپنی مٹی اپنے ہاتھوں کیوں خراب کرتے ہو تم کو تو نسبت اردو ہی سے ہے۔ اردو سے نہ ٹلو کیوں کہ جو شے نسبت سے ٹل جائے گی وہ شے نہ رہے گی۔ سب سے پہلے زبان مادری میں علم پڑھو جو سب سے قریب تمھاری منزل مقصود کا رستہ ہے۔ اگر تم نے مادری زبان میں تعلیم شروع کر دی تو پھر بھی زبان اردو تمام علوم کی ترجمان بن جائے گی۔ علوم مشرقی جب سے مغرب میں گئے مغرب کو روشن کر دیا اور علوم مغربی نے جب سے مشرق میں قدم رکھا اندھیرا ہو گیا۔ علوم کچھ بارش کی طرح سے تو آسمان سے برسے ہی نہیں، گھانس کی طرح جنگلوں میں پیدا نہیں ہوئے۔ لوگوں کے تجربے میں جن کو ترکیب دے کر تفصیل کے ساتھ بیاضوں میں جمع کیا گیا ہے اور تجربہ ملک کی آب و ہوا کے متعلق ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ملک میں سردی کی وجہ سے قبض وجود ہے اس وجہ سے وہاں کی تعلیم یہ ہوگی کہ تم آزاد ہو کسی کے پابند نہیں کوئی سوتا ہے تو سوئے اپنا گھر ڈال چلاؤ۔ مغرب کے واسطے نہایت ضروری ہے اور سب کو پس پشت ڈال کر اپنا کام نکالنا نہایت مناسب۔ ہم کیا کریں گرم ملک کے رہنے والے کہ یہاں کی آب و ہوا کا تقاضا گرمی کی وجہ سے پھیلنا بکھرنا ہے یہاں تجربہ کیا جاتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے الگ نہ ہو آپس میں ہمدردی کرو دوسرے کا کام کرو تمھارا کام خود ہو جائے گا۔ بڑوں کا ادب کرو، باپ کی آواز سے بلند آواز نہ نکالو، باپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھو تو مغرب اور مشرق میں کتنا بڑا فرق ہے جس کو بعد المشرقین کہنا مناسب ہے۔ اب بھی اگر ہم مشرقی تعلیم نہ لیں گے تو آئندہ سمجھ لو اب تک تو صرف اتنا ہوا کہ چہرے بدلے ہیں اور لباس اور عادتیں کچھ کچھ بدل رہی ہیں اور آگے دیکھیے

کہ زمانہ کیا کیا بدلے گا۔ مسلمانوں ذرا تو پیچھے ہٹ کر دیکھو کہ تم کہاں سے چلے ہو اور کہاں تک آئے ہو اور تم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ ذرا سوچو اور اس وقت کو غنیمت جانو کہ زندگی کا چلتا ہوا سکہ تمہاری جیب میں ہے پھر کیوں خالی ہاتھ رہے جاتے ہو۔ دیکھو اور زبانیں علمی لحاظ سے اتنی بہتر کہ اردو زبان ان زبانوں کے آگے گونگی جاہل لیکن تمہارے واسطے ایک اچھا معلم بس اس معلم کے مدرسے میں داخل ہو اور جلد سند لے کر کام شروع کرو بشرطیکہ یہی مادری اردو جانتے ہو یہ تمہارے واسطے ایک سرور اور کیف کا چڑھاؤ ہے کہ جس کا اوتار ہی نہیں اور زبانیں پونجی دار، گنج سرمایہ دار کام کی ہر طرح سے ٹھوس و مضبوط ہیں لیکن ہمارے واسطے جام شراب کی ہی سستی ہیں۔

اردو والوں اپنے واسطے نہیں ہم سے پیچھے آنے والوں کے واسطے صراط مستقیم بناؤ۔

ملک عرب میں ایک بڈھا اپنی زمین میں ایک باغ لگا رہا تھا اور کھجوریں بو رہا تھا اتفاقاً خلیفہ وقت شکار کھیلتا کسی وجہ سے اپنے ہمراہیوں سے الگ ہو گیا ہے، تنہا گھوڑے پر سوار اس باغ کے قریب آیا جہاں بڈھا کھجوروں کو نصب کر رہا ہے، کھجور بہ نسبت اور درختوں کے انسان سے بہت قریب ہے۔ ملک عرب میں عرب لوگ صرف کھجور پر اپنا گزارا کر کے نہایت تندرست رہتے ہیں۔ علاوہ اور درختوں کے کھجور میں بہت سی باتیں آدمی سے ملتی جلتی ہیں مثلاً کسی درخت کی کونپل کاٹ دو اور جگہ سے نکل آئے گا اور کھجور کا سر کٹ گیا تو مثل انسان کے اس کی موت ہے۔ یہ درخت عاشق بھی ہوتا ہے جیسے آدمیوں میں تشخیص الگ الگ ہے اسی طرح سے کھجور بھی اپنی من مانی چاہت رکھتی ہے اور بہت سی خوبیاں ہیں۔ غرض خلیفہ تنہا ہے اور اپنے ہمراہیوں کا انتظار کرتا ہے، ٹھہر گیا تو خلیفہ کی نظر اس بڈھے پر پڑی دیکھا تو بڈھا کھجوریں بو رہا ہے، خلیفہ نے فرمایا کہ بڑے میاں کیا آپ کو امید ہے کہ اس باغ کا پھل کھاؤ گے اس بڈھے عرب نے دست بستہ عرض کی کہ اے کبرو جوانی کے متوالے تیری جوانی اور تندرستی قائم اور دائم رہے تو نے اپنی زندگی کا وقت کہ جس کی قیمت گنج رائیگاں اور شایگاں نہ دے سکے گا تو نے مجھ غریب سے بات کر کے مجھ کو مالا مال کر دیا، میرے پاس کیا دھرا ہے جو اس کا بدلہ اتار سکوں لیکن جو میرے پاس ہے وہ تجھ پر نثار کرتا ہوں۔ سن اور سمجھ اور کان دھر کر سن۔ اوروں نے بھی باغ لگائے اور پھل نہ کھائے اور اس منزل کو چھوڑ کر آگے گئے اور پھل ہم نے کھائے۔ اب مجھے بھی اس سے بہتر رستہ نظر نہیں آیا میں بھی اسی بنیاد پر ہو لیا کہ اوروں نے لگائے اور پھل ہم نے کھائے ہم لگاتے ہیں اور پھل کھائیں گے۔ خلیفہ یہ سن کر نہایت خوش ہوا اس عرصے میں نوکر چاکر، غلام، خادم، سردار اور سوار نہایت بے قراری سے خلیفہ کو تلاش کرتے کرتے بے تحاشا گھوڑے سرپٹ ڈالے حاضر ہوئے، خلیفہ نے حکم دیا کہ ہزار اشرفیوں کی تھیلی اس زمیندار کو دے دو چناں چہ خزانچی نے فوراً تھیلی اس بڈھے کو دے دی بڈھے نے تھیلی لے کر نہایت ادب سے آداب بجا لایا اور دست بستہ عرض پرداز ہوا کہ خداوند نعمت کی عمر دراز ہو حضور نے ملاحظہ فرمایا کہ نیک نیتی کا پھل ابھی مل گیا۔ کسی کا باغ جب پھلے گا تو جب ہی پھل کھائے گا اور میرا باغ تو ابھی پھل

گیا۔ خلیفہ یہ سن کر اور بھی خوش ہوا اور حکم دیا کہ ایک تھیلی اور دو یہ حکم دے کر خلیفہ روانہ ہوا:

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل کھائے گا
گیہوں سے گیہوں جَو سے جَو چاول سے چاول پائے گا
جو آج جیسا دیوے گا ویسا ہی وہ کل پائے گا
کل دیوے گا کل پائے گا کل پائے گا کل پائے گا
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

جہاں تک ممکن ہے سچ بولو۔ اگر سچ میں بظاہر نقصان اور شکست ہی نظر آتی ہے تو اس کا خیال نہ کرو کہ انجام میں فتح ہے۔ ہاں وہ بات نہ کرو کہ جس کے معنی اور مطلب نہ ہو اور کوئی غرض ہو تو بولو ورنہ دماغی قوت کا بیجا صرف کیوں کرتے ہو۔ اکتوبر کی چوتھی پانچویں چھٹی تک عیسائی روزہ رکھتے ہیں کھانے پینے کا نہیں بلکہ اتنے عرصے تک بات نہیں کرتے۔ اب بات نہ کرنے میں راز کیا ہے؟ چپ رہیں گے تو قوائے دماغیہ قوی ہوں گے کیوں کہ ہر متحرک شے روکے سے زیادہ قوت اور شدت پیدا کرتی ہے بجلی کے تاروں کو دیکھو کس کس طرح سے موڑ توڑ کر لے جاتے ہیں کہ بجلی میں قوت زیادہ ہوتی ہے۔ چلتے ہوئے اور بہتے ہوئے پانی کو دیکھو جب کہیں بند لگاتے ہیں یا روک تو پانی کیسے کیسے طوفان اٹھاتا ہے۔ غرض ہر شے کی تعریف ہو سکتی ہے، معنی ہو سکتے ہیں لیکن خوشی کی خوبیاں تو بس چپ ہی ہو جاؤ کسی نے خوب کہا ہے:

خوشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

دماغ میں حرارت ہے اور حرارت ہی سے حرکت ہوتی ہے۔ بس جتنی دماغ میں حرارت رکے گی قوت دماغیہ قوی ہو گی اس لیے لازم آتا ہے کہ قوائے دماغیہ اور عقلیہ زیادہ ہوں گے۔ اگر زبان سنبھال لو گے تو زبان کے ساتھ تمھاری عادتیں از خود اچھی ہو جائیں گی ارادہ تو کرو کچھ نہ کرنے سے تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کیا ابھی اور تجربہ کرنے کا ارادہ ہے اور کچھ نہیں تو نہ سہی زبان ہی سنبھالو، زبان پر تو تمھارا قابو ہے۔ مسلمانوں ابھی کا ذکر ہے کہ تم سلطنت سنبھالے ہوئے تھے اور اب زبان بھی نہیں سنبھلتی۔ لفظوں کو موتی سمجھو اور ان کو سلسلہ وار پرونے کو کلام بس اگر موتی باقاعدہ اتار چڑھاؤ کے صراحی دار پروئے ہوئے ہوں گے تو حسین گردن جھکا دیں گے اور بے عذر پہن لیں گے اور یہی ہمارا مدعا ہے کہ تقریر مسلسل ہو، باقاعدہ ہو۔ فصاحت یہ ہے کہ مشہور لفظ بولو، کھینچ کھانچ کر غیر معروف، غیر فہم لفظ کلام میں لا کر اپنے خیال میں فخر نہ کرو کہ میں نے ایسا لفظ بولا کہ کوئی نہ سمجھا۔ قربان ایسے خیال کے اور صدقے ایسی سمجھ کے کہ بات کرو اور کوئی نہ سمجھے یہ صفت تو نہایت ادنیٰ ہے ہر جانور میں یہ صفت ہے

کہ بولتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا۔ کلام اپنا مدعا بیان کرنے کے واسطے بولا جاتا کہ سننے والے کو ہمارا مدعا سمجھنے میں شبہ باقی نہ رہے اور ہمارا مطلب سمجھ لے۔ تقریر کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس دائرہ فلک میں جو کچھ ہے سب سے بحث ہوتی ہے۔ کلام وہی ہے کہ جس کلام میں معنی کی صفت ہو۔ خوبی کلام یہ ہے کہ لفظ چند ہوں اور معنی وسیع لیکن وضاحت ہو جائے۔ برے لفظ تو کبھی بھول کر بھی زبان سے نہ نکالنا کہ برے لفظوں کا اثر برا ہوتا ہے۔ میں نے ان شاہزادوں کی زبانی سنا ہے کہ جن شاہزادوں نے بہادر شاہ سے سنا جب بادشاہ ولی عہد یا کسی شاہزادوں میں سے بدعنوانی دیکھتے تو بادشاہ فرماتے تھے کہ دے بھئی اماں کچھ اس بات پر نہ اتراؤ کہ یہ صاحبی جو برائے نام ہے یہ یوں ہی چلی جائے گی۔ نہیں یہ خیال دل میں بھی نہ لانا۔ تمہاری یہ حرکتیں اس قابل ہیں کہ تمہارا نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔ اچھی تقریر سے بہت جلد آدمی عزت حاصل کر لیتا ہے۔

مثال بزرجمہر:

بزرجمہر کسی طرح سے نوشیرواں کے دربار میں پہنچ گئے اور نوشیرواں کی نظر پڑی تو نوشیرواں بادشاہ تھا دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ جوہر قابل ہے جب بزرجمہر سے گفتگو ہوئی تو ان کے جوہر ذاتی کھلے اور چند ہی روز میں بزرجمہر نے وہ عزت دربار میں حاصل کی کہ جو درباری قدیم بادشاہ کے مزاج میں دخیل تھے ان کے چراغ گل ہو گئے۔ ادھر نوشیرواں نے بزرجمہر کی عزت رفتہ رفتہ اور بڑھائی لیکن ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ نااہل یہ تو خیال نہیں کرتا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں ہاں اپنے جائز اور ناجائز حقوق پیش کرتا ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ کچھ دراندازی کر بیٹھیں اور بزرجمہر کو کوئی نقصان پہنچے یہ خیال کر کے نوشیرواں نے اپنے درباریوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص جو تازہ وارد ہے تم سب مل کر ایک دن اس کا امتحان تو کرو کہ یہ کیسا ہے اور کیا یہ اس لائق ہے کہ اس کو دربار میں داخل کر لیا جائے۔ سب نے عرض کی کہ حضور عین صواب ہے یہ حکم نوشیرواں کا سن کر آپس میں سب نے مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ اس سے ایسے سوال کیے جائیں کہ جواب نہ دے سکے۔ ایک روز دربار شاہی کے اراکین دولت حاضر ہیں۔ بزرجمہر سے درباریوں نے سوال کیا کہ آپ یہ فرمائیں کہ شاہی دربار میں جو حاضر ہو علاوہ آداب شاہی کے اس کا ذاتی کیا فرض ہوگا۔ بزرجمہر نے جواب دیا کہ ایسا شخص دربار شاہی کو اپنے واسطے ایک دریائے زخار سمجھے کہ جس کا کہیں اور چھور نہیں اور اپنے آپ کو یہ خیال کرے کہ مجھے اس دریا سے پار جانا ہے اور دریا کا عبور بے کشتی اور ملاح اور لنگر اور بادبان کے ناممکن ہے ان چاروں چیزوں میں سے جو شے ناقص ہوگی تو بہت کم امید ہے کہ پار ہو جائے۔ اول کشتی پر نظر ڈالے کہ کشتی کیسی ہے اور وہ کشتی اپنے ذاتی کمالات میں کہ ہر طرح سے مضبوط ہو اور پھر ملاح کو دیکھے، ملاح یہ درباری لوگ ہیں کہ ان سب کو راضی کرے کہ ان کی مرضی کے خلاف امید نہیں کہ بیڑا پار ہو اس کے علاوہ بادبان، بادبان عقل ہے کہ عقل سے یہ دیکھتا رہے کہ دربار کی ہوا کیسی ہے اور اس وقت مزاج شاہی کا

خشا کیا ہے جب ان امور پر قابو پالیوے تو اب کشتی کا ٹھہرنا ہے اور یہ بے لنگر کے ناممکن، وہ لنگر کیا ہے وہ اپنی بات ہے لیکن ایسی تچی ہوئی پکی بات ہو کہ جو کہہ دے کہہ دے اور وہ ٹل نہ سکے جیسے کشتی کا بھاری لنگر جہاں ڈال دیا کشتی رک گئی اور جب سوار ہو تو ہر وقت یہ خیال رہے کہ کشتی کا میزان برابر ہو ایسا نہ ہو کہ ایک طرف مائل ہو جائے اور کشتی کو خطرہ ہو اور اس کی مثال وہ نیکی ہے لیکن اس کے ساتھ جو نیکی کا اہل ہو نہ کہ بد کے ساتھ۔ جیسے خربوزے کی بیل کہ یہ بد ہے اور اس طرح سے بد ہے کہ اگر کوئی جھاڑی یا کوئی گھن دار چھوٹا پودا خربوزے کی بیل کو اتنی اجازت دے دے کہ یہ افتادہ مختی گری ہوئی مخلوق صرف سہارا لے لے تو پھر دیکھو کہ یہ رینگنے والی اس جھاڑی یا پودے کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے کہ خود تو منہ اٹھا کر اوپر چڑھتی ہے اور اپنی لُو سے اس جھاڑی یا پودے کی نرم نرم اور نازک نازک شاخوں اور کونپلوں کے گلے گھونٹنے اور گردنیں مروڑنی شروع کرتی ہے اور اپنے بڑے بڑے پتوں سے آفتاب کی شعاعوں اور لطیف ہواؤں کو جو پودے کی زندگی کا بڑا سبب ہے روک دیتی ہے اور اپنے بھاری پھلوں کے بوجھ سے درخت کی بڑی بڑی شاخوں کو توڑ مروڑ کر درخت کو لنڈا اور اپاہج کر دیتی ہے خیر یہاں تک بھی خیر تھی لیکن اب اس بد کے ساتھ نیکی کا ثمرہ ملاحظہ ہو کہ جب یہ خود غرض آپ سوکھتی ہے تو اس جھاڑی یا پودے کو بھی لے مرتی ہے۔ اس جگہ یہ مثال خوب ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں مگر (صنم) تم کو بھی لے ڈوبیں گے:

سکھ دیجیے وا کو جا کو سکھ سہائے

سکھ نہ دیجیے بامدرا کو جو گھر بیٹے کا جائے

اس لیے نیکی تو ضرور کرے کہ نیکی سے بہتر کوئی بات نہیں لیکن نیک کے ساتھ نہ کہ بد کے۔ میں اپنے ملک اور قوم اور مذہب کو کیوں لکھ لکھ کر پڑھنے کی تکلیف دیتا ہوں اور ان کا وقت عیش و عشرت کا کیوں خراب کرتا ہوں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ابھی اس پودے میں جان ہے۔ اگر اب بھی دیکھ بھال کر لے تو ابھی تک سب کچھ ہے۔ قوم اور مذہب میں احساس باقی ہے اور آج کل اتنا تیز احساس ہے کہ اس احساس کی وجہ سے ایک دوسرے کے لہو کا پیاسا اور آپس میں دست و گریبان ہیں، اگر ہم اس احساس سے بجائے اس لڑنے جھگڑنے کے حفاظت خودداری کا کام لیتے اس سرعت کے ساتھ تو کیا کے کیا ہو جاتے اور تمام پریشانیاں دور ہو کر بجائے تکلیف کے آرام ہی آرام ہوتا۔ یہ باتیں تو رات دن ہمیں تجربے بتا رہے ہیں کہ مذہب اور قوم، خاندان، ملک کی آب و ہوا، غذا، تعلیم ان باتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے اور ان باتوں سے زیادہ مستقل اثر خاندان کا ہوتا ہے اور ڈارون کے قول کے موافق ہم نے تنزل سے ترقی کی ہے لیکن رک کیوں گئے؟ اور زمانہ تو ایسا چنچل ہے کہ اس کو ایک جگہ قیام کہاں پھر ترقی سے تنزل کی طرف جاتے تو عجب نہ تھا کہ انسان سے حیوان اور حیوان سے رینگنے والے کیڑے اور کیڑوں سے پتھر اور پتھر سے آگ اور آگ سے بدل کر ہوا ہو کر معلوم نہیں کہ اس آسمان کی لا انتہا خالی جگہ میں کہاں کے کہاں ہوتے یا

چھوٹے چھوٹے ذرّے پھر خلا میں رگڑے کھا کر آگ ہوتے اور آگ میں جذب اور جذب میں حرکت اور پھر حرکت سے ٹکڑے ہو کر ٹھنڈے ہوتے اور پھر کچھ بنتے لیکن ہم تو آدم سے اب تک یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ آدم سے آدم۔ اب ان باتوں کو سمجھ کر بھی ہم کچھ نہ کریں تو جس جرم میں ہم اس وقت گرفتار ہیں تو عجب نہیں کہ یہ قید بڑھ کر حبس دوام یا عبور دریائے شور اور آخر پھانسی تک نوبت پہنچے۔ دیکھو اب بھی اپنے جرم سے باز آؤ اور عفو تقصیر چاہو، سنبھل جاؤ اور یہ دیکھو کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے، کیا کیا اور کیا کر رہے ہو ابھی تک تو صرف ایسا ہے کہ پہلے ہم باوزن تھے اور اب وہ وزن جاتا رہا۔ عالم تھے جاہل ہو گئے، قوی تھے ضعیف ہو چکے، پہلے دنیا ہم کو جانتی تھی اب کوئی روشناس بھی نہیں۔ اب ہم کب تک غیرت کے چنے چبا کر کھائیں گے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ مجھ جیسے دنیا میں کسی کو منہ نہ دکھائیں اور اپنے افعال بد سے خدا کے بندوں کو تکلیف نہ پہنچائیں کیوں کہ جب ہم کو دنیا میں کسی قسم کی حس ہی نہیں تو پھر دنیا میں رہ کر کیا کریں۔ بس مناسب ہے کہ مجھ جیسے ایک جگہ جمع ہو کر اصحاب کہف کی طرح کسی ایسی جگہ جہاں کسی کو معلوم نہ ہو اور کسی کا ہرج بھی نہ ہو اپنا خاتمہ کر لیں اور رو رو اور غل مچا مچا کر کامی دمیوں کے دماغ پریشان نہ کریں لیکن مجھ جیسوں سے یہ بھی امید نہیں کیوں کہ اس میں کام کا نام اور ہم نکمے ہیں، م سے یہ کام بھی نہ ہوگا بلکہ اس کو بھی کوئی غیبی ہاتھ انجام دے گا۔ اچھا یوں نہ سہی تو دنیا میں الگ تھلگ ہی رہیں یسے استاد ذوق کی زندگی کے واقعات ہیں اور استاد کا یہ شعر ان کی زندگی کا خاکہ ہے:

جوں سایہ اس چمن میں پھرا میں تمام عمر
شرمندہ پا نہیں مرا برگ گیاہ کا

اب استاد کے چشم دید واقعات پر نظر ڈالیے اور سنیے: استاد بہادر شاہ کے استاد تھے ان کا دستور تھا کہ نماز صبح کے بعد پالکی میں سوار ہوتے اور قلعے میں جاتے تھے اور وہاں سے ساڑھے گیارہ بجے یا بارہ بجے دن کے گھر واپس آتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ گرمی کا موسم اور اس زمانے کی دلی کی گرمی کہ خدا کی پناہ ٹھیک دوپہر کو چیل انڈا چھوڑے، وہ چلچلاتی دھوپ، لو کے طمانچے (یہ اتنی جلدی موسم میں تغیر کیوں ہوا یہ فلسفہ طولانی ہے۔ اس وجہ سے چھوڑا)، اب کہاروں نے پالکی دروازے پر رکھی استاد اتر کے اندر مکان میں تشریف لے گئے اور وہاں سے کھانا کھا، گرمی کی وجہ سے کپڑے اتار نیلا تہ بند باندھ کر اب مردانے مکان میں تشریف لے گئے۔ یہ مکان نہایت چھوٹا جو اسی نوے گز زمین پر بنا ہوا اس میں ایک جنوب رویہ دالان کوئی چار گز لمبا تین یا پونے تین گز کی کرطلیچہ بھی نیچا۔ کاٹ کے ستون، بوریہ بچھا۔ ایک طرف بانس کے پٹی سیروں کے بان سے بنی چارپائی شمال کی طرف جس کا سرہانہ، تمام دالان میں دھوپ بھری، کھری چارپائی دھوپ سے جھلس رہی ہے اس پر ایک میلا چکٹ چیتا کوئی چھ گز لمبا ڈھائی تین گرہ چوڑا تکیہ، ایک در میں اکہرہ جھر جھرہ گاڑھے کا پردہ جس سے دھوپ چھن چھن کر چارپائی پر پڑ رہی ہے۔ استاد تشریف

لائے تو استاد کا چھوٹا قد، کالا رنگ، گندہ اندام تو ندا چھی ابھری اب استاد اسی چار پائی پر لیٹے۔ دو چار ادھر ادھر کروٹیں لیں اور بلند آواز سے خدمت گار کو پکارا۔ میاں کریم بخش کریم بخش نے جواب نہ دیا پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر پکارا میاں، کریم بخش میاں۔ کریم بخش ایک ڈیوڑھی کا چھتا ہے جو اچھا لمبا پانی چھڑکا ہوا اور ایک چوکی پر تھے دو بلے حقہ تازہ کیے قرینے سے رکھے، چلمیں اوندھی ہوئیں پڑیں ناند میں سکیں بھیگی ہوئیں کڑیلی میں آگ تمباکو کا بڑا ڈبا بھرا ہوا، ایک طرف میاں کریم بخش کی پلنگڑی گی، دری اجلی چادر سے درست، کریم بخش لو سے بچے ٹھنڈک میں بیٹھے ہیں اور استاد کوکلوں پر لوٹ رہے ہیں۔ اب میاں کریم نے جھلا کر آواز دی جی میاں کریم بخش کہہ کر جان کھا گئے۔ کیا ہے کہو تو سنی جو معلوم ہو کریم بخش، کریم بخش استاد نے فرمایا کہ میاں حقہ بھر لاؤ۔ کریم بخش نے جواب دیا لاتے ہیں، آگ سلگ رہی ہے یہ سن کر استاد چپ ہو گئے اسی چار پائی پر لوٹتے رہے اسی بے قراری میں کچھ یونہی سی آنکھ جھپکی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ اب استاد قیلولے سے فارغ ہوئے، اٹھے، وضو سے فارغ ہو کر مصلے پر آئے کہ اس وقت میاں کریم بخش حقہ بھر کر لائے لیکن استاد نے یہ بھی نہ فرمایا کہ میں کھانا کھا کر آیا اور گھنٹہ بھر لیٹا رہا تم اب حقہ لائے ہو لیکن استاد کو فکر شعر سے اتنی فرصت کہاں تھی جو اتنی بات بھی دریافت کرتے زندگی کے ایسے واقعات پر یہ شعر صادق آتا ہے۔ استاد کا واقعہ کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے اگر ہم بھی انھیں باتوں پر عامل ہو جائیں تو کیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہزاروں مصیبتوں سے ہم بھی بچیں اور خدا کے بندے بھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہی بے چارہ عادتیں تھیں کہ جنھوں نے ہم کو کہیں نہیں دیا اور ہم کسی کام کے نہ رہے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہم اندھے ہیں اور ہمارا کسی گنتی میں شمار نہیں۔ اگر ہم اب بھی نہ سمجھیں گے اور نہ سنبھلیں گے تو زمانہ ہم کو کوڑا سمجھ کر ایسا نہ ہو کہ کسی گڑھے میں دبا دے اور اوپر سے مٹی ڈال کر یہ کہے کہ خس کم جہاں پاک اور خدا کی زمین کو ہم سے پاک کرے۔ ابھی تک ایسا نہیں ہے ہم زندہ ہیں فرصت ہے، کتابیں ہیں، پڑھانے والے ہر طرف لیکن ہماری تو وہ مثل ہے کہ دریا میں اور پیاسے یا یہ میری بھول ہے۔ اہل ملک نے سوچ لیا ہوگا کہ میاں تمام باتیں خدا کے ہاتھ ہیں وہ جب چاہے گا ایک پل میں درست کر دے گا۔ اس میں شک نہیں وہ قادر ہے اگر خدا کو ایسا منظور ہوتا تو جو اعضائے ظاہری اور باطنی ہم کو دیے ہیں آخر ہیں وہ کس کام کے کیوں کہ خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ کسب معاش اور معاد میں بھی زبان ہی کام آتی ہے جسے روح کو اطمینان ہوتا ہے اور کہنے سمجھانے کا طریقہ ہی زبان ہے۔ ہاں بلا ضرورت کے نہ بولو۔ اگر آپ کسی گھوڑے کو بے تحاشا بھگاؤ گے تو سست ہو جائے گا ہاں آہستگی سے کام لو کہ تم کو منزل پر بعافیت پہنچا دے اور یہ سمجھ لو گھوڑا کیسا ہے اصیل خاندانی اور اچھا ہو، جب تک زین اور لگام و تازیانہ نہ ہوگا سوار تو ہو جاؤ گے لیکن گھوڑا بے قابو ہوگا۔ اللہ نے زبان اور اس کے ساتھ عقل مرحمت فرمائی ہے کہ ان دونوں کو ملا جلا کام لو گے تو بڑی بڑی مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ چرب زبانی سے زیادہ کوئی گناہ نہیں۔ بردباری سے گفتگو کر، تدبیر کو ہاتھ سے نہ دے۔ بس پھر تیرا بول بالا ہے بات کا

اثر دل میں اتر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بات میں کچھ عجیب حکمت پوشیدہ رکھی ہے۔ انسانی زندگی کا مدار بات ہی کرنے پر موقوف ہے۔ علاوہ کام کاج کے دعا اور دوا کا بھی کام زبان ہی دیتی ہے اور باتیں تو سب ہی کرتے ہیں لیکن باتوں کی ترکیب نہیں جانتے۔ وہی دوائیں جن کی شکل وصورت، وضع قطع سے ہم بھی واقف ہیں لیکن مقدار دوا اور ضرورت دوا اور آپس میں ان کا میل جول جو جاننے والا طبیب ترکیب دے کر کسی مریض کو ضرورت کے وقت دیتا ہے اور وہ دوا ضرورت کے وقت تیر بہدف ثابت ہوتی ہے اسی طرح وہی دوا ہمارے دینے سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہے۔ باتوں سے مریض بہل جاتا ہے اور اکثر مریض اچھے ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ بغداد کے ایک خلیفہ کا ذکر ہے کہ ایک روز محل میں شب کے وقت اندھیرا ہو گیا۔ بادشاہ تو نازک مزاج اور ذکی الحس ہوتے ہیں، بادشاہ کو خیال آیا کہ قبر میں تو اندھیرے کے سوا روشنی کی امید نہیں وہاں کیا گزرے گی۔ بس اس خیال سے بادشاہ کے دل پر وہ اثر ہوا جیسے کوئی لاعلاج مرض کا مریض رات دن گھلتا ہے۔ بادشاہ گھلا جاتا ہے، کاروبار سلطنت میں فرق آنے لگا۔ حکیم پریشان سب کچھ کر رہے ہیں لیکن حالت بدستور، اب ارکین دولت نے حکماء سے کہا کہ تم مزاج سلطانی سے واقف ہو اس وقت کیا ہو گیا کہ آپ سب کا علم اور تجربہ بے کار، یہاں تمام حکیم ہر طرح سے دیکھ بھال کرتے ہیں کوئی دوا اثر نہیں کرتی جو جو دوائیں رات دن رائی کے برابر دیتے تھے اور وہ دوا پہاڑ کے برابر اثر کرتی تھی اب وہی دوائیں دی جارہی ہیں اور خاک اثر نہیں بلکہ:

دن بدن یاں ناتوانی اور ہے

سخت پریشان ہیں کہ اس تاریک اور پیچیدہ مرض کی حقیقت روشنی میں نظر نہیں آتی۔ اب مجبور ہوئے اور یہ لوگ تلاش میں ہر طرف نکل گئے۔ عرصے کے بعد ایک حکیم صاحب کسی بزرگ کی خدمت میں پہنچے اور حقیقتِ حال سے خلیفہ کو آگاہ کیا۔ ان بزرگ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ یہ کیا بڑی بات ہے اس بات سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا خلیفہ اپنے آپ کو خلیفہ کہلاتا ہے لیکن وہ خلافت کا اہل نہیں کیوں کہ اس کو اسلام اور ذاتِ رسول اللہ سے کوئی لگاؤ نہیں، وہ کیا جانے کہ اسلام کیا شے ہے اور دنیا میں اتنی دیر کے بعد اللہ تعالیٰ نے کیوں اسلام کو نازل فرمایا۔ جب یہ دین خدا کے نزدیک کامل ہے تو اور خدا کے بندے جو اسلام سے پہلے گزرے وہ کیوں اس نعمت سے محروم رکھے گئے۔ یہ بحث بہت طولانی ہے اور حقیقت کو اللہ ہی جانتا ہے۔ بس تو جا کر بادشاہ سے یہ کہہ دے کہ عقلمند جب تک نورِ محمدی آسمان پر تھا تو روشن ستارہ تھا اور جب سے ذاتِ مبارک زمین کے اندر گئی تو مسلمانوں کے واسطے زمین روشن ہو گئی۔ اگر تیرا اسلام اسلام ہوتا اور رسول اللہ کی عظمت تیرے دل میں ہوتی تو اس بلا میں گرفتار نہ ہوتا۔ غرض حکیم صاحب یہ نسخۂ شفا لے کر روانہ ہوئے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔ بادشاہ تو یہ سن کر ایسا تندرست ہو گیا جیسے کبھی کوئی مرض ہی نہ تھا۔ اب بادشاہ کو ان بزرگ کی خدمت کا شوق ہوا۔ حکم دیا کہ سفر کی تیاری

کرو اور آپ سوار ہو کر روانہ ہوا۔ جب ان بزرگ کی منزل پر آیا خیمہ زن ہوا۔ دوسرے روز بادشاہ نے نہایت عقیدت سے ایک نامہ لکھا اور شوقِ ملاقات ظاہر کیا۔ جب نامہ ان بزرگ کے پاس آیا تو نامہ سن کر جواب ملا کہ مجھے فرصت نہیں معاف فرمانا، دوسرے روز بادشاہ نے پھر اطلاع دی تو وہی جواب ملا، تیسرے روز بھی معلوم ہوا کہ فرصت نہیں بادشاہ تو بادشاہ ہوتا ہے شاہی دماغ میں انفعال کا مادّہ کہاں بادشاہ نے لکھا کہ میں ظل اعظم ہوں۔ جس کی اطاعت کا حکم ہے۔ جس وقت شاہ صاحب نے سنا تو کہلا بھیجا کہ بیشک آپ ظل خدا ہیں میں بھی جانتا ہوں لیکن میں ابھی طاعت خدا کو بھی جیسا کہ جاننے کا حق ہے نہیں سمجھا اور اس کے بعد طاعت رسول ہے کہ جس سے میں واقف بھی نہیں تو آپ کی اطاعت کا مرتبہ اس کے بعد ہے آپ اس وقت تشریف لے جائیں اور پھر تشریف لائیں یہ فقیر حقیر آپ کے خادموں کے بھی لائق نہیں اور آپ تو خلیفۂ وقت ہیں میری کیا مجال جو حاضر خدمت ہوں۔ اب آپ غور فرمائیں کہ بات ہی تو تھی جس نے بادشاہ کو ہلاکت سے بچایا اور بات ہی تو تھی جس نے بادشاہ کے غصے کو ٹھنڈا کیا لیکن بات برمحل تھی۔ اب اگر ہم بھی کر بات کریں تو کیا ہماری بات میں اثر نہ ہو۔ اس مختصر رسالے سے میری غرض فن تقریر نہیں کیوں کہ ہر فن، فن ہونے کی حیثیت سے بہت دشوار ہے۔ فن جاننے کے لحاظ سے چار باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان چار باتوں میں سے ایک بات بھی نہ ہوگی تو پھر فن سیکھنے کی ہوس نہ کرے۔ وہ چار باتیں یہ ہیں۔ اوّل استاد کامل کہ بے استاد کے کیا دھرا ہے کچھ نہیں کر سکتا، دوسرا ذہن ہلا ہونا اعضا کا کہ اعضا تندرست اور اس فن کے لائق ہی ہوں، تیسرے شوق، طلب صادق، چوتھے حافظہ اگر ان باتوں میں سے ایک بات بھی نہ ہوگی تو فن میں کامل ہونا ناممکن اور ان چاروں باتوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ کسی اور ہی کے اختیار میں ہے۔ اس وجہ سے میں نے فن تقریر سے بحث نہیں کی۔ صرف بولنے اور بات کرنے کے متعلق مشورہ دیا ہے ورنہ بات کرنی کون نہیں جانتا اور جو بات کرتا ہے کچھ ہی کے بات کرتا ہے۔ ہاں اگر بات کرنے کے تھوڑے سے بھی قاعدے کسی کو معلوم ہو جائیں تو بس پھر اس کا بول بالا ہے اور سننے والا اس کی بات شوق سے سنتا ہے، بے سیکھے دنیا میں انسان کو کچھ نہیں آتا۔ محنت کرو، سیکھو، اگر دوسرا تقریر کرے تو غور سے سنو۔ غرض دنیا میں پابند رہو کہ پابند اگر غلام ہے اپنے آقا کے حکم کا تو نافرمان فرزند سے عزیز ہے۔ بات کرو تو آواز ضرورت سے زیادہ نہ بلند کرو اور نہ ایسی پست کہ سننے والا نہ سمجھے۔ پہلے مجہول کو معلوم کر کے پھر گفتگو شروع کرو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تم کو کہنا ہے کہ شلجم پکانے کی اچھی ترکاری ہے مگر یہ دعویٰ اس وقت کرو جب تم کو یہ معلوم ہو کہ شلجم کس موسم میں بویا جاتا ہے۔ اس کا مزاج گرم وتر ہے جو قلب کو تسکین دیتا ہے۔ موسمی شلجم جو اپنی فصل میں ہو وہ نہایت بہتر ہوتا ہے بہ نسبت غیر فصل کے اس کی بڑی ڈلی ہو گول ہو، اس کی جلد چکنی ہوتی ہو، جڑ پلانہ ہو، پتے چھوٹے ہوں، یہ نرم ریتیلی زمین میں خوب ہوتا ہے، بونے کا موسم بعد برسات کے ہے۔ اب جب تمام باتوں کا علم ہو اس وقت کہو کہ شلجم اچھا ہے ورنہ کیا ہوتا

ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اکثر لوگ چرب زبانی کے بھروسے پر بڑے بڑے دعوے کر بیٹھتے ہیں اور پھر منہ کی کھاتے ہیں۔ اکثر قصہ لکھنے والے یا داستان گو بڑے بڑے ایسے بیان کر جاتے ہیں کہ جن کو سن کر سامعین کو بڑا اشتیاق ہوتا ہے کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے لیکن جب انجام پر آتے ہیں تو وہی ڈھاک کے تین پات اور بیان کرنے والے صاحب بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ اس واسطے مناسب ہے کہ ہر شے کو پہلے سوچ لو اس کے بعد پھر نچے ہوئے فقرے بولو۔ جو شخص بے سوچے بات کرتا ہے اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہے کہ جس کی نکیل دوسرے کے ہاتھ میں ہو وہ جدھر جائے گا ادھر لے جائے گا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے بول چال کی جان ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کی چیزیں گھس جاتی ہیں بودی ہو جاتی ہیں مٹ جاتی ہیں الا زبان سے جو لفظ نکلتا ہے اس کا اثر بدستور باقی رہتا ہے، بات ہی کا بول بالا ہے۔ ہر شے کی، ہر کام کی ابتدا بات ہی کرنے سے ہوتی ہے، کیسا ہی غیر سے غیر کیوں نہ ہو باتوں ہی سے اپنا ہو جاتا ہے اور اپنے سے اپنا دشمن ہو جاتا ہے۔ اب بات کرنی آسان تو اتنی کہ جاننے والا اور نہ جاننے والا بولتے تو سب ہی ہیں اور مشکل اتنی کہ میں نے اپنی عمر میں مشکل سے چند ہی آدمیوں کو ٹھکانے کی بات کرتے سنا ہے اور بعض اوقات جاہل سے جاہل ایسی بات کہہ جاتا ہے جو دل میں چبھ جاتی ہے۔

سہارنپور میں ایک شخص جاہل نے ایک زمین ٹھیکے پر لی اب یہ بڑے صاحب قبضہ نہیں چھوڑتے زمین کے مالک نے اس شخص پر نالش کر دی۔ ٹھیکے دار پیش ہوئے انگریز حاکم نے دریافت کیا کہ تم نے زمین کا ٹھیکہ کیوں نہ چھوڑا، بڑے ٹھیکے دار نے عرض کی کہ حضور میں نے قصور ہی کیا کیا میں نے موجودہ حکام کی مرضی کے موافق قدم پر قدم رکھا، حاکم نے کہا وہ کس طرح حکام تو کوئی بات انصاف اور قانون کے خلاف نہیں کرتے اس نے دست بستہ عرض کی کہ غریب پرور پہلے معافی چاہتا ہوں حکم ہو تو عرض کروں حاکم نے کہا کہو اس نے عرض کی کہ حضور اس ملک میں آئے تو حضور نے ٹھیکہ ہی تو لیا تھا اور اب تک نہیں چھوڑا میرا ٹھیکہ جو چند گز زمین کا ہے حضور مجھ سے چھڑوا رہے ہیں حاکم یہ سن کر کچھ منفعل ہوا اور ٹھیکہ جاری رکھا۔ سوچ سمجھ کر بات کرنا اور اس پر خوش تقریر ہونا آدمی کے واسطے عجیب نعمت ہے۔ لوگ فرحت کے واسطے بہت کچھ محنت اور خرچ کرتے ہیں اور پھر وہ خوشی حقیقی خوشی نہیں بلکہ بھاڑے کا ٹٹو ہوتی ہے اور اکثر انجام میں باعث نقصان بھی لیکن خوش تقریر کے واسطے فرحت ایک بات ہوتی ہے۔ اوّل تو خوش تقریر سے ہر شخص بات کرنی چاہتا ہے اور اچھی بات کرنے والا جب دوسروں کو خوش دیکھتا ہے تو اس کو فرحت ہوتی ہے اور روح میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور فرحت اور انبساط سے روح خوش ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو حقیقی خوشی وہی ہے جو دوسروں کی خوشی میں پائی جائے اور خوش رہنا انسان کی صحت کا سب سے بڑا سبب ہے اس سے عمر دراز ہوتی ہے۔ اس واسطے میں نے یہ رسالہ لکھا کہ ناظرین کو شوق ہو تقریر کرنے کا اور اس دولت کا ہر شخص حصے دار ہے۔ تقریر انسان میں خوبیاں پیدا کرنے کا ادنیٰ نکتہ ہے۔ اس واسطے اس رسالے میں چند قاعدے

لکھ دیے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے۔ ہر بات کرنے والے میں یہ بڑا عیب ہے کہ جو بات اس کے دل میں آئے بلا پس و پیش اور بے سوچے سمجھے کہہ دے ایسا شخص عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور نہ اس سے کوئی ملنا پسند کرتا ہے پھر ایسے کی بات مجذوب کی بڑ ہوتی ہے۔ مجذوب کیا کرتا ہے بات ہی تو کرتا ہے اور اس طرح سے جیسے ایک خوش تقریر لیکن سنتا کون ہے۔ بس یہی فرق ہے کہ مجذوب بے سوچے سمجھے جو دل میں آیا کہہ گزرتا ہے اور خوش تقریر بات کرنے سے پہلے سوچ لیتا ہے کہ مجھ کو کیا کہنا ہے اور کن لفظوں میں اور کس طرح سے اس مضمون کو ادا کروں۔ خوش تقریر ہونے کے واسطے ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے کہ جو کچھ کہنا ہے ذرا سوچ سمجھ کر بولے۔

ہم کیسی غفلت میں پڑے ہیں، لوگ ذرا ذرا سے کام انجام دیتے ہیں کیسی کیسی مصیبتیں اٹھاتے ہیں اور زبان وہ دولت ہے کہ ہر مشکل اسی سے آسان ہو جاتی ہے اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ اب تک خیال نہیں کیا نہ سہی لیکن اب تو مناسب ہے اور کیسا افسوس ہے کہ دلی جہاں اردو نے جنم لیا اور دلی والے جنھوں نے اردو کو چار چاند لگا دیے اور ایسی ترکیب سے بات چیت شروع کی کہ جس نے ان کی باتیں سنیں انھیں کا اتباع کیا۔ یہ وہی اثر ہے کہ اردو زبان میں جو کتاب لکھی جاتی ہے وہ دلی والوں ہی کی طرز بیان کا طریقہ برتتے ہیں اور اردو جو آج کل ہے اور اسے کثرت سے دلی کے رہنے والے بولتے ہیں۔ میں نے ہمدرد اخبار میں دلی کی تھکی پٹی اردو کے نام سے لکھی تھی اور اب بطور نمونہ پیش کرتا ہوں بقول دلی والوں کے بے فضول ہی سہی لیکن ہماری زبان ہے ہم کو کسی کے کہنے سے کیوں حرف ہو اور ہم کیوں کسی کے اگاڑ و محروم بنیں۔ ہماری تکسالی اردو ہرگز ٹھیک نہیں ہیں میں ایک شعر سناتا ہوں بھلا آپ ایسا شعر ہی کسی کا سنا دیں یہ ہمارے حقیقی کرخندار کا ہے۔ ایسی کاری گری سے گھڑا ہے کہ دنیا کی چیزیں اس میں آ جائیں، لو سنو اور قوتر اُڑا رہے تھے:

اوّل تو خرمنڈے سے تو کیوں بے ادب
بازار میں کہے تو بتا بات کا سوب
شاعر کی ہے زبانی چلو تک نہ چھوڑا
باقی رہا ہے ایک اونٹ اور پیادہ
لو پیادہ باقی رہ گیا تھا سو وہ بھی باندھ دیا

غرض اب دلی کے رہنے والے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جیسے ہماری زبان ہے کسو کی نہیں۔ اگر غدر پہلے دلی کی یہ زبان ہوتی تو بقول دلی والوں کے کہ اس کے ہاتھ کے کوئی جھوٹے بیر بھی نہ کھاتا۔ دلی والوں جہاں دنیا کے ہزاروں کام کرتے ہو یہ کام بھی اپنے اوپر فرض سمجھ لو کہ ہر گھر ہر خاندان تھوڑی دیر ہی کے واسطے زبان کی طرف بھی متوجہ ہو جاؤ اور اپنی زبان کو سنبھالو ورنہ اور زبانیں اردو کو خالی پا کر اپنا دخل جمائیں گی اور تمھارے بزرگوں کی بوی

بڑی محنتوں پر پانی پھیر دیں گی۔ دِلّی والوں جس زبان کو تم اپنی زبان بتاتے ہو عجب نہیں کہ اردو بجائے دلّی کی زبان کے چڑی مار ٹولے کی زبان بن جائے اور آدمیوں کی زبان سے جانوروں کی زبان سنو کہ جیسے دلّی والوں کی زبان سے جانوروں کے محاورے بن گئے۔ بے سوچے بات کرنے والا ہمیشہ ذلت اور ندامت کا شکار ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر وہ بات کرے جو بات مفید اور کارآمد بھی ہو، ان سے بات کرنے والا عزت پاتا ہے، لوگ اس کی خواہش کرتے ہیں اور یہ خود بھی دنیا میں مگن زندگی بسر کرتا ہے لیکن جو بات ہو عام فائدے کے واسطے ہو اور کوئی ذاتی یا خاص پہلو نہ ہو، بے سوچے بات کرنے والے کو یہ نہیں ہوتا کہ اونٹ کس کل بیٹھے گا اس لیے جب بات کرو پہلے تمام پہلو دیکھ لو۔ اگر غصہ بات کرنے میں آ گیا تو عقل جو ہر وقت انسان کی مددگار ہے۔ وہ غصے سے کہ غصے میں سمجھ کا مادّہ ہی نہیں ہوتا اور غصے کی ابتدا جنون اور انتہا پشیمانی ہے تو عقل جنون اور پشیمانی سے بھاگتی ہے اور تھراتی ہے اور عقل کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا اس لیے غصے سے بچو اور ہر بات میں عقل سے مشورہ لو۔

کسی حکیم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ دنیا میں جتنے اچھے اخلاق ہیں وہ ایک کلمے میں بیان کرو، حکیم نے جواب دیا کہ سارے اخلاق اچھے ہو جائیں گے صرف غصہ چھوڑ دو۔

مثال:

ایک زمیندار نے ایک باغ لگایا نیا شوق ہر وقت باغ ہی میں رہتا ہے، ایک ایک شے کی دیکھ بھال کرتا ہے، ایک ایک پودے پر نظر ہے اور ہر قسم اور ہر موسم کے پھل اور درخت لگائے ہیں۔ بھی بہار کے نظر فریب پھول، طرح طرح کے گلاب کے پودوں سے باغ کو گلزار بنا دیا ہے۔ تیسرے پہر کو جب پھول کھلتے اور کلیاں چٹکتی ہیں تو یہ زمیندار روش اور پٹڑیوں پر خراماں خراماں ٹہلتا ہے اور پھولوں کی خوشبو سے دماغ کو تر و تازہ اور نظر کو تقویت بے اندازہ پہنچاتا ہے۔ وہ تیسرے پہر کا وقت اور اس وقت جانوران خوش الحان کے چہچہے، پانی کے حوض میں پانی کا اُبلنا، چھلکنا چھوٹے جانوران خوش رنگ کی نازک نازک شاخوں پر اچھل کود، کوئل کی تو تو فاختہ قلندر مشرب کی کوکو سے اس وقت یہ ثابت ہو رہا تھا گویا یہ کہتی ہے کہ:

ہوائے صحرا فزائے گلشن، ضیافتِ عمر بے بقا ہے
مسافرو دیکھ لو تماشا سرائے فانی عجیب جا ہی
کہاں پھر آؤ گی اس چمن میں کہ چند روزہ ہے زندگانی
یہ خواب نوشیں ہے سیر کر لو کہ وقت اٹھنے کا آ گیا ہے
میان صحرا نوائے بلبل، فزائے گلشن، فغانِ قمری
صدائے کوس رحیل سمجھو جو دل میں تھوڑی سی بھی صفا ہے

ایک روز صبح کو یہ زمیندار ٹہلتا ہوا ایک روش پر آیا تو دیکھا کہ ایک گلاب کے نیچے نمناک زمین پر بکثرت گلاب کی سرخ اور گلابی گلابی پنکھڑیاں بکھری ہیں یہ حال دیکھ کر اس زمیندار کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، ایک ٹھنڈا سانس بھر کر ٹھہر گیا اور دل میں خیال کیا کہ اگر یہی حال ہے تو پھر باغ کا سرسبز ہونا محال ہے۔ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک بلبل اپنے معشوق کا رخصتی نظارہ دیکھ کر بے تاب ہو گئی اور ادھر:

گل کے عاشق کو یعنی بلبل کو

بوئے گل جا کے خود منا لائی

اور بلبل بھی جاں نثاری کا دم بھرتی کو بکھری ہوئی پنکھڑیوں پر آ کر لوٹنے لگی۔ زمیندار کو یہ راز و نیاز ان دونوں کا کب پسند آتا کہ اس کا اپنا نیا شوق بھی چرایا ہوا تھا۔ سمجھا کہ یہ اسی موذی کے لیے کونک ہیں خیر مرے دم میں دم ہے تو اس بلبل کو کب چھوڑتا ہوں۔ یہ خیال کر کے ایک جال لایا اور نہایت ہوشیاری سے زیر زمین دبایا اور دانہ ڈال کر آپ چھپ کر بیٹھ گیا۔ بلبل کو عشق گل نے نکما کر دیا تھا بے سوچے دانہ دیکھ کر جال پر ٹوٹ پڑی۔ زمیندار نے اس غریب کو ایک دانہ بھی نہ کھانے دیا کہ جال دھر گھسیٹا بلبل پھڑک کر رہ گئی۔ زمیندار نے اس لا ابالی فزا کے رہنے والے کو ایک چھوٹے اور پرانے پنجرے میں جو ٹوٹنے کی وجہ سے بان اور ٹاٹ کے ٹکڑوں اور سرکنڈوں سے گٹھا ہوا تھا، جو پہلے جانوروں کی بیٹ اور پرانے سڑے گلے پروں کی بُو سے بسا ہوا، تھا بند کیا۔ بلبل پنجرے میں پھڑکی لیکن سوائے لہولہان ہونے کے کیا ہو سکتا تھا۔ زمیندار بے رحم نے اپنے سونے کے چھپر میں جس کا ڈھانچ اور پھونس دھوئیں سے اور مکھیوں کی بیٹھنے سے کالا کالا چمک رہا تھا، سینکڑوں جالوں میں کیڑ پھدک رہے تھے اور جالوں میں گرفتار مکڑیاں بھن بھنا رہی تھیں، لٹکا دیا، بلبل پھڑک پھڑک کر بے حال ہو گئی، پر پھیلا، چونچ کھول، آنکھیں بند کر، منہ کھول لٹکانے لگی۔ جب دو چار روز گزر گئے ایک روز زمیندار اپنے گھر کے ماچے پر لیٹا مٹی کا حقہ جس پر کپڑے کی جگہ بان لپٹا ہوا پڑا گزگزا رہا ہے۔ بلبل سوچی کہ میں اپنا درد دل بیان کروں شاید اس کا دل پسیجے۔ یہ سوچ کر اپنے دکھے ہوئے دل کی فریاد اس طرح سے کہنی شروع کی:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

کیا بدنصیب میں ہوں گھر کو ترس رہی ہوں

ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑی ہوں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے

دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

آزاد مجھ کو کر دے اے قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اے باغ کے وارث، اے پھولوں کے والی! مجھے چھوڑ دے ننھے سے دل کو اب برداشت کی تاب نہیں۔ دیکھ اب پھڑک کر جان نکل جائے گی۔ تیرے کیا ہاتھ آئے گا۔ زمیندار نے کہا کہ میں تجھے کیوں چھوڑوں تیرا نالۂ دلکش میرے دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلبل نے کہا کہ اگر تجھے اپنے دل کی خاطر منظور ہے تو میں بھی دل رکھتی ہوں۔ زمیندار بولا کہ میں تجھ کو آزاد کر کے خوش کر سکتا ہوں تو مجھے خوش کر دے۔ بلبل نے جواب دیا اچھا میں تجھے اتنا بڑا خزانہ بتادوں گی کہ تو نسلاً بعد نسلاً خرچ کرتا تو ایک طرف گن بھی نہ سکے گا لیکن مجھے چھوڑ دے۔ زمیندار نے کہا کہ اگر میں نے تجھے چھوڑ دیا تو تو پردار ہے پھر تو کہاں اور میں کہاں، بلبل نے جواب دیا کہ جھوٹ کی صفت ہم بے زبانوں میں نہیں یہ صفت تو زبان والے ہی جانتے ہیں سو وہ جانیں۔ اچھا تو مجھے پنجرے ہی میں لے چل اور اسی جگہ جہاں تو نے جال بچھایا تھا۔ غرض جب زمیندار وہاں آیا تو بلبل نے کہا کہ بس یہیں سے کھود دے۔ زمیندار نے یہ سن کر وہاں کھودا تو دیکھا کہ کسی بادشاہ کا خزانہ مع تاج و تخت و چتر کے رکھا ہے۔ زمیندار بے انتہا خوش ہوا اور پوچھا کہ اے ننھے سے پرند تجھ کو یہ خزانہ اتنا نیچے دبا ہوا تو نظر آیا لیکن تھوڑی سی خاک کے نیچے دبا ہوا جال نظر نہ آیا۔ بلبل نے جواب دیا کہ اس مسئلے کو نہ چھیڑ یہ جو کچھ کیا میں نے ہی کیا اور اتنی مصیبت جو اٹھائی یہ سب میرے ہی کیے کو تک ہیں، قدرت نے جو خزانے ہر وقت ہمارے ساتھ کر دیے ہیں اور وہ ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جتنا خرچ کریں گھٹتے نہیں بڑھتے ہیں۔ میں نے ان سے کام نہیں لیا اور غفلت کی یہ اسی غفلت کا نتیجہ تھا۔ زمیندار نے پوچھا کہ وہ کون سے خزانے ہیں بلبل نے جواب دیا کہ وہ خزانہ خداوندی عقل ہے اور خزانچی سمجھ ہے کارکن اعضا ہیں اگر کسی بات میں ہم ان سے کام نہ لیں تو ہم خطاوار ہیں۔

دماغ آدمی کے واسطے یوں تو سب ہی نعمتیں ہیں۔ الا دماغ بڑے کام کی چیز ہے۔ دماغ تھکتا نہیں، اکثر صاحب بے سمجھے کہہ دیتے ہیں کہ بس جناب آپ دماغ پر زور نہ ڈالیں، دماغ سے اتنا کام نہ لیں یہ ایک حد تک درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اکثر اعضائے بدنی انسان میں ایسے ہیں کہ وہ حرکت ہی نہیں کرتے جیسے ہڈیاں اور اکثر عضو ایسے ہیں کہ حرکت کرتے ہیں لیکن جب ہم چاہیں جیسے ہاتھ پاؤں اور کسی کسی عضو میں حرکت ہے لیکن وہ ایسی حرکت ہے کہ ہمارے بند کیے سے اس کی حرکت بند ہی نہیں ہوتی جیسے قلب کہ جس وقت سے فیضانِ ناطقہ ہوتا ہے کہ حکم آخر تک متصل جاری ہے اور ایسے بھی عضو ہیں کہ ہم چاہیں تو حرکت نہ ہو اور وہ حرکت کر جائیں جیسے کسی جگہ کا پھڑکنا۔ اب دماغ بھی حرکت کرتا ہے اور برابر اس کی حرکت بھی جاری رہتی ہے لیکن قلب جیسی نہیں کہ ہم نہ تو قلب کی حرکت کو روک سکتے ہیں اور خدانخواستہ اگر قلب کی حرکت رُک جائے تو پھر ہم رُکے ہوئے قلب کو نہ کسی

طرح حرکت میں لا سکتے ہیں، زندہ رہ سکتے ہیں۔

قلب کی حرکت برابر جاری ہے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اسی طرح دماغ بھی حرکت میں لگا رہتا ہے لیکن دماغ کی حرکت قلب کی حرکت سے اتنی الگ ہے کہ قلب پر تو ہمارا قابو ہی نہیں۔ جس طرح چل رہا ہے بس ایک ہی صورت سے چلا جاتا ہے لیکن دماغ پر ہمارا اتنا قابو ہے کہ اگر دماغ میں برے خیالات ہیں تو ہم دماغ کو اچھے خیالات کی طرف پھیر سکتے ہیں اور ہاں دماغ کا فعل کبھی رُک بھی جاتا ہے جیسے بے ہوشی اس وقت تو جتنے کام دماغ سے متعلق ہیں وہ سب رُک جاتے ہیں نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے نہ حرکت ہی کر سکتا ہے، نہ چھونے کا مادّہ انسان میں باقی رہتا ہے تو اس وقت انسان زندہ تو ہوتا ہے لیکن گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔ ہاں اور اگر قلب کی حرکت رُکی تو موت۔

غرض دماغ کو قدرت نے عجیب انمٹ طلسم بنایا ہے تو پھر ہم دماغ سے کیوں نہ کام لیں اور بات کرنے سے پہلے ہم کیوں نہ سمجھ لیں۔

اور بات ہی کرنے میں دنیا کی تمام باتیں موقوف ہیں تو بے سوچے بات کرنے کو گناہ سمجھو۔ جب بات کرو تو کوئی خاص لہجہ نہ ہو، بناوٹ نہ ہو، بے تکان بات ہو، گلے پر زور نہ ڈالو، بے ساختگی ہو، جلد نہ بولو، لفظ الگ الگ ہوں، ہر جملے کے بعد ذرا سا دم لے لو تاکہ اپنی بات کو تم بھی سمجھ لو اور سننے والا بھی سمجھ جائے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ پہلے بات کو تو لو پھر منہ سے بولو۔ دلیل سے غالب ہونا قوت کے غالب ہونے سے زیادہ بہتر ہے۔

آدمی کا حال اچھا ہے یا برا یہ تو باتوں ہی سے کھل جاتا ہے۔ خوش بیانی نعمت ہے انسان کے واسطے، اگر انسان خوش بیان نہیں تو ناقص ہے اور علم بیان کو زیور ہے۔ بات کرنے میں لفظوں کی نشست اور معنی کا خیال رہے۔ بولو تو کام کی بات بولو، تشبیہ اور استعارہ اگر لطیف ہو تو بیان میں جان پڑ جاتی ہے۔ آدمی وہی ہے جو فصیح اور بلیغ ہو ورنہ بولتا تو جانور بھی ہے۔ فصاحت کی خوبی کچھ نثر ہی میں ہے اور نظم کی قیود میں ایسی نہیں۔ باتوں ہی کا پھیر ہوتا ہے۔ خلافت کا زمانہ ہے ایک لڑکا زدہ حال اتفاقاً دربار خلافت میں داخل ہو گیا اور ہکا بکا ہو کر بہ نظر حیرت اس سنہری اور بلند ایوان شاہی کو دیکھ کر یہ نہ سمجھا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ حالت ایک سردار شاہی نے دیکھ کر اس لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا کہ لڑکے کیا دیکھتا ہے۔ لڑکا بولا کہ مجھ کو یہ حیرت ہے کہ یہ عمارت عالی شان اور اتنا بلند مکان کیوں بنوایا کہ جس کی بلندی نے چاروں طرف جو غریبوں کے مکان ہیں ان کی ہوا اور سورج کی شعاعیں جو صحت کے واسطے نہایت ضروری ہیں، روک دیا اور اس مکان کے رہنے والے کی صحت کیا اچھی ہو سکتی ہے جو شہتیروں کے نیچے رہتا ہے لطیف ہوا سے محروم رہ جاتا ہے۔ کسی کا کیا اچھا قول ہے کہ جب تک ہم پھونس کے سائے میں رہتے تھے ہمارے بدن شہتیر تھے اور جب سے شہتیروں کے سائے میں رہنے لگے تو ہمارے بدن پھونس ہو گئے اور اس

کے بنانے والے نے کیا دو چار صدیوں کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔

خلیفہ کے کان ان لفظوں سے آشنا کب تھے۔ طبیعت عالی بدل گئی، جھڑک کر قریب بلایا اور ارشاد ہوا کہ او گستاخ بے شرم کہ تیرا سر اڑا دیا جائے۔ لڑکا بولا کہ تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اگر تو سمجھدار ہے تو تجھ سے ڈرنا کیا اور کم سمجھ ہے تو تیرا سمجھانا فضول۔ بادشاہ نے سن کر درباریوں سے کہا کہ ایسے گستاخ کا کیا علاج۔ سلطانی مزاج کو بگڑا ہوا دیکھ کر سب تاڑ گئے اور ایک زبان ہو کر بولے کہ ایسے کا سر قلم کر دیا جائے۔ لڑکا یہ سن کر ہنسا اور بولا کہ کیا اچھا کسی نے کہا ہے کہ ایسی سجا رعبہ کی زگ میں، تیرے دربار سے خدا بچائے کہ تیرے مصاحب فرعون کے مصاحبوں سے بھی بدتر ہیں کہ جب فرعون نے اپنے درباریوں سے پوچھا موسیٰ کے بارے میں کہ جب تک موسیٰ کا سر تن سے جدا نہ کیا جائے گا یہ شرک نہ مٹے گا، درباریوں نے سجدہ کر کے عرض کی کہ خداوندا اس کے نیک اور سمجھدار ہونے میں تو کلام نہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے کو جو ذرا سی بات میں جنت لٹا دے سجدہ نہ کرے اور اپنی ضد پر اڑا رہے، اس کو کچھ مہلت دی جائے کہ یہ آدمی ہے اور کام کا آدمی ہے۔ بس یہ فقرہ سن کر بادشاہ کی نظر اپنے اوپر پڑی اور خیال آیا کہ میرے درباری لاکھوں روپیہ اور خلعت لے کر حقیقت کو چھپاتے ہیں اور یہ لڑکا کیسا ناصح ہے کہ اس نے آن کی آن میں مجھے سمجھا دیا یہ خوشامدی میرے دوست نہیں روپے کے دوست ہیں یہ لڑکا میرا سچا رفیق ہے۔ اس لڑکے سے فرمایا کہ تم ایک لاکھ اشرفی خزانہ شاہی سے لے لو۔ لڑکا بولا میں کیوں لوں اور اپنی آزادی اور چند روزہ زندگی کو کیوں الجھن میں ڈالوں۔ یہ سن کر بادشاہ نے وزیر سے فرمایا کہ تم اس بچے کو لے جاؤ اور جو تعلیم میں صرف ہو کرو، میں اس کو اپنا وزیر بناؤں گا۔ غرض یہ پڑھا اور قابل وزیر بنا۔ اس لڑکے نے باتیں ہی تو کی تھیں اگر ہم بھی سوچ کر بولیں تو کیا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ علم وادب ہی وہ علم ہے کہ جس سے زندگی میں انسان کو چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن ادیب ہونا تقریر پر موقوف ہے اور تقریر وہ ہے جس میں ادائے بیان اور موضوع اور معنوں سے بحث ہوتی ہے بس جو کلمہ زبان سے نکلے وہ کلمہ فصیح ہو کر فصاحت سننے والے کو خود ہی متوجہ کر لیتی ہے۔ کلام میں ترتیب اور ایسی بلاغت ہو کہ سننے والا فوری سمجھ جائے اور اس کے واسطے یہ ضروری ہے کہ علم لغت اور علم صرف سے واقف ہو اور بیان میں معنی کا لحاظ ہو اور اپنی اپنی جگہ وقف ہو۔ تجوید ہو، تجوید کے معنی یہ ہیں کہ بغیر تکلف اور کمی بیشی کے لفظ اپنے اپنے مخارج سے کمال لطافت اور خوبی سے ادا کیے جائیں اور ان میں تصنع نہ ہو اور حروف حلقی و وسطی و شفتی کو نہایت جانچ جانچ کر بلا کسی بناوٹ کے جو تقاضا طبیعت کا ہو ادا کیے جائیں اور وقف کے معنی رکھنے کے ہیں اور ٹھہرنے کے اور قاریوں کی اصطلاح میں نطق کو کسی لفظ کے حرف اخیری پر قطع کرنے کو کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وقف میں ہمیشہ لفظ کا حرف آخر ساکن ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے: جیسے قل ہو اللہ احد، احد میں کو دال کو پیش ہے لیکن بحالتِ وقف ساکن ہو گئی۔ اب تحریر اور خوشخطی کو علم اخلاق میں بڑا دخل ہے اور تحریر کی

دو قسمیں ہیں ایک بلحاظ قامت اور دوسرے بلحاظ نوعیت کے۔ قامت کے یہ معنی ہیں کہ لکھنے والے کی طرز تحریر سے حرف کی ہیئت اور اس کی مقدار معلوم ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک جلی دوسرا خفی۔ جلی کے معنی ظاہر اور روشن کے ہیں لیکن حقیقت میں کسی کا جلی اور خفی ہونا یا امور اضافیہ میں سے ہے۔ مثلاً ایک چیز بہ نسبت دوسرے کے جلی اور بہ نسبت تیسرے کے خفی ہوتی ہے اس بنا پر اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن لکھنے والے اپنی اصطلاح میں روزمرہ کی معمولی تحریرات کو اور دفتروں اور مراسلات کی مقدار تحریر سے جو ذرا بڑا ہو اس کو جلی کہتے ہیں۔ مثلاً مضمون بڑا کی وقعات خطِ جلی میں اور ان کا خلاصہ خطِ خفی میں ہے۔ خفی کے معنی چھپے ہوئے اور پوشیدہ کے ہیں لیکن کاتبوں کی اصطلاح میں خطِ خفی کے یہ معنی نہیں کہ کسی صحیح النظر کی بصارت سے مخفی ہو بلکہ مراد اس سے وہ تحریر ہے کہ جو مقابلے میں جلی کے خفی ہو جس کا ذکر ابھی آچکا ہے اور نوعیت تحریر اسے کہتے ہیں کہ جو اپنی ذاتی قابلیت کے ہو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ تحریر میں کس قسم کی گنجائش ہے تو وہ دو قسم پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ ایک حروف مفرد اور دوسرے مرکب، مفرد اس حرف کو کہتے ہیں کہ کہ حرف جس طرح سے واضع نے وضع کیا ہو ایک دوسرے سے الگ الگ لکھنے میں آجائیں جیسے (ص) اور اسی طرح سے اور باقی مرکب میں اور مرکب کس کو کہتے ہیں جو ہجے کرنے والے حرف ایک دوسرے سے ان کے قاعدے یا مقررہ مقام پر جیسا ان کا دستور ہے ملا کر لکھے جائیں۔

اب مرکب کی پانچ قسمیں ہیں نسخ، نستعلیق، گلزار، ریحان، طغرا، شکستہ۔ نسخ کے معنی ہیں تحریر کے اور نسخہ بھی اسی سے مشتق ہے۔ خطِ نستعلیق عموماً فارسی میں مستعمل ہے۔ عرب نے عربی کو تیز کرنے کے واسطے نسخ میں لکھنا شروع کیا تا کہ دیکھنے میں تیز ہو اور لفظ نستعلیق، نسخ اور تعلیق سے مرکب ہے۔ نسخ بمعنی لکھنے اور تعلیق کے معنی لٹکانے کے ہیں اور مراد اس سے سنبھال کر لکھنا ہے۔ خطِ نسخ میں نوک پلک نہیں ہوتی جس قدر کہ تعلیق میں اسی وجہ سے نستعلیق لکھنے میں بہ نسبت نسخ کے دیر لگتی ہے۔ خطِ گلزار خواہ وہ خطِ نسخ ہو یا نستعلیق جب اس میں بیل بوٹے بھر دیے جائیں تو اسی خط کو خطِ گلزار کہتے ہیں اور گلزار پھولوں کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ فارسی ہے۔ عربی میں لفظ ریحان کے معنی بالنگو کے ہیں، جس خط میں پھول اور بوٹے درج کیے جائیں اس کو خط ریحان کہتے ہیں۔

خطِ طغرا۔ طغرا ایک جانور پرندے کا نام ہے جس کی ہم شکل خطِ طغرا لکھا جاتا ہے اور یہ پروں کی مثال ہوتا ہے اور لفظ طغرا کو اگر طوئے (ط) کا زیر پڑھیں تو یہ ملے ہونے کے معنی دیتا ہے۔ یہ خط ایک پیچیدہ خط ہے جس کو بادشاہ اکثر اپنے فرمانوں میں استعمال کرتے ہیں جیسے سلطانِ روم یا بادشاہ کابل اپنے سکوں میں اب تک استعمال کرتے ہیں اور خط شکستہ اکثر دفاتر میں مستعمل ہے۔ جن کو زیادہ لکھنا ہوتا ہے جلدی کی وجہ سے لکھتے ہیں اور شکستہ کے معنی ٹوٹے ہوئے کے ہیں۔ شکستہ تحریر کا پڑھنا جب تک مہارت کامل نہ ہو دشوار ہے۔

اب لفظ بولنے والا معنی کے واسطے لفظ بولتا ہے اور بعض لفظ بے معنی بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی دو

قسمیں ہیں۔ موضوع اور مہمل۔ موضوع اسے کہتے ہیں جو کسی خاص معنی کے واسطے وضع کیا گیا ہو جیسے رب کے معنی پروردگار کے ہیں اور مہمل اسے کہتے ہیں جس کے کچھ معنی نہ ہوں جیسے روٹی ووٹی۔ یہاں ووٹی کا لفظ تابع مہمل ہے ورنہ ووٹی کے معنی کچھ نہیں۔

غرض میری اس چھوٹے سے رسالے سے یہ ہے کہ تم جو بات کرو پہلے سوچ سمجھ لو اور جو بات کرو وہ تمھارے یا دوسرے کے فائدے کے واسطے ہو۔ اگر ہم کو کچھ نہیں آتا تو ہم حلم اور بردباری سے کام لیں اور کم بولیں یہ تو ہمارے اختیار میں ہے اور بردباری اور حلم راحت کا دروازہ اور عزت کا گھر ہے۔

میں حیران ہوں کہ لوگ زمانے کو برا کہتے ہیں ہر چند کہ برائی ہم ہی میں ہے۔ زمانہ تو یکساں چل رہا ہے۔ دنیا میں جمع کی ہوئی دولت یا کسی صورت سے ہاتھ آئی ہوئی دولت فخر اور ناز کے قابل نہیں۔ دولت تو نہایت چنچل ہے ایک جگہ کہاں رہتی ہے۔ آج آئی اور کل گئی لیکن عقل اور علم، صحت اور اعضا یہ خدا کی دی ہوئی دولتیں ہیں۔ ان کی تم حفاظت کرو کہ یہ تمھاری سچی ہمدرد اور ہر وقت کی خادم ہیں اور اخلاق نیک کہ یہ انسان کا لباس ہے۔ دنیا میں جیو لیکن اس صورت سے جیو کہ کبھی کوئی تم پر اعتراض نہ کرے جب ثابت ہو جائے ہمارے تمام کام اور معاملات بات ہی کرنے پر موقوف ہیں تو پھر دنیا میں آ کر سب سے پہلے باتیں کرنے اور باتیں سننے کا طریقہ کیوں نہ سیکھیں۔ بات سننے کا طریقہ یہ ہے کہ بات سنو تو نہایت غور سے دل لگا کر سنو اور جب تک بات کرنے والا چپ نہ ہو جائے تم کچھ نہ کہو۔ بات سنو تو چہرہ اپنا بشاش رکھو اور جو جواب تمھارے ذہن میں آئے اس کے تمام پہلو غور سے سوچ لو اور جو لفظ زبان سے نکلے اس کے زیر و زبر و پیش کا خیال رکھو مثلاً لفظ حرکت ہے حرکت نہ کہو اور اتنی جلد نہ بولا کرو کہ دوسرے کی سمجھ میں ہی نہ آئے غرض بات کرنے میں تین باتوں کا خیال رہے اول بلاغت دوسرے ترتیب تیسرے وزن کلام۔ بلاغت کے معنی پہنچنے کے ہیں اور اصطلاح میں اس علم کو کہتے ہیں جس میں کلام کے مقتضائے حال سے تطبیق ہو۔ ترتیب کلام میں علم نحو سے بحث کی جاتی ہے اور وزن کلام اس کو کہتے ہیں جس میں کلام کے موزوں ہونے سے بحث کی جائے۔ بلاغت کی بھی حسب ذیل قسمیں ہیں اول معانی دوسرے بیان تیسرے بدیع۔ علم معانی اس کو کہتے ہیں جس میں لفظ مقتضائے حال سے مطابق کیا جائے اور علم بیان اس علم کو کہتے ہیں جس میں کلام کی وضع اور مختلف معانی سے بحث کی جائے یہی اعتبارات ہیں جن کی وجہ سے کلام میں بلاغت کا حسن ذاتی پیدا ہو جاتا ہے۔ بدیع کے لغوی معنی نادر و عجیب کے ہیں اور اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جس میں کلام کی زینت اس کے معنون میں پیدا ہو۔

سرائے کا نقشہ

میر باقر علی داستان گو

بارش ہو رہی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ خدا خدا کر کے سرائے کی صورت نظر آئی۔ بے ڈول سنگ خارا کے ٹکڑے اور مٹی سے چنے ہوئے دروازے کے پاکھے بانس کے کواڑ۔ جو بانس سے بندھے ہوئے۔ ہوا کے جھونکے سے کبھی بسار کے پیڑ سے ٹکرا آتے ہیں اور کبھی بھیگی ہوئی کچی گرنے والی دیوار کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ بیلوں کے کھروں سے روندا ہوا گوبر سیاہ سڑی ہوئی سڑی مٹی ساگھاس بھس کے تنکے تلچھے تلچھے جھاگ کیچڑ سا کالا پانی دروازہ سے بہتا ہوا چلا آتا ہے اور ایک مٹی کی ٹونٹی اور کنارہ ٹوٹی ہوئی ہانڈی کبھی اوندھی اور کبھی سیدھی ہو کر پانی کے ساتھ لڑھکتی ہوئی چلی آتی ہے۔ مسافر بھیگا ہوا لباس پہنے ہوا کے سرد جھونکوں سے دل کانپ رہا تھا۔ ہونٹ نیلے ہو گئے تھے مگر لوگوں کے ہنسنے کے خیال سے تھرتھری کو ضبط کر کے ٹٹو کو بڑھا اندر آیا تو دیکھا کہ سرائے کے بیچ میں ایک کنوان ہے کہ پانی سے بھر کر ابل رہی ہے۔ سارے صحن میں ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ بیسیوں چھکڑا کھڑا ہوا جس پر پرانی سرکیاں اور بھیگے ہوئے دولڑے پڑے ہیں۔ بیلوں پر پرانی گدڑی کی جھولیں بھیگی ہوئی پڑی ہیں جن سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ چھکڑے والے بھیگے ہوئے پتھروں کے چولہے بناتے سیلے ہوئے ایندھن کو پھونک رہے ہیں۔ دھواں اُٹھ رہا ہے۔ چہرہ سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ بھرتیوں میں دال چڑھا رکھی ہے۔ لوہے کی پراتوں میں چنے کا سا آٹا گوندھا ہوا ہے۔ چار طرف گلے ہوئے سیاہ پھونس کے چھپر جس کا جگہ جگہ سے پھونس ہٹ گیا ہے اور دھوانس لگے بانسوں کا ٹھاٹھر اور پرانے تان کے بند نظر آرہے ہیں۔ کسی پر مٹکے کا ٹھیکرا اور کہیں چیتھڑا لٹکا ہوا گوندا ڈھکا ہے۔ کئی چھپروں پر نیم کے درخت کا سایہ ہے۔ ان پر زرد زرد پتیاں اور سوکھے ہوئے نیم کے درخت تنکے کوؤں کی گرائی ہوئی ٹہنیاں جو بارش سے پھول گئی ہیں۔ کچھ کھمبیاں جن کو عام لوگ بلی کا موت کہتے ہیں چھپروں پر نکلی ہوئی ایک طرف کو بڑے چھپر کے نیچے بھٹیاری پیڑھی پر بیٹھی ہے۔ جس کا کالا رنگ، او پلا سا چہرہ، چپٹیاں سی

آنکھیں، چپٹی ناک، گروا سے ہونٹ اور موٹے موٹے ہاتھ پاؤں۔ سر میں سرسوں کا تیل جو مسافروں کے چراغوں سے بچا پڑا ہوا۔ سیدھیاں گوندھی ہوئیں جن میں موباف کی جگہ دیسی سوت کا کلاوہ زرد و سرخ پڑا ہے۔ بند ہو کے بلوں میں مٹی اٹی ہوئی۔ ہاتھ گلے میں پیتل کانسی چاندی کا زیور، انوٹ، بچھوے، پنگری، چنگی، بکیاں، بلے، لچھے، ہنسیا، گجری، تختی، چوکڑا، مرکی، بندا، کنگن، پائل، اچری، ڈہار ہار، ہمسیل، مالا، کنٹھ مالا، موہن مالا، پچلوا، حلقوا، جھنجھن، بندن، چھمن، پچھلی، بازو، بجنی، ٹیکا، جھوا۔ سر پر قند کا سرخ دوپٹہ۔ لال تلک نیلی سوسی کا پاجامہ۔ ادھوڑی کی جوتی جس پر ریشم کی کڑیاں بنی ہوئیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف سوکھے ہوئے آم و جامن کے پتے۔ دس بارہ گرہ کی دونوں طرف جھلسی ہوئی لکڑی جس سے کوڑا جھونک رہی ہے۔ آگے کے چولہے پر گلا ٹوٹے ہوئے مٹکے کا پیندا رکھا ہے جس پر کئی روٹیاں ڈال دی ہیں۔ ہاتھ میں پیڑا ہے۔ کسی ہانڈی میں دوئی چلاتی ہے کسی کا نمک چکھا۔ ایک مسافر چولہے کی کے راۓ میں روٹیاں سینک رہا ہے۔ کسی کا بچہ رو کر روٹی کا تقاضہ کر رہا ہے۔ میاں بھٹیارے ایک طرف مٹی کا حقہ، جس پر ارنی کا نیچا بندھا ہوا، کپڑے کے جگہ بان لپٹا ہوا، مٹی کی چلم اونٹ کی مینگنی کی آگ سے بھری، کھانس کھانس کر دم لگا رہا ہے۔ ہم بھی پہنچے۔ بی بھٹیارن ہم کو کوئی جگہ بتا دو۔

بھٹیاری۔ میاں مسافر وہ سامنے کی کوٹھری خالی ہے۔

میں۔ ٹپکتی تو نہیں؟

بھٹیاری۔ ٹپکنے وپکنے کی تو خبر۔

میں۔ وہاں آیا تو دیکھا گیلی کوٹھری دو کڑیاں چھت کی چٹخی ہوئیں۔ جگہ جگہ ٹپکا لگا ہے اور زمین میں چھوٹے چھوٹے گڑھے گئے ہیں۔ دھوانس کا سرخی مائل بودار پانی جمع ہے۔ جب بوند پڑتی ہے تو چاروں طرف پانی اچھلتا ہے۔

مسافر۔ میاں مہتری جی آؤ۔

بھٹیارہ۔ میاں آیا۔

مسافر۔ بھائی یہاں تو ٹپکا لگا ہے۔

بھٹیارہ۔ میاں آجکل ٹپکے کی نہ کہو بڑے بڑے اسٹیشنوں میں لگا ہوا ہے۔

مسافر۔ ایک چارپائی تو لا دو۔

تھوڑی دیر میں ایک چارپائی آئی جس ٹوٹے پھوٹے بان بھیگ کر تن گئے ہیں۔ کان نکلا ہوا دو پایہ اونچے دو نیچے۔ بھٹیارہ نے لا کر بچھائی اور ایک ہاتھ سرہانے کے پایہ پر رکھ کر زور دیا تو ایک چرانا ہوا اور پائے گھٹ سے بیٹھ گئے۔

بھٹیارہ۔ میاں دو پیسے ہو گئے۔ بھئی اچھا۔ آخر مجبور ہو کر اسی پر میلا ہوا بچھونا بچھا کر لیٹ رہا۔ تھکا ہوا تھا کچھ نیند آ گئی۔ رات کے دو بجے ہو گئے کہ گرج کی آواز سے آنکھ کھلی۔ بجلی چمکی اور موسلا دھار پانی پڑنے لگا۔ ٹپکا شروع ہوا۔ کبھی چارپائی کو ادھر کبھی ادھر کھینچا۔ عورتوں سے سنا کرتے تھے کہ دھار اوپر دھار اور سوچتے تھے یہ کیا محاورہ ہے آج معلوم ہوا کہ شاید اسی موقع کو کہتے ہوں گے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ بارش ذرا تھم گئی تھی۔ مسافر غریب نے اپنی راہ لی۔

مخزن: ستمبر 1908ء

فقیر کا تکیہ

میر باقر علی داستان گو

شام۔ تھوڑا سا دن ڈوبتا سا سورج، راستہ کے دونوں طرف کھنڈرات، اینٹ، پتھر، چونا، مٹی کے ڈھیر، خودرو سبزے سے ڈھکے ہوئے جن پر کمزور سورج کی شعاعیں پڑ کر اچٹ رہی ہیں۔ کہیں دیوار کا کچھ حصہ جو باقی رہ گیا ہے، اس کی کگنی پر شاما بول رہی ہے۔ دور کسی املی کے درخت کی پھننگ پر بیٹھا ہوا پنچھی چہچہا رہا ہے۔ مغرب کی طرف پھٹے پھٹے بادل کا سلسلہ جو ساوی انجم ہوا میں رکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اتنے بطی السیر ہیں کہ نظر ان کی حرکت محسوس نہیں کر سکتی۔ آفتاب کی کرنوں نے ان کو نارنجی رنگ دیا ہے۔ ان بادلوں کے نیچے ابابیلیں جھرست کھا کر سریلے راگ گا رہی ہیں اور ہوا سنہ پر لیے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور کچھ ابابیلیں جو چکر لگاتے وقت بچھڑی سے پیچھے رہ جاتی ہیں تو پھر ہوا پر تن کر جھومر میں آملتی ہیں۔

آثار صنادید۔ کہیں دروازہ کی محراب، جو کسی جگہ سے کھل گئی ہے اور فلک کی سرد مہری نے سیاہ کر دیا ہے اوپر دو تین کنگورے باقی ہیں جن پر چیل کوؤں کی بیٹ کے سفید سفید نشان۔ کہیں دالان کی بنگڑیدار کا کچھ حصہ۔ کہیں شہ نشین کی کرسی، کہیں چبوترے کا نشان، کسی جگہ دو تین سیڑھیاں، کہیں...... لداؤ کی چھت کا کونہ، کہیں حوض کا کنارہ، کہیں طاق کا ابھارہ، کہیں دیوار میں انگوٹھے کی علامت، کہیں کانس کا ٹکڑا، کسی جگہ مٹے مٹے نقش و نگار، کہیں پھول، گوکھ در یچے، کسی دیوار میں تکیہ دبے ہوئے۔ غرض وہ کہنہ عمارتیں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان حال سے اگلے زمانہ کی صنعت اور کاریگری، گویا زبان حال سے اظہار کر رہی ہیں

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدید ست صنادید عجم را

تکیہ۔ الختصر میں اور شہر کے تماشائی جو میلہ کر کے آ رہے ہیں۔ دلی دروازے سے ایک میل کے فاصلے پر سائیں بگہ شاہ کا تکیہ ہے۔ بگہ شاہ، گواڑ شاہ کے مرید اور دمڑو شاہ آپ کے دادا پیر ہیں اور بگہ شاہ کے دو مرید ہیں۔

لیا شاہ اور جھنگی شاہ گویا بے دام کے غلام ہیں۔ میں تکیے کے قریب آیا تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے پر دو تین درخت بڑ اور پیپل نیچے بلند سڑک کے دونوں طرف سایہ دار اور لب سڑک مسجد کا ایک چبوترہ، جس کے قریب شاہ صاحب کا کچا ڈھابہ، جس کی دیواروں کی مٹی بارش سے دھل گئی ہے اور منڈیروں پر کنکر ٹھیکریاں نکل آئی ہیں۔ اس ڈھابہ کی پشت کی طرف دس بارہ گز لمبا لکڑی کا پرنالہ جس کو بان سے باندھ کر منڈیر سے اٹکا رکھا ہے۔ پرنالے کے دونوں طرف جو اچھل اچھل کر برساتی پانی بہا ہے اس نے مٹی کھلا کر منڈیر سے زمین تک لمبا گھونڈ کھول دیا ہے۔ اندر کوٹھری کے تھمبے ان اپلے، کچھ جنگل کے چنے ہوئے ارنے کیکر کی خار دار جھانکڑ، گلی ہوئی بکی جوار کی جڑیں، کچھ بوسیدہ چھپر کا پھونس گیلا پڑا ہے اور اس ڈھیر کے قریب ایک بکری اور دو اس کے بچے بندھے ہوئے۔ سوت اور مینگنیوں سے چونکہ برسات ہے ایک سڑا ہوا بھبکا نکل رہا ہے۔ ڈھابہ کی منڈیروں پر پرانے پلیلہ کے بورے کے ٹکڑے پڑے ہیں اور ان کی حفاظت کے واسطے پرانے بان کے توڑوں میں، کہیں مٹکے کا گلا بندھا ہوا ہے۔ کس طرف اینٹ باندھ کر لٹکا دی ہے۔ کوٹھری کے دروازے کے قریب ایک مٹکا جس کا ٹونی لگ کر گلا جھڑ گیا ہے...... کائی کے ٹکڑے جو خشک ہو کر تیج گئے ہیں، مٹکے کے چاروں طرف لپٹے ہوئے۔ پانی مٹکے کے پیندے میں گل آلود رہ گیا ہے اور ہزاروں کیڑے اس میں کلبلا رہے ہیں۔ چپنی کی جگہ ٹھلیا کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ڈھکا ہے اور اوپر اس کے ایک دودھ کا کلھڑا کنارہ ٹوٹا ہوا، پانی پینے کو ٹھیکرے میں اوندھا ہوا۔ چوکھٹ میں اندر کی طرف ایک گدڑی بچھی ہوئی، اس پر سائیں لنگے شاہ بیٹھے۔ پچاس پچپن برس کا سن نیچی کڑ بڑی داڑھی۔ نشہ میں جو رال ٹپک کے وقت بہی ہے، اس سے داڑھی کے بال چپک کر بتیاں سی بن گئی ہیں، سر پر ایک گاڑھے کا میلا پرانا چیتھڑا لپٹا ہوا۔ کان کی لووں میں پیتل کی دو بالیاں، گلے میں گزی کی دوہری کرتی جس کا ابرا پھٹ گیا ہے اور فقط استر باقی رہ گیا ہے، ایک آستین کہنی پر سے نکلی ہوئی اور دوسرے شانے پر سے ندارد۔ کرلوئی میں کوہڑی کے قریب ایک جیب، جس میں تمباکو کی چمڑے کی تھیلی جس کے منہ پر ڈورا بندھا ہوا اور ڈورے کے سرے پر ایک ٹوٹی ہوئی جھنگی کوڑی بندھی ہوئی۔ برسات کی پن بھری ہوا سے جو تمباکو کا گڑھ پگھلا ہے تو بالشت بھر تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کرتی یہاں سے ہے کس کپڑے کی۔

ٹانگوں میں نیلا لنگ جس پر پسینہ آ کر جو خشک ہوا ہے تو جس طرح کسی قطعہ پر موش دنداں بناتے ہیں، پسینہ کے شوربت سے ایک سفید جال سا بن گیا ہے۔ پاؤں میں ایک لعل منکا، جس کو رتوا کہتے ہیں ٹخنے کے قریب ڈورے سے بندھا ہوا، آگے ٹوٹے ہوئے مٹکے کا ایک کڑیل دھوئیں سے کالا، راکھ بھری ہوئی اور کڑیل کے گرد چلمیں جو الٹی گئی ہیں تو گل تمباکو کے جلے ہوئے چاروں طرف پڑے ہیں۔ راکھ میں ایک تھیواں اپلہ دبا ہوا، کنارے پر اپلے کے تھوڑی سی آگ اور اس پر کچھ کرسیاں رکھی، شاہ صاحب لنگی کا آنچل دونوں ہاتھوں سے

پکڑے جھل رہے ہیں۔ کبھی منہ سے پھونکتے ہیں، چہرے کا رنگ لال ہوگیا ہے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ کڑیل کے قریب اک متی کا مدار یہ حقہ جس پر نزسل کا میچہ، نیچے پر جو میلی دھجیاں لپٹی ہیں وہ سٹ کر ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں اور پھٹا ہوا نیچہ نکل آیا ہے، گنا سڑ کر چیک پیدا کر لایا ہے اور حقہ پینے والوں نے جو گنا دبا دبا کر پیا ہے، گنے کے دونوں طرف گڑھے پڑ گئے ہیں آپ نے سرا جس کو نہرو کہتے ہیں جلا ہوا اس پر ڈنڈی اور کنارہ ٹوٹی چلم رکھی ہے اور شاہ صاحب کا سامان فقیری، سمرنکا، منکا، سیلی، تاگے، کنٹھا، جھولی، لوٹا، تابنا میاں، مندرہ، حلقہ، تسبیح، الفا، کفا، سونٹا، کونڈی، کشتی کملی، تسلا، جھلی، مالا، بندا، تسہ، چھڑی، کھڑاؤ، لنگ، جبہ، چادر، خرقہ، صافہ، ہاتھوں میں تانبے پیتل ہوہے کے کڑے پڑے، گودڑی پر بیٹھے بھنگ کے نشے سے ہونٹ خشک، آنکھیں جھکی ہوئی لال لال۔ بار بار ہونٹ کی نظر پڑی تو بآواز بلند کہا میر صاحب بابا حقہ پیتے جاؤ میں نے صاحب سلامت کی اور شاہ صاحب نے ایک گھما اینٹ کی طرف اشارہ کیا، میں بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے اپنے چیلے کو آواز دی بیٹا لے شاہ چلم بھرو۔ لیکن آگ جھاڑ کر اور دھو کر رکھنا جھجی حقہ تازہ کرو اور وہ جھاؤ کا تنکا پڑا ہے آبنے میں بھیر لو۔ بیٹا یہ میر صاحب داستان گو ہیں، بڑے اٹ کی سٹ لڑاتے ہیں۔ یہ امیروں کے کھلونے ہیں، ان کے تو دیدار ہی مشکل سے ہوتے ہیں۔ میاں میر صاحب آپ تو ہفتہ اور منگل کو اپنے مکان پر داستان کہتے ہیں ٹکٹ لگا کر۔ میں ان دونوں کو داستان میں بھیجوں گا۔ آپ داستان میں مرشد کا ادب صبر و قناعت کی خوبیاں، باد بود کے فائدہ، نفس کشی کے طریقے، ان کو سنا دینا۔ آپ تو ہر قسم کے مفید عام مضمون بیان کرتے ہیں۔ میں تو ان دونوں کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ گیا، یہ ایسے نجر ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں۔

کانا باقی

میر باقر علی

انتخاب

میر باقر علی داستان گو کی داستانوں میں ایک داستان کانا باقی مجلس ترقی ادب لاہور نے 2011ء میں از سر نو شائع کی ہے۔ ذیل میں اس داستان کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

(1)

اکبر بادشاہ کیسا بادشاہ تھا، اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دلی کی اکثر بڑی بوڑھیاں، میں نے اپنے کانوں سے سنا وہ یہ کہتی تھیں کہ دودھ پینے والے بچے فرشتوں کی زبان جانتے ہیں۔ کہیں یہ فقرہ اکبر نے بھی سن لیا۔ خیال آیا کسی ڈھب سے فرشتوں کی بولی بھی سنیں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ آسمانی زبان ہے، زمین کی زبان سے بہت بہتر ہوگی۔ غرض یہ باتیں سن کر اور سمجھ کر حکم دیا کہ چند بچے پیدا ہوتے ہی ایک محل میں داخل کر دیے جائیں اور دودھ پلانے والوں کو حکم دے دیا کہ دودھ پلا کر باہر آ جائیں اور آپس میں نہ کوئی بات کریں اور نہ کچھ اشارہ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب بچے بڑے ہوئے تو ایک روز حکم دیا کہ ان کو دربار میں لاؤ۔

اب اکبر کا دربار، اس کی شان اور شوکت کا کیا پوچھنا۔ نقارۂ جہانیاں مدار پر چوب پڑ رہی ہے۔ نوبت کی گھور، جہانگیر کا زمزمہ، توپوں کی شلکیں اور وہ اکبری نورتن، باکمالوں کا مجمع۔ زمانہ چاہے تو باکمال بنائے لیکن نہیں بناتا، اور جو بنتے ہیں ان کا ایک جگہ جمع ہونا مشکل سے مشکل ہے۔ دروازۂ قلعہ پر راستے کے دونوں طرف فوجوں

کے پھیرے، سواروں کے رسالے، سانڈنی سواروں کے ہنگر، زنبورچیوں (کا) فرقہ بہ کل، مانند تختہ ہائے گل، مختلف رنگ کی وردیاں، فیلان کوہ شکوہ، مست وسربلند، مکلل جھولیں پڑیں، گج گاہیں دونوں طرف چہرے پر لگتی، بھسوڑے سیندور سے رنگین ولالا، فیل بان گردنوں پر سوار، سنہری گج باگیں ہاتھوں میں، گرد ہاتھیوں کے سانٹے مار، بھالے بردار، چرکٹے، بان انداز، چرخی مار "میل، اگر، بری، گھوم، پچھے، دھت دھت" کی صدا دیتے۔ قاعدہ داران لشکر، ننگی تلواروں کے اشاروں سے، گھوڑے دبا دبا کر، جو آگے ہے اسے پیچھے، جو پیچھے ہے اسے آگے کرتے۔ سنے چھڑکاؤ میں مصروف۔ تماشائیوں کی کثرت، نقیبوں کی "ہٹو! بڑھو!" افسروں کے اہتمام، سرداروں کے انتظام۔

چنانچہ سپاہی گئے۔ جب بچوں نے سپاہیوں کو دیکھا تو وحشت کے مارے کوئی بھاگا، کوئی چیخا، کوئی کونے میں دبک گیا، کسی نے دوڑ کر سپاہی کو کاٹا۔ غرض سپاہی، بہ ہزار خرابی، ایک ایک کو پکڑ کر لائے۔ فوجوں کو دیکھ کر ان بچوں نے چیخیں ماریں۔ غرض دربار میں لائے گئے تو عجیب جانوروں کی سی قاؤں پاؤں چاؤں کرتے تھے۔ گو تھے تو آدمی کے ہی بچے۔ کیا سبب تھا؟ بس یہی سبب کہ انھوں نے کچھ سنا ہی نہ تھا۔

بس اگر ہم بھی نہ سنیں گے تو کیا کچھ بن جائیں گے؟ میرے خیال سے تو ہرگز نہیں۔ بس اب ہم کو مناسب ہے کہ کمر ہمت کھینچ کر باندھیں اور سنیں۔ جب تک کسی نے کچھ نہیں کہا، کسی کو کچھ نہیں ملا۔ بس اب کھڑے ہو جاؤ۔ ابھی تک ہمارا ایسا بگڑا ہی کیا ہے۔ لیکن اب تنت ہے کیوں کہ اسلام گیا، اس کے اخلاق گئے، حکومت گئی، آزادی گئی، علم گیا، عزت گئی، دولت گئی، اتحاد گیا، ہمت گئی، اقبال گیا۔ بس ان باتوں پر خیال کرو۔ بس اس کے بعد پھر دنیا تمھاری اور دنیا میں تم ہی تم ہو۔ پہلے بھی تو ہی تم تھے۔ بچہ وہی صاحب نصیب ہے جو ماں باپ کے سنے اور جوان وہی اچھا ہے جو بڑوں کے کہنے پر عمل کرے اور بڈھا وہ اچھا ہے جو بچوں کو دیکھ کر سبق لے۔ دنیا میں اچھا وہی ہے جس نے احکام خدا اور رسول سن کر ان پر عمل کیا۔ بس اس کا بیڑا پار ہے۔

مذہب ہم کو کچھ اور نہیں بتاتا۔ صرف دنیا میں اچھی طرح سے جینے کا طریقہ بتاتا ہے کہ یوں جیو۔ اور جو سن کر عمل نہیں کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی گناہ نہیں۔ جس نے سلطنت کے قانون کو نہیں سنا، دیکھو، کیسے اڑنگوں میں مبتلا ہوا۔ کم بولنا گناہ نہیں، ثواب ہے۔ سکوت کی حالت میں دماغ قوی ہوتا ہے اور فضول بولنے سے دماغ ضعیف، اور نہ سننا گناہ عظیم۔ کم بولنے والا تو ہزار آفتوں سے بچ جاتا ہے اور نہ سننے والا تو تمام فائدوں سے دور۔ ہر غلط کا ایک نقصان ہے لیکن نہ سننے کی غلطی تو انسان کی زندگی کو ڈھول بنا دیتی ہے اور بے ستائے چھوڑتی ہی نہیں۔ کان پڑی ہوئی بات، آدمی تو آدمی، جانور کے کان پڑی اثر رکھتی ہے۔

(2)

قدرت کا کوئی راز میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ ہاں، انبیا و یا مرسلین سمجھیں ہوں تو سمجھے ہوں۔ یہاں تو موٹی موٹی سی باتوں کے سمجھنے کے واسطے بڑی باریک عقل کی ضرورت ہے۔ کان جو خدا نے پیدا کیے ہیں، ان کی ایسی پیچیدہ وضع سے کیا غرض ہے کہ کان کے بیچ میں ایک گڑھا اور اس کے بھی مختلف حصے، اور قریب قریب چاروں طرف کم و بیش ابھار غضروفوں کا، جن کو ہم اردو زبان میں چپنی ہڈی کہتے ہیں اور روزن گوش کے قریب ایک چھوٹا سا کھونٹا ابھار کیا، دو اور ابھار ہیں اور کنارے دار نالیاں تو پھر اتنی پیچیدگیوں کا سبب کیا ہے؟ آخر کان تو اور جان داروں کو بھی دیے ہیں اور انھی کانوں سے بہ نسبت آدمیوں کے زیادہ سنتے ہیں۔ اب کسی کے کان نہایت بڑے، جیسے خرگوش کے یا پھیلے ہوے کان، جیسے ہاتھی کے، کسی کے صرف سوراخ، جیسے اکثر پرند یا سانپ، چھپکلی، مچھلی وغیرہ کے۔ انسان کے کانوں کو ایسا کیوں بنایا؟ اور آدمیوں سے بڑے کان جانوروں کو دیے اور جانوروں کے کان چاروں طرف پھرتے بھی ہیں اور انسان کانوں کو نہیں پھرا سکتا۔ ہاں، بعض آدمیوں کے کان کچھ یوں ہی سے ہلتے ہیں۔ سو کیا وہ ہلنے میں ہلنا ہے! کان کو قیف کی صورت کیوں بنایا؟ قیف وہ شے ہے، جس سے چھوٹے منہ کے باسن میں کوئی سیال شے داخل کرتے ہیں۔ اس سے وہ شے چھنی ہوئی داخل ہوتی ہے اور جسم انسانی میں تو ہوا جیسی پتلی شے، جو بکھرنے والی ہو، یہ کان کی قیف جانچ جانچ کر بھرتی ہے اور تمام اعضا خود بھی مادی ہیں اور مادی ہی شے کو دریافت کر سکتے ہیں اور کان تو وہ جوہر ہے کہ مجرد، اصل مادہ، جس کو کوئی عضو نہ چھو سکا یعنی خدا کو اسی جوہر لطیف نے پہچانا۔ کسی شاعر کا قول ہے کہ "اللہ کو دیکھا نہیں پر عقل سے جانا۔" بالکل غلط! عقل سمجھے ہوئے تھی یا نہیں لیکن یقین کانوں ہی نے دلایا کہ خدا ہے۔ اب سنیے کہ بڑے کان ان جانوروں کو دیئے جو ڈرپوک زیادہ ہیں۔ انھیں آہٹ کی زیادہ ضرورت ہے اس وجہ سے ایسے جانوروں کی سماعت کی قوت بھی زیادہ دی ہے اور سب سے بڑے کان خرگوش کے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ننھی سی مخلوق نہایت کمزور ہوتی ہے۔ سب جانور شکاری اس کو پیٹ بھرنے کو نہیں بلکہ تفریح سمجھ کر منہ میں ڈال لیتے ہیں۔ اس وجہ سے قدرت نے سب سے زیادہ بڑے کان دیے ہیں؛ اور علاوہ کانوں کے پچھلا دھڑ اور پچھلی ٹانگیں بڑی دی ہیں۔ اسی وجہ سے سنتا بھی زیادہ ہے اور اپنی بساط سے زیادہ بھاگتا بھی ہے کہ بڑے بڑے تازی کتوں کی کر توڑ دیتا ہے۔ میری عقل ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ جن کے کانوں کی سب سے زیادہ خوبصورت اور پیچیدہ وضع بنائی ہے ان کو پیچیدہ باتیں سننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے اور جانوروں کو نہیں اور جانور سنتے بھی ہیں، سمجھتے بھی ہیں لیکن ایسا نہیں، جیسے انسان کو سننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جانوروں کے کام تو بے بولے بھی نکل جاتے ہیں لیکن انسان کی تمام زندگی کا دار و مدار سننے اور سمجھنے پر ہی موقوف ہے۔ ہم تو

ہمارے کان کی ساخت خود بتاتی ہے کہ ہم غور سے سنیں اور سمجھیں۔ اب ذرا ادھر کان لگایئے کہ جب ہوا ہمارے کان میں آتی ہے تو ہوا کی ساری قوت کان کے بڑے نشیب میں ٹکراتی ہے اور ہوا کا قاعدہ ہے کہ ٹکر کھا کر پھیلتی ہے تو یہ کان کے تقریباً چاروں طرف کے ابھار ضرورت سے زیادہ ہوا کو باہر پھینک دیتے ہیں اور باقی ہوا کو بھی چکردار نشیب۔ جن کی اونچ نیچ قدرت ہی سمجھے ہوئے ہے جو ایسا بنایا، ہمارے تو کانوں کو بھی خبر نہیں کہ کیوں ایسا ہے۔ یہ کان کی ساخت ہوا کی قوت کو توڑ پھوڑ کر کان کی مرضی کے موافق بنا دیتی ہے اور کام کی ہوا کو کان کی طرف اور زائد ہوا کو آنے سے روکتی ہے۔ اس کے بعد جو ہوا کان کے سوراخ میں جاتی ہے اس کو دربان گوش یا نکوتا ابھار جو کان کی نلی کے قریب ہے اور اس کی اوپر والی نوک، جو کچھ باہر کی مائل ہے اور داخل ہونے والی ہوا پر اپنا تصرف کر کے اور کاٹ چھانٹ کر باہر پھینک دیتی ہے۔ اب ہوا چھن چھنا کر اور نہایت لطیف ہو کر کان کی نلی میں گئی۔ یہاں قدرت کا اور نیا کرشمہ ہے کہ کان کی نلی کو خیدہ پیدا کیا ہے۔ اگر یہ نلی سیدھی ہوتی تو ہوا کا دباؤ زیادہ پڑتا۔ اس لیے یہ نلی خیدہ ہے اور آگے جاتی ہوئی پتلی ہوتی جاتی ہے اور نلی کے اندر نہایت باریک باریک ریشے ہیں جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں: اور ایسے ذکی الحس ہیں جو ہوا کی موجوں کو گن جانچتے ہیں۔ اب نلی کا میل تر اچھا ہوتا ہے کیونکہ تر میل ہوا کو جذب بھی کرتا ہے اور نلی کے باریک باریک پٹھوں کو تر بھی رکھتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ اب نلی کی انتہا پر اللہ میاں نے ایک ڈھول، جیسے انگریزی باجے کا ہوتا ہے جو دونوں طرف سے منڈھا ہوا ہے اور آخری مقام پر نلی کے چست ہے۔ یہ ہوا اس ڈھول کی باہر کی پتڑی پر پڑتی ہے۔ اب خلا تو محال ہے۔ اس ڈھول میں جو ہوا بند ہے اس ہوا میں لہریں اور گونج پیدا کرتی ہے۔ پھر اندر کی پتڑی، جو باہر کی پتڑی سے نرم اور لطیف ہوتی ہے۔ یہ موجیں اس پتڑی پر جا کر ٹکراتی ہیں: اور اندر کی پتڑی سے ایک گھوڑا، جیسے بندوق کا گھوڑا ہوتا ہے: اس کی لبلبی اس پتڑی کے صدموں سے اٹھ اٹھ کر گھوڑے کا متہ جو چلانے کو توڑتا ہے وہ ایک نہائی، جیسے لوہار یا سنار کی سی ہوتی ہے، اس پر پڑتا ہے اور نہائی کے نیچے ایک نوک ہے، اور اس نوک میں ایک رکاب جیسے گھوڑے کی رکاب ہوتی ہے۔ وہ رکاب نہائی کی حرکت سے ملحق ہے اور قریب رکاب کے ایک پٹھہ، جیسے گھنٹے کی باج کا تار چکردار ہوتا ہے۔ یہ رکاب اس پٹھہ پر پڑ کر گونج پیدا کرتی ہے۔ اس بزرگ و برتر اللہ نے ہم کو کیسی چیزیں عنایت کی ہیں۔ یوں سب ہی اعضا ہیں لیکن کان کا کام تو کچھ انوکھا ہی ہے، لہٰذا کان سے سنو تو غور سے سنو۔ فقروں پر نظر کرو کہ کس مطلب کے واسطے بولے جا رہے ہیں۔ جو لوگ اس کان سننے اس کان اڑاتے ہیں وہ کیا فائدہ اٹھاتے ہیں؟

(3)

خلافت کا زمانہ ہے اس زمانے میں ایک طالب علم نہایت شوقین ایک ایسی مسجد میں رہتا ہے جہاں سوائے دھوپ چھاؤں، چاندنی، اندھیرے، بارش اور ہوا کے کوئی نمازی نہیں آتا، یہ مسجد آبادی سے دور اُجاڑ میں ہے، خدا تو رازق ہے چوتھے آٹھویں کوئی خدا کا بندہ روکھی سوکھی یا کبھی دال ترکاری کے ساتھ روٹی دے جاتا ہے۔ یہ لڑکا اسی کو غنیمت جانتا ہے اور اس میں سے بھی صدرحق کھاتا ہے۔ پیٹ بھر کر اس لیے نہیں کھاتا کہ نیند آئے گی اور زیادہ کھانے میں بیماری کا ڈر ہے۔ دنیا میں دو مزے ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔ آپ چاہیں، دنیا میں جینے کا مزا بھی اور کھانے کا بھی، ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جن پھولوں کو رنگ مرحمت فرمایا ہے بو نہیں دی اور جن کو رنگ نہیں مرحمت فرمایا خوش بو دی۔ یہی وجہ ہے کہ غریب روکھی پھیکی روٹی کھا کر تن درستی کے مزے لیتا ہے اور امیر لوگ صرف دسترخوان کے چٹخاروں پر، جو مزہ صرف ایک آنی ہوتا ہے، جان دیتے ہیں اور تمام عمر پیٹ سہلا کر صحت کو خراب کر لیتے ہیں......

اس مسجد میں کسی اللہ تعالیٰ کے بندے نے ایک بکرا اللہ کے نام چڑھا دیا۔ اس طالب علم کو اس بکرے سے دوسراہٹ ہو گئی اور یہ اس بکرے سے نہایت دلچسپی رکھتا ہے، جب سبق لے کر آتا ہے تو اس بکرے کے پاس بیٹھ کر کہتا ہے کہ جانور تو بھی سن لے یہ کہہ کر بکرے کا کان پکڑ سارا سبق دھراتا ہے۔ جب سبق ختم ہو جاتا ہے تو کان چھوڑتا ہے۔ اب یہ تو بکرے کی عادت ہے کہ آپ کان پکڑ کر بکرے کا چھوڑیں تو بکرا کان جھڑجھڑاتا ہے تو یہ طالب علم کہتا ہے ارے جانور ہی ہے نا! نہیں سمجھا، اچھا لے پھر سمجھ لے۔ یہ کہہ کر پھر کان پکڑتا ہے اور نئے سرے سے پھر سناتا ہے۔ غرض اتفاق سے یہ جانور تو ہے ہے، جب یہ کان نہیں ہلاتا اس وقت کہتا ہے کہ اب سمجھا۔ غرض اسی صورت سے چندروز میں یہ ایسا عالم ہوا کہ اس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "جوانا سوئی" رکھا۔

اس شہر کے عالم جو بادشاہ کے منہ چڑھے تھے انھوں نے جو اس کتاب کو دیکھا تو ان کی عقل کے چراغ گل اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ خیال کیا کہ اس زمانے میں اس بلا کی حالت یہ ہے تو آگے چل کر تو یہ سب کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس آفت کا روکنا نہایت ضروری ہے۔ یہ مشورہ آپس میں قرار پایا کہ سب بادشاہ سے عرض کریں کہ حضور کے اقبال سے ایک نئے راز کا حال کھلا ہے کہ ایک نوجوان طالب علم کچھ شاگرد اور مرید جمع کر رہا ہے اور ارادہ اس کا یہ ہے کہ سلطنت کو شکست دے کر خود حاکم بن بیٹھے۔ بادشاہ نے یہ سن کر حکم دیا کہ اس کو جلد گرفتار کر لو۔ اتفاقاً اس لڑکے کا ایک شاگرد اس دربار میں حاضر ہے اس نے سنا اور آ کر خبر دی کہ جناب غضب ہی ہو گیا کہ حاسدوں کا فقرہ چل گیا اور بادشاہ نے حضور کی گرفتاری کا حکم دے دیا، اس وقت کچھ شاگرد سبق لے رہے

تھے ان سب نے عرض کی کہ جناب ہم آپ کو ایسا چھپائیں گے کہ کسی کو پتا نہ چلے گا، ہماری جان جائے تو جائے لیکن یہ کسی کی مجال نہیں جو حضور کے دشمنوں کا سایہ بھی دیکھ لے۔ غرض سب نے مل کر چھپادیا۔

اب تلاش شروع ہوئی دنیا میں روپے کی جھنکار کے طالب، کب کسی کا نفع نقصان دیکھتے ہیں اور ان غریبوں کا کیا قصور روپے کی جھنکار روپے والے کے کان میں کچھ آنے ہی نہیں دیتی اور عقل سے کہتی ہے الگ ہٹ، پرے سرک، تو ہے کیا، کتیا، جو ہمارے آگے آتی ہے! غرض اب غلامان شاہی اور پیٹ کے بندوں نے تلاش کی، کھوج لگایا لیکن پتا نہ لگا۔ اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا اور لڑکا ہاتھ نہ آیا۔ اس عرصے میں علما نے ہزاروں ہی تدبیریں کیں لیکن ایک نہ چلی، مجبور ہو کر یہ صلاح قرار پائی کہ اس حالت میں پوشیدہ رہ کر کب تک باہر نہ نکلے گا، ناممکن ہے۔ یہ خیال کر کے ہر محلے کے ناکے پر ایک ایک سپاہی مقرر کیا اور سپاہیوں سے کہہ دیا کہ بجائے پہرے کے کوئی سپاہی تو اپنی انگلی آسمان کی طرف بلند کیے کھڑا رہے اور کوئی زمین کی طرف، کوئی مشرق کی طرف، کوئی مغرب، کوئی شمال، کوئی جنوب، کوئی ایک، کوئی دو، کوئی دسوں سیدھا رکھے۔ غرض ہر سپاہی کو ایک نئی صورت بتادی اور یہ کہہ دیا کہ جو کوئی تم سے آ کر دریافت کرے اسے ٹال دینا اور جو آ کر سر ہی ہو جائے اس کو گرفتار کر کے لے آؤ۔

یہ لڑکا کسی ضرورت سے باہر نکلا۔ سپاہی کو جو اس دھج سے کھڑے دیکھا کہ اپنی دونوں انگلیاں مشرق کی طرف کیے کھڑا ہے۔ یہ تو عالم ہے جتنی اشیا اس کے اطراف میں ہیں اس کو سب ہی کا علم ہے۔ اس سپاہی کو جو بے معنی حرکت کرتے دیکھا اس کو تاب کہاں تھی۔ دریافت کیا "بھائی سپاہی! اول تو جو کچھ تم کر رہے ہو یہ عقل کے خلاف ہے، فعل عبث ہے، اور اگر تم کو سمت مشرق ہی بتانی ہے تو ایک انگلی کافی، یہ دو انگلیاں کیسی؟" سپاہی جاہل۔ اس کو دنیا طلبی کے سوا دوسرا کام ہی نہیں۔ علم سے نفرت، روپے کی نگاہوں میں عزت، روپے کی جھنکار جس میں ہزاروں خطرے بھرے ہیں اور سب اس کے خطروں پر جان دیتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ روپیہ بے شک جسم کی مدد کرتا ہے لیکن روح کے ٹکڑے اور ریزہ کاری کرتا ہے اور علم سے گو بدن کو تھوڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے لیکن روح کو تقویت، اور روح چونکہ امر رب ہے اس کو بقا اور بدن کو فنا۔ سپاہی نے ایک دو دفعہ تو ٹالا لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ تو اسی واسطے مقرر ہے، چنانچہ سپاہی نے اس غریب بے گناہ کو گرفتار کر لیا۔ رات بھر قید رکھا اور صبح کو دربار میں پیش کیا۔

تمام عالم جو آج کتابی خانے کی گردان میں لگے رہتے ہیں اور دنیا کی کسی نیک و بد کی کچھ خبر نہیں، یہ سب جمع ہوئے اور قاضی جس کو ملاؤں نے اپنے آل نامے میں لکھا ہے کہ "قاضی میخ در گل" اور اسی طرح سے میوہ فروش "شغال بے دنداں در قالیز" غرض قاضی صاحب نے حکم قتل کا فتویٰ دیا بادشاہ نے جو اس لڑکے کو نہایت سیدھا سادا

نہایت ہی معمولی لباس پہنے دیکھا تو خیال آیا کہ سلطنت حاصل کرنے کے خیال میں اس کو کسی طرح کا خیال ہی نہیں۔ دریافت کیا کہ "اے لڑکے تو نے یہ خیال نہ کیا کہ میں کس کی مخالفت کرتا ہوں جس کی اطاعت واجب ہے۔" اس لڑکے نے جواب دیا کہ "پہلے اطاعت خدا کی اس کے بعد اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد بادشاہ کی اطاعت ہے۔ لیکن بادشاہ وہ بادشاہ ہے جو رعیت کے حقوق اور اپنے تمام فرائض کا جاننے والا ہو اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ میں کون ہوں؟ اور جو بادشاہ اس کے خلاف ہو اس کی اطاعت کو میں گناہ عظیم جانتا ہوں۔" بادشاہ کو یہ جواب حق سن کر ایسا کڑوا معلوم ہوا کہ اس بے قصور کو حکم قتل دیا۔ اس غریب کے ساتھ انیس اور عالموں کو جو علمائے شاہی کے خلاف تھے ان کو بھی بلالیا اور برابر بٹھایا۔ جلاد کو طلب کیا۔ جلاد آیا تو اتفاق سے یہ لڑکا ایسے مقام پر بیٹھا تھا جس کا وقت سب سے آخر تھا۔ جلاد نے ایک عالم کو بیترۂ جلادی پر بیٹھایا، بیترۂ جلادی اسے کہتے ہیں کہ مقتول کو باندھ کر اس طرح بٹھاتے تھے کہ ہل نہ سکے، اور وہ بندش ایسی ہوتی تھی کہ گردن کٹی اور تمام جسم کھل گیا۔ اس کے خط چونے کا گردن پر کھینچا جاتا تھا۔ انسان کا قتل ہے۔ اگر اس وقت کے اثرات جو قاتل اور مترتب ہوتے ہیں لکھوں تو طول ہے۔ غرض اس لڑکے نے جو یہ دیکھا کہ میرا وقت قتل سب کے بعد ہے تو اٹھا اور سب سے اول آ کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے دیکھا اور خیال آیا کہ دنیا میں ہر ذی حیات اپنی زندگی کے ایک ایک سانس پر جان دیتا ہے لیکن یہ کیا کہ اس لڑکے نے چند سانسوں کی پروا نہ کی اور پہلے آ بیٹھا۔ میں اس سے سنوں تو سہی کہ کیا سبب ہے؟ یہ سوچ کر بادشاہ نے اس لڑکے سے دریافت کیا کہ "میاں لڑکے یہ تم نے کیا کیا؟" اس لڑکے نے جواب دیا "اے بادشاہ! بے شک تو بادشاہ ہے کہ تجھ کو احساس ہے۔ اے بادشاہ میں ایثار نفس کو جو بندگان خدا کی خدمت میں گزر جائے اپنے واسطے خاص عبادت جانتا ہوں۔ اس وقت میرے پاس یہ چند سانس تھے، میں نے خیال کیا کہ آخر وقت ہے اور تو اس وقت میں کچھ کر نہیں سکتا صرف چند سانسوں کو خدا تعالیٰ کے بندوں سے کیوں عزیز کروں؟" بادشاہ تو یہ سن کر دریائے حیرت میں ایسا غرق ہوا کہ خاموش ہو گیا اور دل میں خیال کیا کہ ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو، میں اس کو اپنی زندگی کے واسطے قتل کروں! افسوس ہے۔ چنانچہ حکم دیا کہ ان سب کو چھوڑ دو اور اس لڑکے کو پاس بلایا اور فرمایا کہ میں اپنی وزارت تجھے دیتا ہوں۔ اس لڑکے نے عرض کیا "اے بادشاہ میں اس قابل نہیں۔" یہ سن کر بادشاہ خوش ہوا۔

بس اب جس بکرے کے کان میں یہ سبق سنایا کرتا تھا ایک شخص نے اس کی سری کھائی تو بڑا عالم ہوا۔ اسے معلوم ہوا کہ سنا! آدمی تو ادمی، جانور کا سنا ہوا بھی کام آتا ہی، لیکن شرط یہ ہے کہ بکرے کی طرح خاموش سنا ہو۔ دیکھنا تو سطحی ہے، دیکھ لیا، لیکن صرف دیکھنے سے نتیجہ کیا نکلا؟ دیکھنے کے معنی دیکھنا ہی نہیں، دیکھنا صرف رنگ ڈھنگ، قد و قامت وضع کا کورا دیکھنا ہے، لیکن اتنا مفید نہیں جتنا سننا۔ ہم نے ایک شے مثل تخت کے دور سے دیکھی

کہ جو فرش سے پوشیدہ ہے اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ تخت ہے لیکن یہ کب معلوم ہوا کہ یہ لکڑی کا ہے، لوہے کا ہے، سونے کا، چاندی کا، کیونکہ اس پر فرش ہے اور ہر طرف سے ڈھکا ہوا ہے۔ ہاں اگر سنا ہوا ہے کہ یہ تخت لکڑی کا ہے اور لکڑی بھی سال شیشم اور بڑھئی نے بنایا ہے آری سے کاٹ کر، بسولے سے چھیل کر، رندے سے رندکر اور کس واسطے؟ نماز کے واسطے یا کسی مصرف کے واسطے۔ اور نظر غلطی بھی کرتی ہے، ہاں کان غلطی نہیں کرتے بلکہ نہایت ہی امانت دار ہیں، جو سنتے ہیں وہی زبان سے کہلوا دیتے ہیں۔ زبان کان کی تابع ہے۔

(4)

ایک روز شاہ جہاں بادشاہ دربار کر رہا ہے اور مقررہ دربار ہے۔ اس میں اراکین سلطنت نذریں پیش کر رہے ہیں۔ نقیب نذریں دینے والے کا نام عہدہ اور جو شاہی اعزاز ہے اسے کہہ کر اس کے بعد کہتا ہے کہ ''آداب بجالاؤ۔ بادشاہ عالم پناہ سلامت!'' تمام سردار اپنے اپنے اعزاز کے موافق قرینہ با قرینہ نہایت ادب سے حاضر ہیں۔ نقارہ دربار، جہانیاں مدار، گرج رہا ہے اور نوبت پر نکور، جھانجھ کوز حرمہ، سلامی کی توپوں کی گرج سے شہر گونج رہا ہے۔ نقیبان خوش گلو کی آوازیں لطف دیتی ہیں۔ سچ ہے بادشاہ اور نمونہ خدائی۔

میں داستان گو ہوں، دربار کے حالات بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن میں تو رسالہ پیش کر رہا ہوں۔ غرض سردار دکن اس زمانے میں قطب شاہی تھے۔ یہ سردار نذر پیش کر رہا ہے کہ اتفاق سے شاہ جہاں کی گردن میں کھجلی اٹھی، ناقابل برداشت۔ شاہ جہاں بادشاہ ہے۔ تخت پر رونق افروز ہے۔ دربار کر رہا ہے۔ بادشاہ دربار میں خلاف ادب کوئی حرکت نہیں کرتا، اب گردن کو چار آدمیوں میں کھجاتا یا کسی سے کہتا کہ کھجا دو، یہ کون سا اخلاق ہے؟ اب بادشاہ نہ تو خود ہی کھجا سکتا ہے اور نہ کسی سے کہہ سکتا ہے کہ کھجا دو اور دوسرے کو کھجانا کارے دارد۔

میرزا ثریا جاہ جو سلطنت کے چراغ کی کجلائی ہوئی سی ٹیم تھی اور خاندان مغلیہ کی مٹی ہوئی سی مدھم نشانی تھی۔ زمانے میں کسی شے کو قرار نہیں کہ ہر شے متغیر ہے، الا اگر قرار ہے تو تغیر کو قرار ہے۔ میری یاد کی بات ہے کہ صاحب عالم میرزا ثریا جاہ بیمار ہوئے اور پٹھوں نے کام سے جواب دے دیا۔ حکیم عبدالمجید خان صاحب حاذق الملک بہادر نے علاج شروع کیا۔ میں بیس برس تک حکیم صاحب کے ہمراہ سفر حضر میں رہا ہوں۔ غرض صاحب عالم کے پٹھوں میں کچھ حرکت اور خون میں کچھ دور کی تحریک شروع ہوئی، اس کی وجہ سے جسم میں سلاہٹ پیدا ہوئی تو صاحب عالم کے ہاتھ تو کام ہی نہیں کرتے تھے، جو اس وقت حاضر ہوتا تو صاحب عالم فرما دیتے تھے کہ ذرا پیٹھ کھجا دو۔ جب صاحب عالم کچھ اچھے ہو گئے تو کسی نے صاحب عالم سے دریافت کیا ''حضور یہ تو فرمائیں کہ جناب کو دور از حال

کیا تکلیف تھی؟" تو صاحب عالم نے فرمایا کہ "اور جو تکلیفیں تھیں وہ تو تھیں ہی لیکن دو تکلیفیں ایسی تھیں کہ تمام عمر یاد رہیں گی۔ ایک تکلیف یہ کہ جب میری پیٹھ میں کھجلی اٹھتی تھی، میں تو کہتا تھا کہ نیچے کھجا تو وہ اوپر کھجاتا تھا اور میں کہتا کہ دائیں تو وہ بائیں۔ اور دوسری تکلیف، جب میں روٹی کھاتا تھا تو میں تو کہتا تھا کہ چھوٹا نوالہ دے تو وہ بڑا نوالہ دیتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ بھائی سالن کم لگا تو وہ زیادہ لگاتا تھا اور زیادہ کہتا تو کم۔ افسوس ہے قدر نعمت بعد زوال ہوتی ہے اور تکلیفوں کو تو میں کیا بیان کروں۔"

غرض سردار دکن نذر دے رہا ہے اس وقت شاہ جہاں کی گردن میں کھجلی کی شدت ہوئی۔ شاہ جہاں نے ہاتھ تو نذر کی طرف بڑھایا اور گردن کو ذرا پھیرا کہ عبا کا کنارہ مس کرے گا تو کھجلی مٹ جائے گی۔ یہ خیال کر کے بادشاہ نے ذرا سا رخ پھیرا۔ سردار کی نظر پڑی اس نے سمجھا کہ غضب ہوا، شاہ نے نذر لینے میں رخ پھیرا۔ معلوم ہوا کہ اب خیر نہیں۔ اس غریب کا تو اس خیال سے رنگ زرد ہو گیا۔ سمجھا کہ کسی دراندازنے کچھ کہہ دیا یا مجھ سے کوئی سخت غلطی ہوئی۔ غرض کہ بعد دربار اپنے خیمے پر آیا۔ اس کا کیمپ جہاں اب صدر بازار ہے، یہاں تھا۔ خیمے میں آ کر پلنگ پر گرا اور حواس باختہ ہوئے۔ بے ہوش ہو گیا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ کمزوری بڑھی۔ مرض لاعلاج، اب کیا کرتا۔ سعد اللہ خاں شاہ جہاں کے وزیر ہیں۔ سب کی لیکن اتنی مجال کہاں جو خلاف مرضی بادشاہ کے دریافت کرے کہ حضور کیوں خفا ہیں۔ اسی صورت میں تین مہینے گزر گئے۔ یہ غریب فکر میں گھلا جاتا ہے اور پڑا اپڑا ار مجھ رہا ہے۔

ایک روز شاہ جہاں تیسرے پہر کا وقت ہے، ثمن برج میں رونق افروز ہے۔ سامنے جمنا بہہ رہی ہے اور اپنے لب ساحل سے قلعے کی پابوسی کر رہی ہے۔ وہ زمانہ! جمنا کا چڑھاؤ ہے۔ بقول شخصے پچھلی پلٹے۔ موجیں آ رہی ہیں اور اب تو اس قلعے سے جمنا کا دل بھی پھٹ گیا، قدم آگے سے پیچھے ہٹ گئے اور اسی غم میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ اس صورت میں جمنا کو دریا کہنا پھبتا نہیں اور یہی حالت رہی تو کون اسے دریا کہے گا۔ غرض شاہ جہاں بیٹھا ہے۔ اس وقت موسم بھی خوش گوار ہے۔ شاہ جہاں کے مزاج میں فرحت ہے کہ سعد اللہ خاں حاضر ہوا۔ ضروری کاغذات پیش ہوئے۔ شاہ نے دستخط کیے۔ سعد اللہ خاں نے بستہ باندھا اور بادشاہ کو خوش دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ شاہ جہاں تو بادشاہ ہے اور بادشاہ تمام علوم و فنون کا جاننے والا ہوتا ہے۔ سعد اللہ خاں کا ٹھہرنا تھا کہ شاہ جہاں سمجھ گیا۔ خبریں تو برابر گزرتی ہی رہتی ہیں کہ آج سردار دکن کا یہ حال ہے اور سعد اللہ خاں کی معرفت دریافت حال چاہتا ہے کہ عالم پناہ کو میری طرف سے ایسا خیال کیوں ہے؟ شاہ جہاں نے سعد اللہ خاں سے فرمایا کہ "کیا سردار دکن کے متعلق تم کو کچھ دریافت کرنا ہے؟" سعد اللہ خاں نے دست بستہ عرض کی کہ "جہاں پناہ روشن ضمیر ہیں، پھر عرض کرنا بے محل۔" بادشاہ نے فرمایا کہ "نہیں اس سے کہہ دو کہ کچھ ملال نہیں اس وقت ما بدولت کی گردن میں کھجلی اٹھی تھی

اس وجہ سے ذرا توجہ اس طرف ہوئی، ورنہ کوئی ملال نہیں اور اتنے عرصے تک جو اظہار نہ فرمایا صرف اس کی عقیدت کا امتحان تھا۔ اچھا اس سے کہو کہ معلوم ہوا وہ عقیدت کیش ہے۔ ایک پہر تک جواہر خانہ شاہی سے جو شے پسند آئے وہ لے جائے۔"

غرض سعد اللہ خاں یہ حکم شاہی سن کر روانہ ہوا اور سردار سے جا کر کہا۔ پس یہ سن کر سردار دکن روانہ ہوا، جواہر خانے میں آیا۔ گو اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے لیکن اس جواہر خانے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور جواہر پیش ہونے شروع ہوئے۔ یہ جس شے کو پسند کرتا ہے اس کے آدمی لے لیتے ہیں۔ اب ایک عرصے کے بعد داروغہ جواہر خانہ نے عرض کی کہ "جناب یہ کیا پسند فرما رہے ہیں۔ ٹھہریے میں لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر داروغہ اندر گیا اور ایک صندوقچہ سونے کا لایا جس کا غلاف کمخواب کا، صندوقچہ سونے کا۔ اب اس داروغہ نے صندوقچہ کھولا اور ایک جیغہ یا سرپیچ نکالا۔ جیغے اور سرپیچ میں فرق ہے۔ سرپیچ پگڑی کے اوپر چار انگل چوڑا اور گز سوا گز لمبا لپیٹا جاتا ہے اور جیغہ بھی پگڑی کے اوپر لپیٹتا ہے لیکن یہ جواہر نگار ہوتا ہے اور بیچ میں اس جیغے کے ایک کیری ہوتی ہے۔ اس جیغے کے جواہر کا تو کیا پوچھنا ہے۔ صرف اس جیغے کی کیری جو نو انچ لمبی اور چار انچ چوڑی ایک پرکالہ زمردی تھی۔ جس وقت بادشاہ اس جیغے کو باندھ کر ذرا سر کو خم کرتا تھا تو تمام لباس شاہی سبز ہو جاتا تھا۔ سردار دکن نے یہ دیکھ کر جواہر خانے کے داروغہ سے کہا "او نمک حرام ! رکھ اسے وہیں جہاں سے لایا ہے، یہ شے حضور کے سر مبارک پر لگانے کی ہے۔ اگر میں اس کو لے بھی گیا تو کہاں لگاؤں گا ہاں اگر کوئی شے پائے مبارک پر لگانے کی ہو تو لا کہ جس کو میں اپنے سر پر لگا کر فخر کروں۔"

شاہ جہاں کو یہ خبر فوری پہنچی۔ اس وقت شاہ جہاں وضو کر رہے تھے۔ یہ سن کر بادشاہ مسکرائے اور حکم دیا کہ کاغذ اور قلم دوات لاؤ چنانچہ کاغذ اور قلم دوات آئی۔ شاہ جہاں نے حکم لکھا کہ ایک پہر اور۔ بس اب کیا تھا، یہ سردار مالا مال ہو کر نکلا۔

یہ خبر حضرت عالم گیر کو ہوئی یہ تو عالم گیر ہی تھے، تمام عالم پر قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ فرمایا، غضب کیا بادا جان نے دلی کو لٹوا دیا۔ اب دلی میں کیا دھرا ہے؟ یہ اسی نظر کی غلطی کا نتیجہ ہوا کہ دکن کی مہم در پیش ہوئی۔ اس لیے مناسب ہے کہ سماعت کو وسیع کرو کہ سننے میں ہزاروں نعمتیں پوشیدہ ہیں۔ قدرت کی طرف متوجہ ہو کہ کان کے پردے کھلیں۔ قدرت کا کوئی قصور نہیں۔ یہ جو کچھ ہے قصور اپنا ہی ہے۔ قدرت کا اس میں کیا قصور ہے کہ ہم اپنے اعضا سے کام نہ لیں اور الزام قدرت پر رکھیں۔ خدا تعالیٰ سے دماغ کی صحت اور اپنی صحت و تن درستی کی دعا مانگو۔ قدرت کے قانون تو کچھ الگ ہی ہیں۔ پہلے ہم اپنے دماغ کی تن درستی اور صحت کی طرف متوجہ ہوں پھر قدرت ہمارے ساتھ ہے، قدرت تو اہل کو دیتی ہے نا اہل کو نہیں۔

داستان سرائی کا آغاز نو

شمس الرحمٰن فاروقی

داستانیں، اور خاص کر داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدیں جو (ایک جلد کے سوا، جو 1917ء میں شائع ہوئی) نول کشور پریس سے 1883ء سے لے کر 1909ء کے درمیان چھپیں، ہمارے ادب کا بیش بہا اور انتہائی نادر سرمایہ ہیں۔ داستان امیر حمزہ کی یہ جلدیں اپنے حسن و خوبی، بیانیہ کی رنگا رنگی، قوت ایجاد کے غیر معمولی اظہار، نثر کے تنوع اور لچک دار قوت، ہر طرح کی صنف نظم کی کثرت اور سب سے بڑھ کر اپنی تخیلاتی وسعت کی بنا پر دنیا کا سب سے عظیم الشان زبانی بیانیہ کہلانے کی مستحق ہیں۔

اگرچہ بہت سے ملکوں میں اب بھی داستان سنانے کا رواج ہے اور خود ہمارے ملک کی بعض زبانوں، مثلاً تامل اور راجستھان کی مارواڑی، میں زبانی داستان سنانے کا چلن باقی ہے۔ اتر پردیش کے بعض ضلعوں میں آلھا اودل کی منظوم داستان سنانے والے اب بھی مل جاتے ہیں لیکن داستان امیر حمزہ ان سب سے الگ اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کے خاص کرداروں میں بہت سے عرب اور ایرانی ہیں تو بہت سے ہندوستانی بھی ہیں۔ داستان بنانے اور داستان کہنے کی ہندوستانی روایتوں نے بھی اس پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس طرح یہ داستان ایک طرف تو رنگا رنگ وسعت اور تخیل کی بے مثال پرواز، اور بیانیہ قوت کے غیر معمولی اظہار کا نمونہ ہے تو دوسری طرف یہ ہندوستانی اور مسلم تہذیب کے امتزاج کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے اور یہ امتزاج ایسا ہے کہ اس نے ایک بالکل نئی فنی صورت کو خلق کیا ہے۔ یہ داستان اپنی موجودہ شکل میں ہندوستانی اور نامذہبی ہے جس کی تہہ میں مسلمانی تصور کائنات بھی کارفرما ہے۔

داستان گوئی جب شروع ہوئی تو اس میں رزم، یعنی جنگ اور مہم جوئی اور تلاش و دریافت کا عنصر نمایاں تھا۔ بہت جلد ہی اس میں بزم یعنی عشق اور عاشقی، موسیقی و رقص اور نغمہ، سماجی محفلیں وغیرہ بھی شامل ہو گئیں۔ اسی زمانے

میں عیاری کا عنصر بھی شامل ہونا شروع ہوا اور بہت جلد اس نے داستان میں تقریباً مرکزی جگہ اختیار کر لی۔ عیار کا اصل کام دشمن کو فریب دے کر شکست یاب کرنا، خفیہ خبروں کا معلوم کرنا، ہیرو کے دکھ سکھ، جنگ و امن، عشق اور معشوق، ہر معاملے میں اس کے ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ اسی وجہ سے عیاروں میں تیز روی، بھیس بدلنا، چوری اور جعل سازی، مسخرہ پن وغیرہ صفات بھی شامل ہوتی گئیں۔ شروع کی داستان میں جادو، طلسم بندی، دیو، پری وغیرہ کا عنصر بہت کم تھا۔ ہندوستانی داستان گویوں نے داستان کے اس عنصر کو طلسم کا نام دیا اور اس کو بے حد ترقی دی۔ چنانچہ جب ہم داستان کے بارے میں خیال کرتے ہیں تو شاید سب سے پہلا نام جو ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ "طلسم" کا نام ہوتا ہے۔ بہر حال، اب داستان کی شعریات چار چیزوں سے عبارت مانی جاتی ہے: (1) رزم، (2) بزم، (3) طلسم اور (4) عیاری۔ ان عناصر کے درمیان توازن قائم رکھنا اور ان کو بیان کرنے میں تنوع کی کثرت، یہ بھی ہندوستانی گویوں کے کارنامے ہیں۔

ہندوستانی داستان گویوں کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ داستان امیر حمزہ جو اپنی عام صورت میں ایران اور کوہ قاف کے ملکوں میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ہزار صفحات میں سما جاتی تھی، ہندوستان میں آتے ہی پھیلنا شروع ہوئی۔ دہلی، پھر رام پور، پھر لکھنؤ میں داستان گویوں نے اسے اتنا بڑھایا کہ اس کا ایک روپ جو منشی نولکشور کی توجہ سے مطبع ہو سکا (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) چھیالیس جلدوں میں سمایا اور ہر جلد میں کوئی ایک ہزار صفحات ہیں۔ اس طرح چند لاکھ الفاظ کی یہ داستان، ہمارے پاس دو کروڑ سے زیادہ الفاظ میں پھیل کر محفوظ ہو گئی اور اس خزانے کے علاوہ رام پور اور لکھنؤ میں (اسی سلسلہ حمزہ کی اور اس سلسلے کے باہر کی بھی) کئی غیر مطبوعہ داستانیں موجود ہیں۔

داستان کے میدان میں ہندوستان کا تیسرا کارنامہ میر محمد تقی خیال کی "بوستان خیال" ہے جو دلی میں 1730ء کے آس پاس فارسی میں لکھی گئی۔ یہ محض ایک شخص کا کارنامہ ہے اور اگرچہ یہ حجم اور پیچیدگی اور کرداروں کی کثرت کے اعتبار سے داستان امیر حمزہ کی برابری نہیں کر سکتا، لیکن اس نے داستان امیر حمزہ پر اثر ضرور ڈالا۔ پھر تو لمبی چوڑی جلدوں میں اس کے دو اردو ترجمے بھی ہوئے۔ ایک دہلی میں اور ایک لکھنؤ میں۔

لہٰذا ہندوستان اور خاص کر داستان امیر حمزہ کو زبانی بیانیہ کی دنیا میں ہندوستان کا عظیم الشان عطیہ کہنا چاہیے اور اس کی مطبوعہ صورت کو سامنے رکھیں تو اسے ہندوستانی تحریری ادبیات کا بھی بہت بڑا کارنامہ کہنے میں کوئی تکلف نہ ہونا چاہیے۔ وہ لوگ جو داستان کو حقیر سمجھتے ہیں یا اگر حقیر نہیں سمجھتے تو اسے غیر اہم یا غیر ترقی یافتہ کہتے ہیں، انھیں اپنے ملک کے ادب سے محبت نہیں ہے۔

داستان کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب "انسانی تہذیب اپنے بچپن میں تھی۔ لہٰذا داستان ایک غیر ترقی یافتہ صنف سخن اور ناول کے مقابلے میں اکھری چیز ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ

داستان بھی ناول ہی کی طرح ترقی یافتہ صنف ہے، بلکہ اگر دھیان میں رکھی جائے کہ داستان کی عمر ہزار بارہ سو برس کی ہو رہی ہے اور ناول کو باقاعدہ صنف کا درجہ حاصل کیے ابھی مشکل سے ڈھائی تین سو برس ہوئے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کے مقابلے میں داستان بہت زیادہ ترقی یافتہ صنف ہے۔ جدید ناول کے بہت بڑے نظریہ ساز میخائیل باختن (Mikhail Bakhtin) کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ناول تو ابھی ارتقائی منزل طے کر رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ داستان کا ارتقا بہت بڑی حد تک ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہا جاسکتا ہے کہ داستان کا آغاز زمانۂ قدیم میں ہوا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ یہ غیر ترقی یافتہ، یا ذہنی اور تہذیبی اعتبار سے نفاست یعنی Sophistication کی حامل نہیں ہے۔ آخر یونان میں المیے کا آغاز تو اور بھی پرانا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ڈراما کا آغاز کچھ نہیں تو دو ہزار برس پہلے ہوا۔ خود ہمارے اصناف میں غزل اور قصیدہ کم سے کم چودہ سولہ سو برس پرانی اصناف ہیں۔ تو کیا ہم انھیں غیر ترقی یافتہ قرار دیں گے کیونکہ یہ پرانی ہیں؟

ہمارے یہاں لے دے کر ایک کلیم الدین احمد صاحب نے غزل کو "نیم وحشی صنف سخن" بتایا۔ اگر چہ ان کے دلائل بودے تھے اور آج انھیں کوئی تسلیم نہیں کرتا، لیکن قصیدے کو تو کلیم الدین احمد صاحب بھی نیم وحشی نہیں کہہ سکے، حالانکہ غزل اور قصیدہ کی عمر ایک ہے۔ دوسری بات یہ کہ کچھ لوگوں نے داستان کو اس لیے غیر ترقی یافتہ یا غیر اہم بتایا کہ ان کے خیال میں داستان نے جب ارتقا حاصل کیا تو ناول وجود میں آیا۔ یعنی جس طرح سائنس داں لوگ کہتے ہیں کہ بندر کی ارتقائی صورت انسان ہے، لہٰذا بندر کا مرتبہ انسان سے کم ہے، اسی طرح داستان کی ارتقائی شکل ناول ہے، لہٰذا داستان کا مرتبہ ناول سے کم ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ داستان الگ صنف سخن ہے اور ناول الگ صنف سخن۔ ناول اور داستان الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ داستان نے ناول پر کچھ اثر ڈالا ہو، لیکن ناول نے داستان پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

یہ خیال غلط ہے کہ اصناف سخن کا ارتقا ہوتا ہے اور یہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح حیاتیاتی (Biological) اشیا میں ہوتا ہے۔ ارتقا کا عمل انسان کی بنائی ہوئی چیزوں پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ناول کو داستان کی ترقی یافتہ یا ارتقا یافتہ شکل نہیں کہہ سکتے۔ اصناف میں جو تبدیلیاں آتی ہیں انھیں ارتقا نہیں کہہ سکتے، ترقی بھی نہیں کہہ سکتے۔ توسیع کہہ سکتے ہیں ورنہ میر کی غزل کے مقابلے میں غالب کی غزل کو اور غالب کی غزل کے مقابلے میں ناصر کاظمی یا احمد مشتاق کی غزل کو زیادہ ترقی یافتہ، یا زیادہ ارتقا یافتہ کہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مہمل بات ہوگی۔ لیکن ناول کو داستان کی توسیع یافتہ شکل بھی نہیں کہہ سکتے۔ اول تو دو الگ الگ اصناف ہیں اور دوسری بات یہ کہ وسیع تر ناول بھی داستان امیر حمزہ کے ایک حصے "طلسم ہوش ربا" (داستان گو: محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر) کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ وکرم سیٹھ کے ناول A Suitable Boy کو انگریزی کا سب سے بڑا یک جلدی ناول کہا

گیا ہے اور وکرم سیٹھ کا یہ ناول کسی طویل داستان مثلاً شیخ تصدق حسین کی "آفتاب شجاعت" کی ایک جلد کے برابر بھی نہیں ہے۔

داستان اور ناول میں بنیادی فرق یہ ہے کہ داستان کو زبانی سناتے ہیں اور ناول کو چپ چاپ سے پڑھتے ہیں۔ داستان اگر لکھی ہوئی بھی ہو تو وہ پہلے زبانی سنائی جا چکی ہوتی ہے یا پھر وہ اس مقصد سے لکھی جاتی ہے کہ اسے زبانی سنایا جائے۔ محمد حسین جاہ داستان ("طلسم ہوش ربا") لکھ رہے ہیں، لیکن ان کی داستان پہلے زبانی سنائی جا چکی ہے، ایک بار نہیں سیکڑوں بار اور اب بھی وہ لکھ اس طرح رہے ہیں کہ ان کے بقول:

کہ تحریر میں لطف تقریر ہو

جو تہذیبیں اپنی اہم روایتوں اور ادبی کارناموں کو پہلے زبانی صورت میں بناتی ہیں، ان کو یہاں لکھتے ہوئے لفظ کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کے حساب سے وہ بات جو زبانی بنائی جائے (یعنی ملفوظ ہو) اس بات سے برتر ہوتی ہے جو لکھی جائے (مکتوب ہو)۔ یہی وجہ ہے کہ البانیہ کے شہرۂ آفاق ناول نگار اسماعیل قادری کے ناول Broken April میں ایک کردار کہتا ہے کہ "کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ صرف ان لفظوں کی لاشیں ہیں جنھیں زبانی بیان کیا، یا گایا جاتا ہے۔" ناول اور داستان کے یہ فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ہم لوگوں اور ہم لوگوں ہی نے نہیں، بہت سے مغربی نقادوں نے بھی داستان کی اصل اہمیت اور نوعیت کو سمجھا نہیں اور یہ حکم لگا دیا کہ ناول کے مقابلے میں داستان مفضول ہے۔

یہ بات افسوس کا موجب ہے کہ داستان گوئی کے عروج ہی کے زمانے میں اس کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ اس زوال کی وجہ بہت سی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض وجہیں ابھی ہم نے پوری طرح سمجھی بھی نہ ہوں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی تہذیب کے دباؤ نے ہماری تہذیب کے بہت سے اہم عناصر کو ہم سے الگ کر دیا، یا ہمیں مجبور کیا کہ ہم انھیں حقیر سمجھیں۔ داستان بھی انھیں اہم تہذیبی مظاہر میں سے تھی جسے ہم نے کھو دیا۔

اب تو ہم یہ بھی ٹھیک سے نہیں جانتے کہ داستان بنانے اور داستان سنانے کا طریقہ کیا تھا۔ داستان گو لوگ کیا تھے، کون تھے، کتنے پڑھے لکھے تھے، انھوں نے تربیت کہاں سے حاصل کی؟ یہ سب باتیں ہمارے لیے کم و بیش ناپید ہیں۔ مرثیہ بھی چونکہ زبانی بیانیہ کی ایک قسم ہے، اس لیے مرثیہ خوانی کے فن سے ہم کچھ باتیں داستان گوئی کے فن کے بارے میں حاصل کر سکتے ہیں لیکن مرثیے کی مذہبی اہمیت اور حیثیت کی بنا پر مرثیہ خوانی کے فن کا ہر پہلو ہمارے لیے شاید کارآمد نہ ہو اور مشکل یہ بھی کہ مرثیہ خوانی کے فن کے بارے میں بھی ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ داستان گوئی میں فارسی میں سترھویں صدی کے نصف اول میں عبدالنبی فخر الزمانی کی ایک کتاب اور عربی میں انیسویں بیسویں صدی کے کچھ سیاحوں کے بیانات کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ اردو داستان گوئی کے

بارے میں اردو کے آخری داستان گو میر باقر علی دہلوی (وفات 1928ء) کو دیکھنے والوں کے دو مختصر بیانات کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

ایسی صورت میں داستان گوئی کے آغاز نو کی امید کرنا ایک طرح کی حماقت ہی تھی لیکن میں نے اس حماقت کے لیے کچھ ہونہار نوجوانوں کو تیار کرنا چاہا تو سب سے پہلے میری نگاہ محمود فاروقی پر پڑی۔ محمود فاروقی اردو خوب جانتے ہیں، فارسی بھی تھوڑی بہت جانتے ہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اداکاری، ٹیلی ویژن، فلم ان سب میدانوں میں درک رکھتے ہیں۔ یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ انھوں نے حامی بھر لی اور پھر ایک اور اداکار دوست ہمانشو تیاگی کو بھی تیار کر لیا۔ میں نے "طلسم ہوش ربا" سے کچھ صفحات کئی جگہوں سے نکال کر انھیں دیے کہ انھیں دیکھیں، کیا ان کو وہ داستان کے طور پر بیان کر سکتے ہیں؟ ہر چند کہ پرانے داستان گویوں کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ وہ داستان فی البدیہہ بناتے اور سناتے تھے، لیکن ان نوشتوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ لکھی ہوئی داستان کے ٹکڑے زبانی یاد کر کے سنائیں۔ (رتن ناتھ سرشار نے "طلسم ہوش ربا" کی ایک جلد کی تقریظ میں کچھ ایسی عبارت لکھی ہے جس سے اندازہ گزرتا ہے کہ نئے داستان گو بھی زبانی یاد کر کے سناتے تھے۔)

محمود فاروقی نے ایک ترمیم پیش کی، جو میں نے بخوشی منظور کر لی، کہ ایک کے بجائے دو داستان گو ہوں۔ یعنی اسی داستان کا کچھ حصہ ایک سنائے اور بیچ بیچ میں دوسرا داستان گو اپنے حصے کو سنائے۔ اس طرح ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ ایک ہی داستان گو کو لمبی چوڑی عبارت یاد نہ کرنی پڑے گی، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دو طرح کی آوازیں اور طرز داستان گوئی میں کچھ تنوع پیدا کر دیں گی جو جدید سننے والوں کے لیے شاید زیادہ خوشگوار ہو۔

داستان گوئی کے آداب کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا اور جو کچھ میں اپنے اندازے سے سمجھ سکتا تھا، ان کی روشنی میں محمود اور ہمانشو کو میں نے داستان گو بننے کی راہ پر لگا دیا۔ سب سے پہلی خوشی اس بات کی ہوئی کہ داستان گویوں نے اداکاری کی صلاحیت اور تجربے کو کام میں لاتے ہوئے داستان گوئی کو اس طرح اختیار کر لیا گویا یہ ان کا فطری کام تھا۔ اردو نہ جاننے کے باوجود ہمانشو تیاگی نے (اور بعد میں دانش حسین نے، کہ وہ بھی اردو سے بے بہرہ ہیں) تلفظ، لہجہ، آواز کے زیر و بم، مختلف کرداروں اور صورت حال کے مطابق زبان کا استعمال، ان سب چیزوں میں غیر معمولی درک کا اظہار کیا۔ داستان گوئی کی پہلی محفل انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، دہلی میں منعقد ہوئی۔ ولیم ڈیلرمپل کی صدارت تھی۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سامعین میں بھاری اکثریت غیر اردو دانوں کی تھی۔ اس کے باوجود داستان کا بیانیہ اس قدر جابر (جھکا دینے والا) اور داستان گویوں کی ادائگی اس قدر عمدہ تھی کہ سارا ہال واہ واہ، سبحان اللہ، کیا بات ہے! کیا خوب! کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

پھر تو داستان گوئی کے جلسے جگہ جگہ ہونے لگے۔ ملک کے طول و عرض میں، پاکستان میں، پھر نیویارک میں جلسے ہوئے اور بے حد کامیاب ہوئے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ممبئی اور نیویارک کی محفلوں میں نصیر الدین شاہ بھی بطور داستان گو شریک ہوئے۔ اس طرح اس فن کا وقار اور بڑھا ہے۔ داستان امیر حمزہ کے ساتھ کبھی کبھی ''جدید داستان'' پیش کی گئی یعنی جدید واقعات کے بارے میں داستانی رنگ کے بیانیے تیار اور پیش کیے گئے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ محمود فاروقی اور ان کے ساتھیوں نے اصل داستان امیر حمزہ کا ایک چھوٹا سا بھی حصہ نہیں پیش کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا'' سے بعض چھوٹی داستانیں، یا مناظر نکال کر لیکن انھیں کم و بیش بجنسہ سنایا ہے۔ لہٰذا یہ داستانیں نہیں ''داستان زاویاں'' ہیں۔ امید ہے کبھی پوری داستان پیش کرنے کی بھی نوبت آئے۔ ظاہر ہے کہ پوری داستان کئی محفلوں اور کئی جگہوں پر سنائی جائے گی، تب کہیں جا کر پوری ہوگی۔

محمود فاروقی نے اب تک جو داستانیں پیش کی ہیں ان کا یہ مختصر مجموعہ اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کیا جا رہا ہے جو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ یہ مجموعہ داستان گویوں کی تعداد میں اضافہ کرے گا۔ لیکن محمود فاروقی کو مبارک باد دینے کے ساتھ میں یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ داستان گوئی اور فلم یا ڈرامے کے مکالمے ادا کرنے میں کئی فرق ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی زبان کو نہ جاننے والا ایکٹر بھی سن سنا کر اس زبان کے مکالمے بول دے اور کامیاب رہے۔ یا سیکھ کر اور مشق کر کے غیر الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھ لے۔ لیکن داستان میں زبان جس سطح پر اور جس تنوع سے استعمال ہوتی ہے وہ سطح اور تنوع فلم یا ڈرامے میں موجود نہیں۔ لہٰذا داستان گو کو اگر فارسی اور اردو دونوں نہیں، تو اردو پڑھنے اور سمجھنے پر ضرور قادر ہونا چاہیے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ داستان گوئی کی یہ چھوٹی سی نہر جو محمود اور ان کے ساتھیوں نے اس سنگلاخ زمانے کی زمین میں کاٹی ہے، کسی وقت جلد ہی ایک جوئے بے کراں بن جائے۔

داستان گوئی

محمود فاروقی، محمد کاظم

داستان، داستان گو اور ناظرین

محمد کاظم

> ''داستان اس قسم کا بیانیہ ہے جس کا تعلق ان اصناف سے ہے جو زبانی سنائی جانے کے لیے لکھی جاتی تھی..... لہٰذا داستان اور اس طرح کی دوسری بیانیہ اصناف کا زبانی سنی جانے والی شئے ہونا آج بعض لوگوں کے لیے عجیب بات ہو تو ہو، لیکن اس تہذیبی ماحول میں جس میں داستان وجود میں آئی۔ یہ معاملہ کسی بھی سطح پر اجنبیت کا حامل نہ تھا۔''

ان خیالات کا اظہار 1998ء میں شمس الرحمٰن فاروقی نے دلی یونیورسٹی میں نظام خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا تھا۔ اس وقت داستان کی جانب نہ تو ادب کے سنجیدہ نقاد کی توجہ ہوئی تھی اور نہ ہی ان اساتذہ کی جو اردو ادب کی درس و تدریس سے منسلک ہیں اور اپنی نگرانی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلواتے ہیں۔ حسب روایت ہمارے کلاسیکی ادب کی طرح داستان کی جانب بھی ایک غیر ملکی ادیب فرانسس پریچیٹ نے توجہ کی اور پھر شمس الرحمٰن فاروقی نے داستان امیر حمزہ کی تمام جلدوں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے ''ساحری، شاہی اور صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' پیش کیا اور چار جلدوں میں اردو کے قارئین کو اس کے اسرار و رموز سے واقف کرانے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجہ میں اردو والوں تک نہ صرف اس کی جانکاری پہنچی بلکہ داستان کے سلسلے میں دلچسپی بڑھی ہے۔

داستان کا ذکر کرتے ہوئے ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کے علاوہ دوسری داستانوں پر گفتگو نہیں ہوتی تھی ہاں بعض اوقات ''بوستان خیال'' کو یاد کر لیا جاتا تھا۔ وجہ شاید یہ ہو کہ یہ داستانیں شائع ہو کر کتابی شکل میں پہلے منظر عام پر آ گئی اور ہمارے ناقدوں نے اکثر شائع شدہ مواد کو زیادہ اہمیت دی ہے اور زبانی بیان کنندہ یا پیش

کرنے والے فن کو نہیں کے برابر گردانتا ہے، ڈرامے سے عدم توجہی اس کی مثال ہے۔ چونکہ داستان امیر حمزہ یا طلسم ہوش ربا سنائی جاتی رہی ہیں اس لیے اس کے زبانی بیان کردہ متن کو ہم نے اہمیت نہیں دی۔ اکثر سکہ بند ناقدوں کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ زبانی سنایا جانے والا یا پیش کرنے والا فن نیم ادبی یا بچگانہ ہوتا ہے، اس میں سنجیدگی نہیں ہوتی، حقیقت سے دور ہوتا ہے، خیالی اور فرضی باتوں کو بیان کیا جاتا ہے، اس لیے ادب میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ لیکن ہم یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کتابوں کو پڑھنے کے بجائے سننے کا عمل دلوں کو زیادہ بہتر گرفت میں لیتا ہے کہ شائع ہوئی کتابوں کو پڑھنے کے بجائے سننے کا عمل دلوں کو زیادہ بہتر گرفت میں لیتا ہے کہ شائع ہوئی کتابوں کے قارئین سے کئی سو گنا زیادہ سامعین و ناظرین تک نہ صرف بیان اور پیش کیے جانے والا فن / متن پہنچتا ہے بلکہ ان کے دلوں اور ذہنوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں محفوظ ہوتا ہے جو دیرپا بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات ان فنون میں ظاہری طور پر خلاف اخلاق باتیں نظر آتی ہیں لیکن یہ زندگی کی حقیقت ہوتی ہے۔ ان لوازمات کو زندگی سے نکال دیا جائے تو نہ صرف زندگی روکھی اور پھیکی ہو جائے گی بلکہ بدرنگ بھی نظر آئے گی۔ گویا یہ فنون زندگی کو بناوٹی طور پر نہیں بلکہ جیسی ہوتی ہے ویسی ہی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزوں کے آنے کی یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے میں بیان اور پیش کیے جانے والے اصناف عوام میں نہ صرف مقبول رہے بلکہ وہ ان کی رہنمائی بھی کرتے رہے ہیں۔ اس کی مثال ہماری داستانوں اور ڈراموں میں جا بجا مل جائے گی۔

اب اگر قدیم داستانوں کو دیکھتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ یہ سولہویں صدی سے سنائی جاتی رہی ہیں لیکن ان کے شائع ہونے کا سلسلہ پہلی بار انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں شروع ہوا لیکن دستان امیر حمزہ کو نول کشور پریس نے داستان گو محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر اور شیخ تصدق حسین کی مدد سے 1881ء میں شائع کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ 1960ء تک جاری رہا۔ داستان امیر حمزہ 46 جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ تمام جلد ایک جگہ نہیں ملتیں لیکن شمس الرحمن فاروقی نے اپنی انتھک کوششوں کے بعد اسے نہ صرف یکجا کیا بلکہ اس کے مطالعہ کے بعد اس پر چار جلدوں میں اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔

موجودہ دور میں ان داستانوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان بہت مشکل ہے اور اس زبان کو سمجھنے والے کم لوگ ہی رہ گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان داستانوں میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں وہ نہ صرف نامانوس ہیں بلکہ مصنوعی لگتے ہیں لیکن چونکہ یہی داستانیں پہلے سنائی جاتی تھیں۔ اس لیے اسے کتابی شکل میں محفوظ کیا گیا اور آج اس کلاسک کو عوام تک پہنچانے کے لیے اس کی تجدید ضروری تھی، گو کہ اسے پیش کرنا نہ صرف مشکل بلکہ جو کھم بھرا عمل تھا جسے نہایت خوش اسلوبی سے محمود فاروقی، دانش حسین اور ان کے ساتھیوں نے آسان کر دکھایا

جس کا ڈنکا نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر بج رہا ہے۔

جدید دور میں اب داستان نہ صرف سنانے کا فن رہ گیا ہے بلکہ پیش کیے جانے کا فن بنتا جا رہا ہے حالانکہ آج بھی نہ صرف وہ داستان گو ایک تخت پر بیٹھ جاتے ہیں اور بغیر کسی اضافی لوازمات کے داستان سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ داستان وہی پرانی ہوتی ہے لیکن چونکہ موجودہ داستان گو اداکاری کی اضافی تکنیک سے واقف ہیں اس لیے اب داستان گوئی میں صرف طے کیے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اس کے پیش کش کے دوران ہونے والے تمام عوامل اس کا جز بن جاتے ہیں اور اب صرف الفاظ کی بہت زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی۔ چہرے کے تاثرات، لباس، روشنی یا دوسرے چھوٹے چھوٹے لوازمات کبھی کبھی بہت اہم کام کر جاتے ہیں۔ پہلے چونکہ بڑی محفلیں ہوتی رہی ہوں گی اور روشنی کا بھی معقول انتظام نہیں ہو پاتا ہوگا لیکن اب نہ صرف محفلیں مقابلتاً چھوٹی اور روشنی کا انتظام ہونے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے حرکات و سکنات کے ساتھ ساتھ چہرے کے معمولی تاثرات کو بھی بخوبی ناظرین کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور یہ موجودہ داستان کو مزید متاثر کن طریقے سے پیش کرنے میں مدد بھی کرتا ہے۔

اس کتاب میں شامل بارہ داستانوں میں سے دس داستانیں امیر حمزہ کی ان ہی جلدوں سے ماخوذ ہیں۔ ان ماخوذ داستانوں کے مطالعہ کے دوران اس میں تبدیلی محسوس ہوگی اور وہ تبدیلی زمانے کے لحاظ سے بامعنی اور اہم ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ داستان سنانے کا فن ہے اور ہر سنانے والی چیز من و عن نہیں پیش کی جا سکتی۔ اس لیے یہاں داستان کے اس متن کو پیش کیا جا رہا ہے جسے محمود فاروقی اور ان کے ساتھی مسلسل سنا رہے ہیں۔ اس کتاب میں ایک نئی داستان بھی شامل ہے۔ یہ جدید داستان محمود فاروقی نے تیار کی ہے، جس کے مطالعے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ داستان کا دور ختم نہیں ہوا بلکہ اب بھی داستانیں تیار کی جا سکتی ہیں اور داستان تیار کرنے کے لیے طلسم کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ رزم بزم اور کشمکش کی مدد سے نہ صرف نئی داستانیں تیار ہو سکتیں ہیں بلکہ کسی بھی موضوع پر اچھی اور کامیاب داستانیں تیار کی جا سکتی ہیں اور تیار کی جا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر تقسیم ہند، بیناک سین، اے انت سنگھ وغیرہ داستان کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

داستان گو :داستان گوئی کی ابتدا پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ سولہویں صدی میں داستان سنائی جاتی تھی۔ یعنی سولہویں صدی میں داستان گو موجود تھے اور وہ حمزہ نامہ کی داستانیں سنایا کرتے تھے اور اس دور میں باضابطہ داستان گوئی کی ترکیب استعمال ہوتی تھی۔ انیسویں صدی تک آتے آتے نہ صرف شمالی ہند بلکہ جنوبی ہند میں بھی داستان گوئی کا رواج ہوا اور داستان گوئی ایک فن کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اب نہ صرف داستانیں باضابطہ پیش کی جانے لگیں بلکہ داستان گوئی کی تربیت بھی دی جانے لگی۔ فن داستان گوئی میں استادی و شاگردی کا رواج بھی

شروع ہوا اور پھر داستان گویوں کا سلسلہ چل پڑا۔ اس سلسلے محمد حسین جاہ (93-1891ء کے درمیان فوت ہوئے)، میر احمد علی، انبا پرشاد رسا (1886-1790ء)، محمد امیر خان، شیخ تصدق حسین (17-1911ء کے درمیان فوت ہوئے)، احمد حسین قمر (1901-1845ء)، سید اسماعیل اثر اور میر باقر علی (1928ء میں فوت ہوئے) وغیرہ اہم داستان گو ہیں۔

ان تمام داستان گویوں میں میر باقر علی نے داستان گوئی کے فن کو جو جدت عطا کی وہ دوسروں کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی داستان گوئی کا زمانہ وہی ہے جو پارسی تھیٹر کے عروج کا زمانہ ہے۔ گویا دونوں روایت ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں۔ پارسی تھیٹر کے اداکار جدید تکنیک سے آراستہ ہونے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، تو میر باقر علی داستان گوئی کی روایات کے عظیم اداکار کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ داستان گوئی کے فن میں انھوں نے بلاشبہ اضافہ کیا۔ ان کی داستان گوئی کے دوران اداکاری کا بہترین نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حالانکہ وہ جسامت کے لحاظ سے بہت دبلے پتلے تھے لیکن کردار کو پیش کرتے وقت اپنے جسم کے حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات سے راجا اور رنک کا فرق صاف طور پر دکھا دیتے تھا۔ ناظرین ان کے ذریعہ پیش کیے گئے ہر کردار کو مکمل صورت محسوس کرتے تھے۔ مختلف مرد کرداروں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے کرداروں کو بھی اس فنکاری سے پیش کرتے تھے کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ ناظرین ان کی بیانیہ کے ساتھ سفر کرتے تھے اور ان کے ذریعہ بیان کیے گئے واقعات و حادثات کو مکمل صورت میں اپنی نظروں کے سامنے پیش ہوتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ گویا وہ سن نہیں رہے بلکہ دیکھ رہے ہیں۔ 1928ء میں میر باقر علی کے انتقال کے ساتھ داستان گوئی کے سنہرے دور کا خاتمہ دکھائی دیتا ہے۔ 2005ء میں تقریباً اسی سال کے بعد داستان گوئی کا دوبارہ جنم ہوا اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریک پر اکیسویں صدی میں اسے از سر نو شروع کرنے کا سہرا محمود فاروقی کے سر جاتا ہے۔

4 مئی 2005ء کی شام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے حال میں شمس الرحمٰن فاروقی اور William Dalrymle کی موجودگی میں طلسم ہوش ربا سے دو داستانیں پیش کی گئیں۔ اس دن داستان گوئی کی نہ صرف از سر نو شروعات ہوئی بلکہ عوام ایک بھولی بسری روایات اور بیانیہ فن پارے سے واقف ہوئے اور عوام کو ایک بار پھر یہ احساس ہوا کہ یہ روایات جتنا اہم اور مضبوط ہیں اور پھر یہ سلسلہ اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھا کہ اب پوری دنیا اس کی گرفت میں نظر آ رہی ہے۔ آج بھی محمود فاروقی اور دانش حسین کی قیادت میں یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> "محمود فاروقی اور ان کے ساتھی داستان گوئی سے زیادہ داستان خوانی کی منزل کے فنکار ہیں یعنی انھوں نے داستان گوئی کسی استاد سے سیکھی نہیں بلکہ وہ دوسروں کی لکھی ہوئی داستان کے اجزا اپنے جوہر قابل کے بل بوتے پر عوام کے

سامنے پیش کرتے ہیں۔''

(ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد دوم، ص:14)

جس طرح اٹھارہویں صدی میں بہت سے داستان گو نئے نئے داستان گو کو تیار کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اسی طرح محمود فاروقی اور دانش حسین نے نئے نئے داستان گو کو تربیت دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی داستان گو خاتون فوزیہ تھیں۔ پھر اس سفر میں نصیر الدین شاہ ان کے ساتھ ہوئے اور اب ہندوستان کے مختلف حصوں میں ان کے ساتھ ساتھ راجیش کمار، شیخ عثمان، رانا پرتاپ، منوسکندر، ڈھنگرا، یوتج سنگھ، گلجیب سنگھ، شروتی پارتھا، سارتھی، انکت چڈھا، ندیم شاہ اور آرتی جین پورے ملک میں گھوم گھوم کر داستان سنا رہے ہیں۔

قدیم دور میں صرف ایک داستان گو داستان سنایا کرتے تھے لیکن اکیسویں صدی میں اب دو داستان گو بیک وقت داستان سناتے ہیں۔ اس سے نہ صرف داستان سنانے میں مدد ملتی ہے بلکہ داستان کو ناظرین تک زیادہ پر اثر اور دلچسپ انداز میں پہنچایا جا رہا ہے۔ ایک سے زیادہ کردار کو نہایت فنکاری سے پیش کیا جا رہا ہے۔ گویا یہ تجدید داستان گوئی کی عمدہ مثال ہے۔

ناظرین: کوئی بھی پیش کیا جانے والا فن اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اسے ناظرین کے روبرو پیش نہ کر دیا جائے۔ گویا فن، فنکار اور ناظرین مل کر ہی کسی پیش کیے جانے والے فن کو مکمل کرتا ہے۔ کسی ایک کی بھی غیر موجودگی میں فن ادھورا ہی رہتا ہے۔ گویا یہ تینوں مل کر ایک ایسی وحدت بناتے ہیں جس کے ذریعہ ایک دوسرے کی معنویت کا احساس ہوتا ہے اور یہ تینوں مل کر ہی معنویت کی پرتیں کھولتے ہیں۔ مختلف مقام پر مختلف ناظرین کے ہونے کی وجہ سے ایک ہی فن پارے کی مختلف جہتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب داستان امیر حمزہ: زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین میں لکھتے ہیں:

''داستان گو کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ داستان چونکہ زبانی بیانیہ ہے اس لیے اس کا حقیقی وجود سامعین یا کم سے کم ایک سامع کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی: داستان امیر حمزہ: زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین، ص:131)

''داستان گو اور اس کے سامعین میں ہم آہنگی کا رشتہ ہوتا ہے۔ داستان گو یا تو وہی کہتا ہے جو اس کے سامعین سننا چاہتے ہیں یا پھر وہ انھیں اپنا ہم خیال بنا کر اپنی بات یوں کہتا ہے جیسے وہ سامعین ہی کی بات کر رہا ہو۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی: داستان امیر حمزہ: زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین، ص:133)

''داستان'' ''عوامی'' اور ''پنجابی'' صنف سخن نہیں ہے۔ لیکن اس کی ایک بہت

بڑی قوت اس بات میں ضرور ہے کہ وہ اپنے سامعین سے ہم آہنگی کے باعث ہم جیسے عام لوگوں کو ایک ایسا تصور حیات دے دیتی ہے جس کی روشنی میں انسانی اور غیر انسانی دونوں کائناتوں کے معنی تھوڑے، بہت آسان لگنے لگتے ہیں۔''

(شمس الرحمن فاروقی: داستان امیر حمزہ: زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین، ص: 141)

ان اقتباسات میں لکھے گئے لفظ ''سامعین'' کو آج ''ناظرین'' میں بدل دیتے ہیں تو اس کی مقبولیت اور بڑھ جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی محفل میں موجود ناظرین کی حرکات وسکنات اور ان کے ذریعے دیے گئے تاثرات سے فنکار کو نہ صرف توانائی ملتی ہے بلکہ وہ اس پوری پیش کش کی رہنمائی کرتا ہے۔ اچھے ناظرین کی موجودگی کسی بھی پیش کش کو اچھا بنا سکتی ہے اور خراب ناظرین کسی بھی پیش کش کو خراب بنا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ داستان گوئی کے ناظرین بھی داستان گوئی اور داستان گو پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ داستان گو ناظرین کے تاثر کی مناسبت سے اپنی توانائی کا استعمال کرتا ہے۔ ایک ہی داستان کو مختلف ناظرین کی موجودگی میں مختلف طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے اور کیا بھی ہے۔ بعض اوقات داستان گو یاد کی ہوئی داستان کو من وعن سنا دیتے ہیں تو اکثر داستان میں کچھ اضافہ اور کچھ کمی بھی کرتے چلتے ہیں۔ گویا ہر پیش کش مختلف ہوتی ہے، یعنی ناظرین خود پیش کش کو طے کرتا ہے۔ چونکہ ہر پرفارمنس سیال ہوتا ہے، اس لیے ناظرین کے سانچے کی مناسبت سے خود کو ڈھال لیتا ہے۔ بعض اوقات حرکات وسکنات کے ساتھ ساتھ اس کی زبان تک بدل جاتی ہے اور داستان گو کے پیش کیے گئے داستان کے گواہ یہ ناظرین ہو جاتے ہیں۔ ناظرین کی پسند و ناپسند سے داستان کو طویل یا مختصر کیا جا سکتا ہے اور یہ کام اچھے اور کہنہ مشق فنکار دوران پیش کش بخوبی کرتے ہیں۔

زمانہ قدیم میں سامعین کیسے ہوتے تھے اور داستانوں کی مجلس کا اہتمام کس طرح کا ہوتا تھا اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا لیکن موجودہ دور میں ناظرین کا ذوق اس قدر بدل چکا ہے کہ اب مشاعرہ جیسی تہذیب یافتہ محفل میں بھی تالیاں پیٹ کر داد دیتے ہیں۔ بقیہ محفلوں کا عالم تو اور بھی دیگر گوں ہیں۔ ایسے ماحول میں جدید داستان گو نے اپنی کوششوں سے یہ ماحول تیار کیا ہے کہ داستان گوئی کی محفلوں میں ناظرین تالیاں بجانے کے بجائے واہ واہ، سبحان اللہ، بہت خوب کا ورد کرتے نہیں تھکتے، گویا یہ داستان گو نہ صرف داستان پیش کرنے کا کام کر رہے ہیں بلکہ ناظرین کو تہذیب یافتہ بنانے کا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

اس کتاب میں شامل داستانوں کو مختلف طرح کے ناظرین کے درمیان پیش کیا جا چکا ہے۔ یعنی ایک جانب انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، انڈیا ہیبیٹ سینٹر میں پیش کیا گیا تو دوسری جانب پرانی دلی کی گلیوں میں بھی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ دونوں مقام کے ناظرین کے فرق سے ہم سب واقف ہیں، لیکن ان داستان گویوں کا کمال ہے کہ

دونوں مقام پر برابر داد ملی اور اسے بار بار پیش کرنے کی فرمائش کی گئی۔ ایک جانب ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی بار سنایا گیا تو دوسری جانب غیر ممالک بشمول پاکستان، امریکا، سری لنکا وغیرہ کے ناظرین کے سامنے کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ وہاں بھی ان تمام داستانوں کو اتنی ہی مقبولیت ملی جتنی ہندوستان و پاکستان میں۔ یعنی اب داستان زبان کی سرحد سے باہر نکل کر اپنا دائرہ وسیع کر رہا ہے۔ اب ناظرین کا داستان کی لکھی جانے والی زبان کا جاننا ضروری نہیں رہا۔ اس لیے اب داستان گو پر بڑی ذمے داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ کس طرح ان ناظرین تک داستان کو پہنچائے جو داستان کی لکھی جانے والی زبان سے ناواقف ہیں۔ پہلے زمانے میں ناظرین کا خیال نہیں کے برابر رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب ناظرین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فن کے اعتبار سے بھی اس میں کافی تبدیلی آ گئی ہے اور اب داستان گو اور ناظرین کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو گیا ہے اور ناظرین پیش کش کا اہم ترین حصہ بن گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ آج کے ناظرین مافوق الفطری اور جادوئی اثرات کے سحر سے واقف نہیں اس لیے ان کے روبرو ان واقعات و حادثات کو پیش کرنا اور انھیں ان پر یقین دلانا زیادہ مشکل ہے اور یہ مشکل کام آج کے داستان گو کر رہے ہیں اور ناظرین جاننے اور سمجھنے کے باوجود اس پر یقین کرتے ہوئے ان داستان گو کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔

داستان گوئی
محمود فاروقی، محمد کاظم

شوقِ آوارگی میں

محمود فاروقی

بقول بڑے ابو، یہ آوارہ گھوم رہا تھا تو میں نے اس سے کہا: بھئی اس سے تو اچھا ہے تم لوگوں کو داستان سناؤ۔ تفصیل اس الزام کی یہ ہے کہ یہ بات ہے تقریباً سن دو ہزار کی۔ ان دنوں میں راہ پہ لگنے کے واسطے بھٹک سا رہا تھا۔ کیمبرج میں Ph.D کو خیر باد کہہ کے NDTV میں زندگی کی واحد باضابطہ نوکری کو ترک کر کے ممبئی کی گویا خاک سی چھان رہا تھا۔ "خاک سی" اس لیے کہ زمانہ اب اتنا بدل گیا ہے کہ نہ وہ خاک بچی جو باقاعدہ چھانی جائے نہ وہ خاکسار جو اسے پورے انہماک سے چھان سکے۔

بہر صورت بڑے ابو فاروقی صاحب یعنی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا ایک روز فون آیا کہ امریکا میں ایک اوسامہ خالدی صاحب ہیں جو داستانوں پہ کوئی فلم سی بنانا چاہ رہے ہیں اور انھیں کچھ مدد درکار ہے تو تم کیا ان کی مدد کرو گے۔ میں بخوشی تیار تھا حالانکہ ڈاکیومنٹری اور داستان دونوں اس وقت میری تمناؤں سے بہت دور تھے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ممبئی میں بھٹک رہی آتماؤں کے لیے کام آخر کام ہے۔ مگر ایک عام اردو قاری کی طرح داستانوں کا تصور میرے ذہن میں بھی بہت گنجلک سا تھا۔ میر امّن دہلوی کی "باغ و بہار عرف قصہ چار درویش" کچھ الف لیلوی سے افسانے، بچپن میں رکھی ہوئی کچھ سوئی پرانی کتابیں جنھیں اردو سدھارنے کے واسطے پڑھنے کی تکلیف دی جاتی تھی، مجموعی طور پر کوئی روکھی سی، بھولی ہوئی، قدیم اور بے مزہ روایت۔

پھر بات شروع ہوئی فاروقی صاحب کی داستان امیر حمزہ پہ مفصل تحقیقی کتاب پڑھنے سے۔ "ساحری، شاہی، صاحب قرانی"، کوئی 528 صفحوں کی یہ تصنیف اپنے آپ میں اس قدر دلچسپ، فکر انگیز اور رسیلی تھی کہ یقیناً کسی داستان سے کم نہ تھی۔ تب سے میں کوئی تین دفعہ اسے پڑھ چکا ہوں اور میری رائے میں یہ جدید ہندوستان کی بہترین non-fiction یعنی غیر افسانوی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب نے کئی در بیچے وا کیے، ہندوستانی

اور اردو ادب، تمدن، ثقافت اور Colonial یعنی نو آبادیاتی نظام کے گہرے اور دیرپا اثرات بلکہ نقصان کے بارے میں۔ ایک اتنا بڑا شاہکار، چھیالیس جلدوں یا 45 ہزار صفحات پر پھیلی ایک انوکھی دستانی روایت، اس کے کردار، اس کا اسلوب، اس کی زبان، اس کا تخیل، آدمی کس کس چیز پہ دم بھرے۔ اور سب سے بڑھ کے اس کا مظاہراتی پہلو یعنی یہ کہ یہ اس قدر دیو قامت دیومالائی دنیا زبانی بیانیے سے اُپجے تھے۔ یعنی اس کے سنانے والے اور اس کے بنانے والے دونوں ایک ہی قبیل کے فنکار تھے۔ ادب اور اداکاری، Form اور Content، فنکار اور اس کا مواد کچھ اس طرح سے یکجا تھا کہ صرف موسیقی میں مشکل سے یہ ہم آہنگی نظر آتی ہے۔

تو کوئی چار سالوں تک میں اس کے اطراف میں گھومتا پھرا۔ کبھی اخباروں میں لکھ کے، کبھی صرف بتیا کے، کبھی Documentary کی Funding کے لیے Apply میں ہی سوچ رہا تھا۔ مگر میں تب تک صرف اس کے اوپر یا اس کے بارے میں فلم بنانے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ابھی تک داستانوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ Documentary بنانا اس معاملے میں کس قدر جوکھم کا کام ہے کہ مالی توازن کے لیے آپ کو طرح طرح کے اداروں کے آگے پیچھے گھومنا پڑتا ہے۔ جن سب کے اپنے اپنے Agendas ہیں۔ تو Documentary تو نہ بنی مگر اس پہ کام کرنے کے واسطے میں نے سرائے نام کی ایک عجیب و غریب دنیا سے ضرور جا نکرایا جو اس سفر کا میل کا پتھر ثابت ہوئی۔

سرائے ایک سنگم بھی ہے، سفینہ بھی، سفر بھی ہے، پڑاؤ بھی۔ (Centre CSDC for research in Developing Societies) سے منسلک، ایک ایسا ادارہ جہاں شہر، شہریت، آرٹ، سینما، تصویری، فلسفہ، زبان، ادب اور فنون لطیفہ سب پہ مشترکہ طور پر کام ہوتا ہے، باتیں ہوتی ہیں، اڈے جمتے ہیں اور بات سے بات نکلتی ہے۔ نئے میڈیا پر نئے میڈیمس کے ذریعے دینے والے ایسے تنقید، اشاعت، مظاہرے، آرکائیوز، کتابوں، رسالوں سے نئے شہروں اور نئی شہریوں پر جامع اور باریک نظر رکھتے ہیں۔ نظر، نظریہ، نظریا سازی اور بدلتے دور کی عکاسی، سرائے میں ایسا بہت کچھ تھا جس کی میرے جیسے مسافر کو تلاش تھی۔ بطور ایک Independent fellow: یعنی کہہ لیجیے تو آزاد محقق کے، میں نے 2004-2005ء (اور میرے ساتھ ایسے ہی پچاس ساٹھ لوگ اور تھے) میں نے پہلی بار سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا داستانوں کا۔ پر داستان گوئی تب تک میرے لیے ماضی بعید کی ہی ایک صنف تھی جسے میں دنیا کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ خود داستانیں سنانے کے بارے میں میں نے تب تک سوچا بھی نہ تھا۔

تو سن 2005ء میں میں نے پہلی بار طلسم ہوش ربا پڑھنی شروع کی۔ آٹھ جلدوں میں پھیلی طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ کا سب سے مشہور و معروف دفتر یعنی حصہ یا سیکشن۔ پہلی جلد پڑھتے پڑھتے ہی مجھے اس کی بے پناہ

زبانی قوت کا پہلا براہ راست تجربہ ہو چلا۔ اتفاقاً ان ایام میں میں نے ایک نوٹ لکھ کے اپنے دوست، پرشانتو سین کی والدہ جینتی سین کو دیا جو ان دنوں وزارت اسٹیل میں سیکریٹری تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر P.C.Sen جو ان دنوں IIC(India International center) کے ڈائریکٹر تھے، سے زور دے کر کہا کہ اس کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔ تو پروویر انکل نے مجھے بلا کے کہا کہ کیوں نہ میں IIC میں اس موضوع پر ایک Lecture demonstration دوں۔ پھر میں نے فاروقی صاحب سے رجوع کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اس صنف کی توانائی کا سب سے اعلیٰ مظاہرہ اس کو سنا کے ہی کیا جا سکے گا۔ تو IIC کے پروگرامنگ ڈپارٹمنٹ خاص کر فاروقی صاحب، ہمارے اور انوشا کے مشورے سے اس پہلے پروگرام کا خاکہ تیار ہوا جو 5 مئی 2005ء کو IIC میں پیش ہوا۔ اس شام پہلے Willam Dalrymple نے زبانی روایتوں پہ کچھ تبصرہ کیا پھر فاروقی صاحب نے داستانوں پہ تقریر کی اور فی البدیہہ ایسی عمدہ، سلیس اور دل کش تقریر کی کہ اس نے سننے والوں کا دل جیت لیا۔ پھر میں اور میرے پرانے اسکول کے دوست اور تھیٹر کے ساتھی ہمانشو تیاگی نے مل کر طلسم ہوش ربا کی جلد اول سے ہی داستانیں پیش کیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ الحمدللہ وہ شام اس قدر کامیاب ہوئی اور داستان گوئی اتنی سراہی گئی اور ایسی واہ واہ ہوئی کہ آج پانچ سالوں بعد بھی اس کی گونج اور اس کی گرمی میرے اندر سمائی ہوئی اور داستان گوئی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

میں نے پہلے شو کے بارے میں اس قدر تفصیل سے اس لیے لکھا ہے کہ بہت دفعہ چیزیں ہو جاتی ہیں اپنے آپ۔ تمرائے، Sen family، نے سب نے خود بہ خود محرکات پیش کیے کہ داستان گوئی کی پہلی جدید محفل عمل میں آئی۔ یہ سب نہ ہوتا تو شاید میں اتنے بڑے پیمانے پر داستان سنانے کا بیڑہ نہ اٹھاتا، شاید وہ Show ہی نہ ہوتا یا اس طرح سے نہ ہوتا کیونکہ میں پہلے تھیٹر کر چکا تھا، خود ساختہ طور پر اور اس وقت میرے اندر اتنی انرجی نہیں تھی کہ میں کوئی تھیٹر یک کراتا، جگہ جگہ سے Permission لیتا، Publicity کراتا اور Audience کا انتظام کرتا، جو دہلی میں تھیٹر کرنے والوں کا عام سر درد ہے۔ حالانکہ جب میں نے Performance کی غرض سے پہلی بار داستان بآواز بلند پڑھیں تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ چیز اور اس کے ذریعے مجھے بہت سرخ روئی مل سکتی ہے۔ بہر حال، بات کا لب لباب یہ ہے کہ جو چیز جس طرح سے ہوئی، شاید وہ اسی طرح سے ہو سکتی تھی، اور اس سفر کے رفیقوں کو یاد نہ کرنا اور انھیں داد نہ دینا کم ظرفی ہوگی اور اب ملک بھر میں پاکستان میں امریکا میں، دبئی میں، سری لنکا میں سو ڈھائی سو سے زیادہ شو ہو چکے ہیں۔

تب سے اب تک کئی اور لوگ اس صف میں شامل ہو چکے ہیں۔ ہمانشو 2006ء میں ممبئی منتقل ہو گئے تو دانش میرے ساتھ ہوئے اور اس طرح جڑے کہ اب یقین کرنا مشکل ہے کہ ان کے بغیر بھی میں نے داستانیں

سنائی تھیں، پھر دلی میں فوزیہ داستان سنانے والی پہلی خاتون ہوئی، پھر 2009ء میں نصیرالدین شاہ ہمارے ہم سفر ہوئے اور ہم نے امریکا اور ممبئی میں کافی شو کیے، پھر اسی سال ممبئی میں ورکشاپ کی تو مزید داستان گو سامنے آئے جن کی تفصیل ہمارے Blog(www.dastangoi.blogspot.com) پر موجود ہے۔ اب تک کل دس گیارہ لوگ میرے ساتھ اس مہم میں شامل ہو چکے ہیں اور دیگر لوگ تیاری میں جٹے ہیں۔

آج کے دور میں داستان گوئی کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے اس سوال کا میرے پاس کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہے۔ اگلے دور کے داستان گو جب داستانیں سناتے تھے تو سننے والوں کو ان کی زبان اور ان کی داستان کا بھرپور علم ہوتا تھا۔ آج جب ہم انھیں داستانوں کو سناتے ہیں تو سننے والے نہ ان کرداروں سے واقف ہیں نہ اس زبان سے جس میں یہ سنائی جارہی ہے۔ ظاہر ہے وہ اس کا لطف الگ معنوں میں اور الگ طریقوں سے لیتے ہیں۔ مجھ سے داستانوں کی مشکل اردو کے بارے میں بارہا سوال کیا گیا ہے کہ جو چیز آج عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں رہ ہے اور جسے اچھے سے اچھے اردو والے بھی نہیں سمجھ سکتے اسے کیوں نہ آسان کر دیا جائے۔ ایک عوامی فارم، وہ فارم جو کبھی عوامی تھا اتنی مشکل زبان کیوں اپنائے؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عظیم داستانیں، قصے کہانیاں سنانے والے جس زبان میں سنا گئے ہیں اس کے ساتھ کیسے چھیڑ خوانی کی جائے۔ شیکسپیر کی تحریر بھی عام فہم نہیں ہے مگر کیا ہم اس کی زبان کو Paraphrase کرکے آسان بنا کے سنا دیں، اور موجودہ ہندوستان میں اردو جس طرح کے حاشیے پر ڈھکیل جا چکی ہے اس کے مدنظر ایسی زبان اور ایسی داستانیں لوگوں کو سنانا کیا خود اپنے آپ میں ایک سیاسی عمل نہیں ہے، مزید یہ کہ اگر کسی جملے یا شعر کی خوبصورتی لوگوں تک نہیں پہنچ رہی ہے تو کیا محض زبان یا الفاظ بدل دینے سے ہم وہی خوبصورتی لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں؟ زبان سے لذت اٹھانے کا جو فعل ہے، بلکہ سننے کا جو عمل ہے اس میں حرف حرف کا مطلب سمجھنا کتنا ضروری ہے؟ یقیناً ہمارا جو پیش کش کا انداز ہے، جو اتار چڑھاؤ ہے، جو ہمارا بیان ہے وہ سب کچھ لوگوں کو سمجھانے کی ذمہ داری اور بوجھ سے بیرا یا آزاد نہیں ہے اور باتوں کو سمجھانے کا یہ فعل صرف زبان تک محدود نہیں ہے۔ داستان کے کرداروں، اس کی تحریکوں، اس کی دنیا، اس کی اصطلاحات یا ٹرمنالوجی، اس کا ایکشن، یہ سب سمجھانا پڑتا ہے اور یہ سب ہمارے Form کا ایک اہم حصہ ہے۔

تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اس کے Content یعنی مواد کو نکال دیا جائے تو پھر Form کیا بچے گا؟ کیا کوئی آزاد صنف یا Genre ہے جسے ہم داستان گوئی کہہ سکتے ہیں جو موجودہ تھیٹر یا موجودہ اداکاری کے میدانوں سے جدا ہے۔ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ آج کے دور میں داستان گوئی تھیٹر کی ایک صنف ہے کوئی آزاد Genre نہیں۔ اس کو سنانے والے اور سننے والے دونوں جدید تھیٹر کے ہی پروردہ ہیں اور اسی کی فصیلوں کے تحت اسے اکثر پیش کیا

جاتا ہے۔ اسٹیج کا، روشنی کا، Sound کا جو استعمال ہے وہ تھیٹر کے قریب ہے۔ خاموشی Decorum، Audience اور سنانے والوں کا Clear Separation یہ بھی تام جھام تھیٹر کے ہی ہیں اور اس کے بیشتر سنانے والے بھی تھیٹر کے ہی پس منظر سے ابھرے ہیں تو ان کے مظاہرے میں Acting یعنی اداکاری کے اوزار زیادہ ہیں بہ نسبت Nararation کے جوہر کم مگر ہاں امتزاج دونوں کا ہے اور یہ چیز شاید اسے اداکاری کے اور طریقوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ لوگ بیٹھ کے بھی خود کو، کبھی ایک دوسرے کو بھی سنانے والوں کو کچھ سناتے ہیں اور ایک دوسرے کو الگ الگ انداز سے مخاطب کرتے ہیں، کبھی کسی کو شامل کرتے ہیں، کبھی کسی کو خارج کرتے ہیں، اس طرح سامعین کا دائرہ لگاتار بدلتا رہتا ہے۔

اس فارم کو پکڑنے کے لیے یا اسے پختگی دینے کے لیے میں نے کچھ اور کہانیاں اسی زمین میں طرز دی ہیں۔ بنائیک سین کی گرفتاری پر احتجاج کے سلسلے میں طلسماتی علامتوں کے ذریعے ان کا احوال سنایا، امبریش ساتوک کی کتاب Perineum کے لیے گالیوں اور فحش محاوروں اور ترکیبوں سے انگریزی راج کی ایک Allegory اور تقسیم ہند کی ایک لمبی داستان نما روداد جو بہت مقبول ہوئی اور اس کتاب میں شامل ہے۔ گویا اس فارم کے ذریعے بالواسطہ اور بلاواسطہ طریقوں سے بہت کچھ، بلکہ سب کچھ کہا سنا جاسکتا ہے۔ سنانے والوں کی مہارت اور سننے والوں کے ذوق پر منحصر ہے کہ وہ اسے کہاں لے جاسکتے ہیں۔

میری تمنا ہے کہ اردو یا اردو آمیز زبان میں رام چرتر مانس لوگوں کو سناؤں، سنسکرت کے ناٹکوں کو واپس لے جاؤں، Homer کی Odyssey سناؤں، ہندی اردو کی تاریخ سناؤں، سیاست کی، ریاضت کی، سیاحت کی، فصاحت کی، رحمت کی، خلوت کی، سنتوں کی بانیاں، بیکٹ کے خود کلامی مکالمے، طاقت کی منہ زوریوں کی روداد ایسی ایسی چیزیں سناؤں کہ دلوں کے خرابے ہوں روشن۔ اللہ توفیق دے، بندہ بشر ہے، عاصی ہے۔

داستان گوئی

محمود فاروقی ، محمد کاظم

دانش حسین سے ایک مکالمہ

محمود الحسن

وہ بینک میں اچھی بھلی نوکری کر رہے تھے، مگر دل کو قرار نہ تھا، اور اس کی بے کلی دور نہ ہوتی، کچھ ایسا کرنا چاہتے، جس سے دل مضطر سنبھل جائے، لیکن کوئی راہ سجھائی نہ دیتی۔

خود پر بیتی کا احوال اجمالاً یوں سناتے ہیں "عجب سی بوریت زندگی سے ہونے لگی، کہ صاحب صبح دفتر جاؤ، شام کو واپس آجاؤ۔ پیسا کماؤ۔ کہنے کو آپ منیجر ہیں، گاڑی ہے، مرتبہ ہے، مگر صاحب زندگی میں لطف نہیں۔ وہ جو منٹو صاحب نے کہا ہے کہ دل کی بے کلی کسی طرح دور نہیں ہوتی تو اپنے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ معاملہ چل رہا تھا۔ جو بھی کرتے، جی کی بے کلی دور نہیں ہوتی تھی۔" اس کیفیت سے نکلنے کے لیے، اب انھوں نے ایسا مشغلہ ڈھونڈنا شروع کیا، جو طبیعت سے لگا کھاتا ہو۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں اداکاری میں تھوڑے بہت جوہر دکھائے تھے، جس کا لطف ذہن میں جما رہا، اس تاثر کے زیر اثر تھیٹر میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اس میدان میں کسی سے شناسائی نہ تھی کیونکہ تھیٹر کو کبھی فالو نہیں کیا تھا۔

ہاں البتہ تھیٹر ڈائریکٹر بیری جون کا نام سن رکھا تھا، ایک روز جی کڑا کر کے انھیں فون لگایا اور اداکار بننے کے ضمن میں اپنی تمنا سے آگاہ کیا۔ انھوں نے پوچھا "اداکاری کا تجربہ ہے" جواب نفی میں پا کر اس برطانوی تھیٹر ڈائریکٹر، جس نے 1969ء میں ہندوستان کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، نے دانش حسین سے کہا کہ وہ ان کے اسکول سے تین ماہ کا اداکاری کورس کریں۔ اس کہے پر انھوں نے صاد کیا۔ اب ہر شام نوکری سے فارغ ہو کر وہ رموز اداکاری سیکھنے پہنچ جاتے۔ کورس تمام ہونے پر بیری جون نے انھیں اب باہر جا کر کہیں آڈیشن دینے پر اکسایا، اس پر یہ آمادہ نہ ہوئے، اور ان سے عرض کی کہ وہ انہی کے تھیٹر گروپ سے منسلک ہونا چاہیں گے۔ بیری مان گئے اور تین ماہ بعد اپنے ایک ڈرامے کے لیے آڈیشن لینے کے بعد اس نوآموز کو اداکاری کا موقع دے دیا۔

یہ ڈراما "خاموش! عدالت جاری ہے" تھا، جس کو ممتاز ڈراما نگار وجے تنڈولکر نے لکھا تھا۔ دانش حسین نے اس ڈرامے میں پونکشے کا کردار نبھایا اور داد وصولی۔ مئی 1999ء میں انھوں نے اپنی پہلی پبلک پرفارمنس دی۔ وجے تنڈولکر کا یہ ڈراما ممتاز ادیب انتظار حسین کو اس قدر پسند آیا کہ اٹھارہ انیس برس ادھر انھوں نے اس کا ترجمہ کیا، جس کو ممتاز ادبی جریدے "آج" نے چھاپا اور لاہور میں ایک تھیٹر گروپ نے اسٹیج کیا۔ بیری جون کی ہدایت کاری میں ان کا دوسرا ڈراما "منٹو" تھا، جس کو کشور اہلووالیا (اب کشور ڈیسائی) نے تحریر کیا۔ دانش حسین نے بتایا کہ اس ڈرامے کے ایک ٹریک میں سعادت حسن منٹو کا زندگی نامہ چلتا رہا، دوسرے ٹریک میں منٹو کی کہانیاں۔ اس ڈرامے میں دانش حسین نے چار مختلف کردار ادا کیے۔ "اوپر، نیچے اور درمیان" میں وہ ڈاکٹر اور نواب بنے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا مرکزی کردار بھی نبھایا۔ تین برس بینک اور اداکاری کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا، اس لیے فی سال دو سے زیادہ ڈراموں میں کام نہ کر سکے۔ 2002ء میں آخر کار انھوں نے ساڑھے پانچ سال سے جاری بینک کی نوکری سے چھٹکارا لیا۔ اس فیصلے تک وہ کیونکر پہنچے، اس بابت بتاتے ہیں "اب مجھے تھیٹر میں مزا آنے لگا تو میں نے سوچ لیا کہ مجھے یہی کرنا ہے۔ جس کام میں آدمی کا جی لگتا ہو اسے وہی کرنا چاہیے۔ اس فیصلے پر کبھی کسی قسم کا پچھتاوا نہیں ہوا۔" پکی نوکری چھوڑنے پر گھر والوں نے مخالفت کی؟ "ہاں! والد تھوڑے خفا رہے۔ وہ ماہر معاشیات تھے۔ اکیڈمک آدمی تھے، اس لیے وہ کہنے لگے، لو اب میاں! بینک کی اچھی ملازمت چھوڑ کر اداکاری کریں گے، یہ بھی کوئی کام ہوا۔"

دہلی اسکول آف اکنامکس سے ایم اے اور دہلی یونیورسٹی کی فیکلٹی آف مینجمنٹ اسٹڈیز سے ایم بی اے کی ڈگری لینے والے دانش حسین کے تھیٹر سے جڑنے کا قصہ آپ نے جان لیا، اب ذرا موصوف کے داستان گو بننے کی کہانی بھی سنیے۔ تھیٹر کا رخ کرنے کی ہڑک تو انھیں خود ہی ہوئی، لیکن داستان گوئی کے خیمے میں انھیں میر باقر علی کی 1928ء میں وفات کے بعد سے مردہ فن داستان گوئی کے احیاء [1] کا بیڑا اٹھانے والے محمود فاروقی کھینچ کر لے گئے، جن کی نگاہ دوررس نے انھیں ایک ڈرامے میں کام کرتے دیکھ کر تاڑ لیا کہ وہ داستان سنانے میں ان کے ساتھی بن سکتے ہیں۔

محمود فاروقی سے اپنے تعلق کی بنا پڑنے کی بابت وہ بتاتے ہیں۔ "2005ء میں محمود نے مجھے ناٹک میں دیکھا۔ میں نے اسی فیسٹیول میں انھیں داستان گوئی کرتے دیکھا۔ باقاعدہ طور پر ہمیں حبیب تنویر صاحب نے ملوایا۔ ہمارے بہت سے مشترکہ جاننے والے تھے، ان کے ہاں بھی ملنا جلنا رہا۔ "تہلکہ" میں چھپا ان کا انٹرویو پسند آیا تو فون پر اس کی تعریف کر دی۔ اس موقع پر انھوں نے مجھے کہا کہ آپ میرے ساتھ داستان کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ بھئی! آپ بڑی اچھی پیشکش کر رہے ہیں لیکن میں اس قابل نہیں ہوں۔ وہ کہنے لگے، آپ مجھے

ملیں۔ بعدازاں کافی ہاؤس میں ہماری ملاقات ہوئی۔

میں نے ان سے کہا کہ داستان بڑا عمدہ آرٹ فارم ہے، مگر اتنے صفحے ثقیل اردو میں منہ زبانی سنانا میرے بس کا روگ نہیں۔ اس پر محمود بولے کہ نہیں، تم کرلو گے۔ میں نے جب دیکھا کہ انھیں مجھ پر زیادہ بھروسا ہے تو میں نے ہاں کردی۔ اس ملاقات کے 13 دن بعد پرفارمنس تھی۔ میں نے بڑی محنت کی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے ریہرسل کی۔ دہلی میں جب ہم دونوں نے پہلی بار پرفارم کیا تو اسے بے حد سراہا گیا۔ یوں ہم دونوں کے مل کر داستان سنانے کا سلسلہ شروع کیا، جو جاری ہے اور ہم دنیا بھر میں چار سو سے زیادہ بار پرفارم کر چکے ہیں۔"

اب جب کہ انھیں محمود فاروقی کے ساتھ داستان سناتے سناتے آٹھ برس ہونے کو ہیں، وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو وہ اس اعتبار سے اطمینان محسوس کرتے ہیں کہ اب انھیں شروع زمانے کی طرح ہر ایک کو داستان اور اپنے بارے میں کھول کر بتانا نہیں پڑتا۔ "ان کے بقول" داستان کا فن اتنا دب اور مر چکا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں جانتا نہیں تھا۔ شروع کے برسوں میں بڑی دقت رہی، پہلے سب کو بتانا پڑتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم کون ہیں۔ داستان کی روایت کیا ہے۔ ہر پرفارمنس سے قبل ہیں منٹ تعارف میں لگتے۔ اب سات سال بعد ممبئی اور دہلی میں داستان نہ اپنے بارے میں بتانا پڑتا ہے۔ ایک آڈئنس بن گئی ہے۔ بیس پچیس شو دیکھنے والے کئی لوگ ہو گئے ہیں، اس لیے داستان سے حظ اٹھانا ان کے لیے زیادہ سہل ہو گیا ہے۔"

آپ جس انداز میں داستان سناتے ہیں، دیکھ کر لگتا ہے جیسے اس فن سے آپ کو فطری مناسبت ہو تو کوئی ایسی خاص چیز جو داستان گوئی کے سلسلے میں خاص طور پر آپ کے لیے معاون رہی ہو؟ "ہم مرثیہ گویوں کو دیکھ دیکھ کر پلے بڑھے۔ استاد ان مرثیہ، میر انیس اور دبیر کو جس انداز میں پڑھتے، اسے سن کر متاثر ہوتے کہ صاحب کیا کمال فن ہیں۔ ان کے انداز بیان میں بڑی لطافت اور چاشنی ہوتی، لیکن مذہبی فارم بننے سے مرثیہ کا دائرہ سکڑ گیا اور یہ کوئی سیکولر چیز نہیں رہی، اب جو شیعہ ہے، اسے مرثیہ سن کر لطف مل رہا ہے لیکن جو اس سے کٹا ہے، اسے دل چسپی نہیں۔ داستان میں ایسا معاملہ نہیں۔ محمود کو داستان کرتے سنا تو لگا کہ یہ بالکل سیکولر چیز ہے۔ مرثیہ کو آپ عوامی سطح پر سیکولر انداز میں نہیں کر سکتے۔ داستان سیکولر بھی ہے اور مرثیہ کی طرح سے جہاں مرضی کر سکتے ہیں، سڑک پر ہو سکتی ہے اور آڈیٹوریم میں بھی اور مرثیہ کی طرح سے ہائی آرٹ اور ہائی لٹریچر اور ہائی پرفارمنس بھی ہے۔ اس لیے بھی داستان پڑھنے میں کشش محسوس ہوئی۔"

طلسم ہوش ربا جو داستان امیر حمزہ کا ایک دفتر ہے، اس سے داستان کے سفر نو کا آغاز کیا، اب بیچ بیچ میں دوسری چیزیں بھی آپ پیش کر رہے ہیں، مثلاً لاہور میں اس وقت آپ نے وجے دیان دی تھا کی داستان سنائی اور منٹو کا زندگی نامہ بہ انداز داستان، "منٹویات" کے نام سے پیش کیا۔ اس سے کہیں آپ داستان کے مرکز سے

کٹ تو نہیں رہے؟" ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز ایک دوسرے کو فیڈ کر رہی ہے۔ مثلاً کسی آدمی کو منٹو والی داستان پسند آئی تو اسے طلسم ہوش ربا دیکھنے کا تجسس ہوا، پھر اس نے سوچا چلو فیض صاحب والی داستان سنتے ہیں۔ کہنے کا مطلب ہے ہر چیز دوسرے کو فیڈ کر رہی ہے۔ ہماری زبانی طلسم ہوش ربا سن کر لوگوں کو پتا چلا کہ یہ کہانیاں انگریزی میں چل رہی ہیں تو وہ شہباز اعجاز الدین اور مشرف فاروقی نے جو طلسم ہوش ربا کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو پہلے ان تراجم کو پڑھ چکے ہیں، انھیں جب پتا چلتا ہے کہ یہ کہانیاں کوئی سنا بھی رہا ہے تو وہ داستان سننے آتے ہیں، اس لیے یہ تمام چیزیں مل کر داستان کو عام کر رہی ہیں۔"

وہ افراد جو داستان گوئی کے بارے تنقیدی جائزہ لے سکیں ان کے نہ ہونے کو وہ بڑا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں طلسم ہوش ربا کی ادبی قدر و قیمت سے جو آگاہ ہیں وہ پرفارمنس نہیں کرتے، جبکہ ہمارے فن کو وہی صحیح معنوں میں پرکھ سکتا ہے، جو طلسم ہوش ربا کی ادبی اہمیت اور داستان گوئی کی باریکیوں کو سمجھتا ہو، اس لیے ابھی ہمارے کام کا ٹھیک ٹھیک تنقیدی جائزہ نہیں لیا جا سکا۔

لاہور میں محمود فاروقی اور دانش حسین جب بھی داستان سنائیں میلہ لوٹ لیتے ہیں۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے داستان سننے آتے ہیں، اور ہمہ تن گوش ہو کر ان سے داستان سنتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر افراد ان محفلوں میں کھاتے پیتے گھرانوں کے دکھائی دیتے ہیں، جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ شاید داستان ابھی صرف طبقہ اشرافیہ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ دانش حسین اس تاثر کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، ہر طبقہ میں داستان گوئی یکساں طور پر مقبول ہے، اور ہندوستان میں سڑک پر بھی انھوں نے داستان سنائی ہے۔ ان کے خیال میں داستان گوئی کی پذیرائی ان کی توقعات سے بڑھ کر ہوئی ہے۔ داستان گوئی کے قافلے میں مزید لوگ شامل ہوئے ہیں اور مستقبل میں اور بھی لوگ اس طرف آئیں گے۔ اس بار محمود فاروقی اور دانش حسین کے ساتھ لاہور میں ان کے دو نوجوان ساتھیوں منو سکندر اور ندیم شاہ نے بھی داستان سنائی۔

ہندوستان کے علاوہ وہ پاکستان، امریکا، دبئی اور سری لنکا میں بھی اپنے فن کا جادو جگا چکے ہیں۔ کہتے ہیں، داستان سنانے کا زیادہ لطف تو ادھر ہی آتا ہے، جہاں زبان سمجھنے والے ہوں۔ مستقبل میں ان کا ارادہ اپنی تہذیب سے متعلق بڑے لوگوں کا زندگی نامہ بصورت داستان سنانے کا ہے، ایسے ناموں میں کبیر کا نام سرفہرست ہے۔ داستان سناتے سناتے کا ہے کہیں بھول جانا ان کے خیال میں زیادہ بڑا مسئلہ نہیں۔ "ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے، اور ہم اس کو سنبھال لیتے ہیں۔" داستان گوئی کی جو تاریخ رہی ہے، اس میں اکیلا آدمی ہی داستان سناتا، مگر اس کا احیاء اس طرح سے ہوا کہ دو آدمی داستان سنا رہے ہیں، اس بابت وہ بتاتے ہیں کہ یہ اختراع محمود فاروقی کے ذہن رسا کی ہے، جنھوں نے شمس الرحمان فاروقی کی تحریک پر داستان گوئی کا آغاز کیا۔

انھوں نے ایسا کیوں کیا، اس کا جواب محمود فاروقی کی زبانی ہی سنیے۔ "موجودہ دور کے سامعین کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچا کہ دو آدمی مل جائیں تو ان کے لیے تھوڑا آسان ہو جائے گا۔ اس سے ہمارا کام تھوڑا انٹرایکٹو ہو جائے گا، تھوڑا تھیٹر ہو جائے گا۔ دوسرے پڑھنے والے کی سکت کا بھی خیال تھا مثلاً ہماری سکت میر باقر علی کی طرح سے نہیں ہے کہ گھنٹوں بولتے رہیں اور سانس نہ ٹوٹے۔ اس لیے پڑھنے والے اور سامعین دونوں کے حق میں یہ بہتر تھا کہ دو آدمی مل کر داستان سنائیں۔"

داستان گوئی پر حبیب تنویر، نصیر الدین شاہ اور شمس الرحمان فاروقی جیسے بڑے لوگوں سے، جنھیں وہ اپنا استاد سمجھتے ہیں، داد ملنا انھیں سرشار کر گیا۔ سامعین کی طرف سے تعریفی کلمات بھی خوش کن لگتے لیکن وہ اسے اپنے اوپر سوار نہیں کرتے۔

دانش حسین نے داستان گوئی شروع کرنے کے بعد اپنی آواز بہتر بنانے کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ اداکار ہونے سے بھی انھیں داستان سنانے میں مدد ملی۔ گھر میں علمی ماحول کی وجہ سے تلفظ کے معاملے میں انھیں پریشانی نہیں رہی۔ شمس الرحمان فاروقی کے سامنے داستان پڑھتے، انھیں اب بھی پسینے آجاتے ہیں، جو اگر یہ کچھ غلط پڑھ دیں تو ان کے منہ سے فوراً ہوں ہوں کی آواز نکلتی ہے، جس کے بعد وہ کہتے ہیں بھئی! ایسے نہیں ہے۔ نصیر الدین شاہ کے ساتھ انھوں نے مل کر داستان گوئی بھی کی اور فلم "پیپلی لائیو" میں کام بھی کیا۔ کہتے ہیں کہ نصیر صاحب کے ساتھ رہ کر ہمیشہ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ داستان کی باعث وہ پانچ چھے برس تھیٹر سے دور رہے مگر اب وہ دونوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رواں برس انھوں نے ہوش ربا رپیرٹری کے نام سے تھیٹر کمپنی قائم کی، اور دہلی میں شاہ پور جاٹ کے علاقے میں اسٹوڈیو بنایا ہے۔

اپنی تھیٹر کمپنی کے پلیٹ فارم سے سموئیل بیکٹ کا ڈراما 'Tape Last s' Krapp' اور ایرالیوس کے ڈرامے CoffeeChinese کو اسٹیج کر چکے ہے۔ دونوں ڈراموں میں ہدایت کاری کے ساتھ اداکار کی حیثیت سے بھی انھوں نے کام کیا۔ ان دنوں وہ بین الاقوامی اور ہندوستانی ڈراما نگاروں کو خوب لگ کر پڑھ رہے ہیں، تاکہ اور بھی ڈرامے اپنی تھیٹر کمپنی کے ذریعے سامنے لاسکیں۔ وہ دو فلموں "دھوبی گھاٹ" اور "پیپلی لائیو" میں اداکاری بھی کر چکے ہیں۔ تھیٹر اور فلم کے میڈیم میں اداکاری کا تجربہ کس طرح سے مختلف ہے، اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا "تھیٹر میں آپ کو آڈینس تک پہنچنا ہوتا ہے، اور خود کو than larger life بن کر پراجیکٹ کرنا ہوتا ہے۔ فلم میں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ کیمرہ آپ تک پہنچ رہا ہے۔

فلم میں اداکاری ایسے ہے، جیسے میں آپ سے قریب بیٹھے بات کر رہا ہوں، اسٹیج میں اداکاری اس طرح سے ہے، جیسے دور بیٹھے کسی شخص سے بات کر رہا ہوں، یعنی مجھے ان تک پہنچنا ہے، جو مجھ سے دور ہیں۔ فلم میں مجھے

بہت سی چیزیں نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ کیمرہ اپنے آپ نمایاں کر دیتا ہے۔ہم اداکار ہیں، اس لیے تمام میڈیم پسند ہیں لیکن فلم میں صرف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے مقبولیت ملے۔کیوں کہ اگر سو لوگ مجھے سڑک پر نہیں پہچان رہے مگر شمس الرحمان فاروقی ،نصیر الدین شاہ اور امجد اسلام امجد مجھے پہچان رہے ہیں تو میرے لیے زیادہ معنے رکھنے والی بات ہے۔" اب کچھ تذکرہ ان کی ذاتی زندگی کا۔دانش حسین نے 1971ء میں یوپی کے ضلع غازی پور میں آنکھ کھولی۔ تعلیمی مدارج دہلی میں رہ کر طے کیے۔ان کے والد سید وصی الحسن ماہر معاشیات تھے۔

والدہ پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی دہلی یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کی سربراہ ہیں۔ دانش حسین کے بقول "شخصیت آس پاس کے لوگوں اور ماحول سے تشکیل پاتی ہے۔ایکسپوژر سے بنتی ہے۔آنکھ کھولی تو اردگرد بڑے لوگ گھوم رہے تھے،اس لیے ایسا نہیں ہوا کہ ہم کسی کے رعب میں آ کر دب جائیں۔اس سے پروفیشنل زندگی میں ہمیں بہت فائدہ ہوا،ہم اپنے کام پر جیتے ہیں۔کام ہمارا پکا ہوتا ہے۔ٹھوک بجا کر ہوتا ہے۔کام میں کوئی نقص ہے تو ہمیں بتایا جائے،ہم اس پر بات کریں گے۔" 1996ء میں ان کی شادی ہوئی،جو ارینج تھی۔ان کی ایک بیٹی ہے،جو ہائی اسکول میں پڑھتی ہے۔

ضیا محی الدین کا نام وہ بڑے ادب اور احترام سے لیتے ہیں۔کہتے ہیں کہ جس زمانے میں اردو پڑھنے کے معاملے میں ہاتھ تنگ تھا،اس زمانے میں ضیا محی الدین کی بدولت کئی اردو ادیبوں کی نگارشات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ان کے پڑھنے کا انداز ہمیشہ متاثر کن لگا۔لاہور میں وہ خاص طور سے ضیا محی الدین کی حال ہی میں چھپنے والی یادداشتوں 'Carrot a is Carrot A' کی تلاش میں رہے۔دوسرے وہ افضال احمد سید کی "مٹی کی کان" ڈھونڈتے رہے۔وہ داستان سنانے پہلی بار پاکستان آئے تو ان کے سامعین میں ممتاز سیاست دان اعتزاز احسن بھی شامل تھے۔کچھ عرصہ قبل ہندوستان میں انھیں دیکھ کر اعتزاز احسن نے پہچان لیا،جو ان کے لیے حیرت کا موجب بنا۔

کرکٹ سے انھیں کسی زمانے میں خاصا لگاؤ رہا مگر اب مصروفیات کی وجہ سے وہ میچ دیکھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال پاتے۔پاکستانی کھلاڑیوں میں ظہیر عباس ان کے فیورٹ رہے،بھارتی بلے بازوں میں لکشمن انھیں پسند ہیں۔دانش حسین کے رشتے دار لاہور اور کراچی دونوں جگہ قیام پذیر ہیں۔وہ دونوں شہروں میں داستان سنا چکے ہیں۔لاہور میں یہ ان کا چوتھا پھیرا تھا۔ادھر آنا اور پرفارم کرنا انھیں اچھا لگتا ہے۔وہ عدم برداشت اور تعصب کو انسانی معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔

تعریف جو ہے وہ لمحات کی چیز ہے۔اس لمحہ کا لطف اٹھایا اور نکل لیے۔اس کو آپ باندھ کر نہ رکھیں۔یہ چیز

ایک خاص وقت کے لیے ہے۔اب اگر میں اگلی بار خراب کروں گا تو پھر کیا سابقہ تعریف مجھے بچالے گی؟ تعریف وقتی بات ہے،اس کو سینے سے لگا کر نہیں رکھا جاسکتا۔مشہور ہونا سب کو اچھا لگتا ہے۔یہ بات انسانی فطرت میں ہے مگر فطرت الگ چیز ہے،فطرت کو عادت بنالینا غلط ہے۔تعریف پر اور داد پر خوشی ہوتی ہے لیکن داد کو نشہ بنالیں تو کام بگڑ جاتا ہے کیونکہ جو داد ملتی ہے وہ خاص پرفارمنس کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس کو ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔تنقید بھی کان دھر کر سننا چاہیے،کیونکہ ہر انسان اپنے بارے میں ایک رائے اور نظریہ قائم کرلیتا ہے۔دوسروں کی آراء سے کام کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔پی آر کے ذریعے زندہ نہیں رہا جاسکتا۔کام ہی آپ کو زندہ رکھتا ہے۔محمد حسین جاہ مر گئے تھے سو سال بعد پھر زندہ ہو گئے۔خسرو اور بلھے شاہ آج کے زمانے میں بھی زندہ ہے۔کتنے لوگ تھے،جن کا میڈیا میں ایک خاص زمانے میں تذکرہ رہا آج کوئی انھیں جانتا نہیں۔ہمیشگی اور بقا کا معاملہ آدمی کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔

حبیب تنویر سے بھلا کیا سیکھا

حبیب تنویر صاحب سے میرا تعارف اس طرح ہوا کہ میں جس بینک میں منیجر تھا،اس میں ان کا کھاتہ تھا۔وہ بڑی شرافت سے آتے اور چھڑی لے کر کھڑے ہو جاتے،میں انھیں دیکھتے ہی فوراً بھاگ کر جاتا اور اپنے کیبن میں لے آتا۔خیریت دریافت کرتا اور چائے وغیرہ پلاتا۔بینک میں کسی کی ڈیوٹی لگاتا کہ حبیب صاحب جو چاہتے ہیں،بغیر تردد کے سب ہو جائے۔وہ مجھ سے بڑے خوش تھے۔2004ء میں کسی نے میرا تعارف ان سے یہ کہہ کر کرایا کہ یہ لڑکا نیا نیا تھیٹر میں آیا ہے،جب ان سے بات چیت کا سلسلہ تھوڑا چل نکلا تو میں نے انھیں یاد دلایا کہ میں وہی لڑکا ہوں،جس کی بینک میں ان سے ملاقات رہتی تھی۔انھوں نے مجھے پہچان لیا اور بڑی محبت اور اپنائیت سے ملے۔

ان کے معروف ڈرامے''آگرہ بازار''میں کئی رول کئے۔حبیب صاحب مجھے''آگرہ بازار''کی انجن کہتے تھے،کوئی اداکار موجود نہ آسکتا تو اس کا کردار میں کرتا۔ان کی زندگی میں''آگرہ بازار''کا آخری پلنگ والا میں تھا۔میں نے تھیٹر کی باقاعدہ تربیت نہیں لی بلکہ کام کرکے سیکھا ہے۔بیری جون میرے استاد ہیں،ان سے بہت سیکھا اور بھی لوگوں سے سیکھا۔حبیب تنویر صاحب سے تھیٹر کے بارے میں بہت جانا۔حبیب صاحب بڑے زیرک اور حسب حال کام کرتے تھے۔وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ڈراما شروع ہونے سے اگر آدھ گھنٹہ قبل بھی انھیں پتا چلا کہ فلاں اداکار نہیں آسکا،فلاں نے بغاوت کردی،فلاں سامان نہیں پہنچا،تو وہ گھبراتے نہیں تھے،کوئی بات انھیں ڈرا نہیں سکتی تھی کہ صاحب آج ناٹک نہیں ہو پائے گا۔ہر چیز کا توڑ ان کے پاس تھا۔کچھ ہو جائے ناٹک رکتا نہیں تھا اور وقت پر ہوتا۔

یہ بات میں نے ان سے سیکھی اور جب خود ڈائریکٹر بنا یا داستان گوئی شروع کی تو اس کو اپنے کام کے سلسلے میں لاگو کیا۔ حبیب صاحب سے اداکاری کے بارے میں بہت سیکھا۔ مکالمے کی ادائیگی کیسے ہوتی ہے۔ اسکرپٹ کی باریکیاں کیا ہوتی ہیں، یہ بھی انھی سے پتا چلیں۔ وہ اسکرپٹ کا جو کلچرل کانٹکسٹ ہوتا، وہ ایسے بتاتے کہ ذہن میں ہمیشہ کے لیے بیٹھ جاتا۔ یعنی اسکرپٹ کا جو فوری معنی ہے، نہ صرف وہ آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ اس کا آگا پیچھا بھی جان رہے ہیں۔ اسکرپٹ پر اداکار کو اتھارٹی ہونا چاہیے۔ اسکرپٹ خود میں رواں ہونا چاہیے، پھر وہ اداکاری میں رچ کر نکلتا ہے۔ ایسے میں اگر آپ ذرا سے گردن بھی موڑیں گے تو وہ ادا بن جائے گی۔ سطحی اداکار اور منجھے اداکار کا فرق بھی یہیں سے واضح ہوتا ہے۔ آواز کا اتار چڑھاؤ اپنی جگہ مگر یہ سب چیزیں Cosmatic نظر آتی ہیں، اسکرپٹ کو سمجھے بغیر، اسے اپنے اندر اتارے بغیر کام کرنے سے کھوکھلا پن کہیں نہ کہیں ظاہر ہو جاتا ہے۔

منٹو کی بے باکی نے بہت متاثر کیا

منٹو سے ان کا پہلا تعارف 1999ء میں ہوا، جب انھوں نے ڈراما "منٹو" میں کام کیا، اس وقت انھوں نے منٹو کو انگریزی میں پڑھا۔ 2012ء میں منٹو سال کی مناسبت سے محمود فاروقی اور انھوں نے منٹو کی داستان دہلی میں بھی سنائی اور پاکستان میں بھی دو مختلف مقامات پر منٹویات کے عنوان سے اس ممتاز افسانہ نگار کی زندگی کا افسانہ سنایا۔ لاہور میں وہ خاص طور پر منٹو کا گھر دیکھنے لکشمی مینشن گئے، جہاں منٹو کی بیٹیوں سے ان کی ملاقات رہی۔

منٹو کا گھر دیکھنا ان کے لیے بڑا زبردست تجربہ رہا۔ بعد ازاں انھوں نے منٹو کی قبر پر حاضری دی۔ منٹو کے بارے میں بہ انداز داستان محمود فاروقی اور دانش حسین نے ایسے پڑھا، کہ جیتا جاگتا منٹو سامنے آگیا۔ منٹو کے خاندان کے بھی افراد نے ان کی پرفارمنس کو شاندار لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا۔ منٹو کی شخصیت کے جس پہلو نے دانش حسین کو سب سے بڑھ کر متاثر کیا، وہ ان کا بے باک پن ہے۔ ان کے خیال میں "وہ جیسے تھے، ویسا ہی دکھنا چاہتے تھے، شخصیت میں کھلا ڈلا پن اور تصنع نام کو نہیں تھا۔ یعنی ظاہر اور باطن میں تضاد نہیں تھا۔ کہانی کار بہت بڑے تھے، اس لیے لوگ انھیں کبھی بھولے نہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔"

روزنامہ ایکسپریس، لاہور

داستان تقسیم ہند کی

دانش حسین

خواتین و حضرات کئی برس پہلے کی بات ہے اس برصغیر ہندوستان جنت نشان میں ایک سوراخ پیدا ہوا۔ وہ بڑھ کے ایک شگاف بنا۔ وہ شگاف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، حتیٰ کہ خلیج بن گیا۔ خلیج بڑھتی چلی گئی اور خلیج کو پر کرنے کے لیے انسانوں کی بلی مانگی گئی۔ پہلے ایک انسان گیا اس میں، پھر دو، پھر دس اور سو، پھر ہزار، دس ہزار، یہاں تک کہ دس لاکھ لوگ اس خلیج میں دفن ہو گئے۔ دس لاکھ مرد، عورت، بوڑھے، بچے جب اپنی آہوتی دے چکے تب جا کر وہ خلیج پر ہوئی۔ اس کے اوپر ایک سرحد بنی، سرحد کے اس پار ایک ملک بنا، اس پار دوسرا ملک بنا، دونوں ملکوں نے آزادی پائی، آزادی کے جشن منائے گئی، پر ان دس لاکھ انسانوں، جن کی قربانی نے دونوں ملکوں کو حیات بخشی، انھیں بھلا دیا، اس کی کوئی یادگار، کوئی نشانی، نہ سرحد کے پار بنی، نہ اس پار، نہ سرحد کے اوپر بنی۔ تو ہماری یہ پیش کش ایک نذرانہ عقیدت ہے ان لاکھوں گمنام لوگوں کے نام:

(ایک داستان گو پہلے ہی جا کر بیٹھ جاتا ہے)

پہلا داستان گو: ارے صاحب آپ تو پہلے ہی وہاں جا کر بیٹھ گئے، میرا انتظار کر لیتے۔

دوسرا داستان گو: ارے صاحب داستان کا آغاز ہونے جا رہا ہے اب نہیں بیٹھوں گا تو کب بیٹھوں گا؟

پہلا داستان گو: پر صاحب جب دو آدمی مل کر ساتے ہیں تو اس کا ایک طریقہ ہوتا ہے، ایک قاعدہ ہوتا ہے، یہ تھوڑے ہی کہ دوسرے کو نظر انداز کر کے خود جا کر دھم سے بیٹھ جائے۔ خیر آپ سے یہ سب کہنا فضول ہے۔ آپ کی سمجھ کے باہر ہے۔

دوسرا داستان گو: نہیں، ادب اور تہذیب کے ٹھیکے دار تو آپ ہیں۔ آپ جیسے ترقی پسند

لوگوں کی وجہ سے صوبہ صوبہ نسل عام کی بات ہو رہی ہے۔

پہلا داستان گو: یہ دیکھیے، ایک تو آپ ویسے ہی دو تہائی ہیں، غنڈہ گردی آپ دکھائیں اور جب حالات بگڑ جائیں تو سب فساد کی جڑ مجھے بتائیں۔

دوسرا داستان گو: سنیے حضور ہم زبان دے چکے ہیں، اور یہاں ایسے مہذب لوگوں کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ورنہ آپ کہیں ہماری جھنڈے والان والی گلی میں آ جاتے تو آپ کے پرخچے اڑا دیتے۔

پہلا داستان گو: دیکھ رہے ہیں حضور، یہاں اتنے سیکولر لوگ جمع ہیں اور یہ اس طرح مجھے مارنے پیٹنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ بند کیجیے آکاش میں نعرے اچھالنا، یہ جنگ ہے اس جنگ میں طاقت لگایے۔

دوسرا داستان گو: اجی ان کے بھروسے بیٹھے بیٹھے ساٹھ سال ہو گئے، تم کو اب تک عقل نہیں آئی۔

پہلا داستان گو: مجھے نہیں رہنا آپ کے ساتھ، بس بہت ہوا یہ رہا آپ کا حصہ، یہ رہا میرا حصہ۔ خدارا ادھر کا رخ نہ کیجیے گا۔ نہ ادھر کی ہوا میں سانس لیجیے گا۔

دوسرا داستان گو: سن لیجیے میاں، اس چوکی کا بٹوارا نہیں ہو سکتا۔ یہی چوکی اکھنڈ ہے۔

پہلا داستان گو: حاضرین! دیکھ رہے ہیں آپ، ابھی سے یہ حال ہے ہمارا آگے کیا ہوگا۔ خدارا کسی انگریز کو بلایے کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر آئے اور اڑ کر ہمارے بیچ ایک سرحد کا تعین کرے ورنہ یہ تو مجھے کھا جانے پر تلے ہیں۔

دوسرا داستان گو: میاں انگریز گئے، اب یہاں رہنا ہے تو ہم لوگوں کی روش اختیار کیجیے۔ اب ٹائیں ٹائیں کرنا بند کیجیے یہ رہا کٹورا، یہ رہا پاندان میں حصہ اور داستان شروع کیجیے۔

تو حاضرین ایک اور اجنبیت کا احساس حقیقت بھی ہے اور تصور بھی ہے۔ اکٹھا ہو کر بھی الگ رہا جا سکتا ہے اور الگ ہونے پر بھی ساتھ ساتھ اور اسی ایکا اور اجنبیت کے بیچ کی مبین دراڑ ہے بٹوارا۔ مگر ملکوں کی تقسیم میں، لوگوں کی تقسیم مضمر ہے۔ یعنی ان کے مکان کی، جائیداد کی، زر کی، مال و اسباب کی، تہذیب کی، تاریخ کی، ادب کی، زبان کی، روح کی، جان کی اور ان کے زمین و آسمان کی۔

تو حاضرین پیش ہے داستان پر امن جدو جہد کی

قربانی کی اور تاریخ راہوں پر مارے جانے کی

تو گلگونہ کشان عارض شاد بیان اس طرح فرماتے ہیں کہ جب برصغیر ہندوستان جنت نشان کی سرزمین پر بٹوارے اور تقسیموں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے پاک بدن کے روئیں روئیں نے مچلنا شروع کیا۔ بعض روئیں پھڑکنے لگے، بعض دہکنے لگے، کچھ دائیں طرف اور کچھ بائیں طرف گئے اور ایک لٹ بیچ میں سیدھی کھڑی رہ گئی۔ تو اس سیدھی کھڑی لٹ کے جو اوپر کے روئیں تھے وہ نیچے جانے کے مشتاق تھے، اور جو نیچے کے روئیں تھے وہ اوپر جانے کو بیتاب تھے۔ اشتیاق اور بیتابی، بیتابی اور اشتیاق کا یہ سلسلہ جب دیر تک چلتا رہا اور وہ سارے روئیں آپس میں گڈمڈ ہو گئے تو وہ وقت تھا آدھی رات کا۔ حاضرین یہ اسی آدھی رات کی گھڑی تھی جب ایک عظیم رہنما اپنی ملک کی قسمت کا عہد و پیمان کر رہا تھا۔ قدرت کے ساتھ کے اسی شہر دلی کے ایک کونے سے یہ صدا آئی:

بلے بلے جواہر لال\
تو نے کر دیا بڑا کمال\
تجھے سو سو بیس دے رہا\
ہر پنجابی لال\
کہ جو لٹ پٹ کر آیا ہے\
ساتھ میں کچھ نہیں لایا ہے\
دریاؤں پانی چیر چار\
تو نے کر دیا بڑا کمال\
دھرتی پاڑ پنجاب کی\
ہمیں دے دیا ایک رومال\
کس کر کے\
اس کر کے\
چاہے حصے ہو جائیں\
چاہے مر کھپ جائیں\
کس کر کے

بس کر کے

آزادی خون چاہتی ہے

تبھی رو رنگ لاتی ہے

تیرے چہرے کا کمال

للے للے جواہر لال

اب عرض کریں ہم ملک

لاکھوں حال بے حال

سنبھالو راز اپنا

سنبھالو دیش اپنا

سنبھالو فوج اپنی

سنبھالو مہر اپنی

للے للے جواہر لال

تو نے کر دیا بڑا کمال

للے للے جواہر لال

تو حاضرین جب ملک کے بٹوارے کی بات شروع ہوئی تو ساتھ شروع ہوئی فکر سرکاری اسباب اور آسمان کے تقسیم کی۔ تو ایک سرکاری محکمہ تھا، محکمہ غذا وزراعت۔ یعنی Ministory of Food & Agriculture اور اس کی کل میراث تھی۔

80 بڑا صاحب کی کرسیاں،

80 بڑا صاحب کی میزیں،

800 کلرکوں کی کرسیاں، 120 ٹائپ رائٹرز، 50 الماریاں، 10 تجوریاں، 22 گھڑیاں، 130 دواتیں، 4 صوفے، 15 سائیکلیں، 29 پاخانے اور بندروں کو بھگانے کے لیے نوکر رکھے گئے 4 لنگور۔

تو حاضرین جب تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تو پتہ چلا کہ 150 کرسیاں ٹوٹی پڑی ہیں، 30 ٹائپ رائٹرز خراب ہیں، 7 تجوریوں میں زنگ لگا ہے، 18 گھڑیاں بند ہیں، 10 سائیکلیں پنکچر ہیں، 3 صوفہ سیٹوں میں سوراخ ہیں، 2 لنگور فرار ہیں اور 8 پاخانے ایسے ہیں کی پیخانہ بھی وہاں جانے سے ناک سکوڑے اور یہ سارا سامان دو حصّس

سرکاروں کے بیچ تقسیم ہونا تھا۔

تو حاضرین حساب کچھ یوں لگا کہ چار ٹوٹی کرسی میزوں کے عوض ایک سائیکل، 6 گھڑیوں کا عوض 2 ٹائپ رائٹرز اور ایک صوفہ سیٹ کے عوض ایک تجوری۔ باقی بچ گئے وائسرائے کے دیے ہوئے تین سرٹیفکیٹ، ایک تمغہ اور تین اینگلوانڈین کلرک، جنھیں ان خراب بیگانوں کے پاس چھوڑ دیا گیا اور غالباً وہ آج بھی وہیں موجود ہیں۔

پر حضور یہ سب تو فروعی باتیں ہیں اصل مسئلہ تو اس عمارت کا تھا جسے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کے لیے ایک شہنشاہ نے جمنا کنارے بنوایا تھا۔ یاروں کا دعویٰ تھا کہ وہ ادھر کی امانت ہے اور وہ اسے اینٹ در اینٹ، مینار در مینار، قبر در قبر کھود کر لے جائیں گے اور از سر نو اسے کھڑا کریں گے اور یہی نہیں، اس پر طرہ یہ کہ جمنا ندی کے کنارے کا وہ ٹکڑا بھی لے جائیں گے جس پر وہ عمارت آباد تھی۔

اس پر عیاروں نے کہا کہ یار تاج محل تو ہم تم کو دے دیں پر پہلے سندھو ندی کا رخ ادھر کرو کہ جس کے کنارے بیٹھ کر ہمارے بزرگوں نے وید جیسی مقدس عظیم کتابیں لکھی۔

حاضرین بڑے افسوس کی بات ہے کہ تاج تو اپنی جگہ ٹس سے مس نہیں ہوا اور نہ ہی سندھو ندی نے اپنا رخ بدلا۔ پر اس طرف ایک ندی بہتی تھی جس کا نام تھا پدما ندی۔ پدما ندی نے بڑی مشکلیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہوا یوں کہ ادھر کا ایک حصہ اس طرف رہ گیا اور اس حصے اور ادھر کے بیچ کی سرحد تھی پاندی۔ اب پدما ندی پر ہر سال جوبن چڑھتا۔ وہ اٹھکیلیاں مارتی کبھی اس طرف ہلکوریں لیتی، تو کبھی اس طرف۔ جب وہ ادھر پچھاڑیں مارتی تو ادھر کے کچھ گاؤں ادھر چلے جاتے اور جب وہ ادھر لہریں مارتی تو ادھر کے گاؤں ادھر آ جاتے۔ ادھر ادھر کے اس گھال میل سے بڑی دشواریاں پیدا ہوئیں۔ یہاں کے وزیر اعظم اور وہاں کے صدر نے پدما ندی کو لاکھ لالچ بھیجے، فرمان جاری کیے، باندھ بنائے پر پدما ندی سلیقہ نہ سیکھ سکی کی ایک اچھی سرحد بننے کی۔

اجی حضور پدما کی اٹھکیلیوں کی چھوڑیے اور ذرا ادھر توجہ دیجیے۔

"کرمو ہے چھیڑو نہ چھیڑو نند لال......"

"بند کیجیے یہ بکواس۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ کچھ اسلامی چیز ہے تو سنائیے؟"

"بھیا موسیقی میں کیسا اسلامی، غیر اسلامی؟"

"کمال کرتے ہیں آپ! جب ملک اسلامی ہو سکتا ہے تو موسیقی میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟"

"اسلامی موسیقی کا کیا مطلب؟"

سیدھی سی بات ہے۔ قوالی اور غزل اسلامی ہیں۔ ٹھمری اور دادرا غیر اسلامی، خیال اسلامی ہے، دھرپد غیر

اسلامی۔ ہارمونیم اسلامی ہے، تانپورا غیر اسلامی۔ آپ جسے کہتے ہیں الاپ وہ ہے الآپ اور ادم اوں کی جگہ علی۔ اب جتنا چاہیے گا یہ بجایئے۔"

"بھیا میری گردن بخشئے، میں چلا۔ خدا حافظ۔"

مسلمانی، ہندووانی، غیر اسلامی کی یہ آویزش کئی دہائیوں سے جاری تھی اور اس کے نرغے میں بڑے بڑے سورما تک آ چکے تھے۔

"جوش صاحب کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بعد آپ کی آنے والی نسلوں پر کیا گزرے گی؟ جوش صاحب آپ کے بچے اردو بھول جائیں گے۔ وہ آپ کے کلام کا ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے۔ آپ کیا یہ عظیم، لسانی اور تہذیبی بربادی منظور کیجیے گا؟"

بربادی شرط ہے آبادی کی اور بسنا ضد ہے اجڑنے کی۔ تو ہوا یوں کہ گنگا کنارے غازی پور کے ایک گاؤں میں کچھ سورماؤں نے یہ طے کیا کہ جب تک وہ اپنے گاؤں سے ملیچھوں کو کھدیڑ باہر نہیں کریں گے تب تک چین کی سانس نہیں لیں گے۔

"کا بھیا کدنوں کی کچھ خبر و بر ہے کہ نا؟" "ہم تو انھیں بہت سمجھائے رہے کہ کا کرے او ہر جات ہو؟ پر او ہماری بات نہ مانن۔"

"بیکارے سمجھائیو۔ ارے آج کل ہم لوگ لڑکن کی باپ نہیں ہیں، لڑکن ہم لوگن کے باپ ہو گئے ہیں۔ ہم کہے کہ اے بیر کا کرے ادھر جات ہو تو بپھر کے کہن: ہیاں مسلمانوں کی ترقی کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ اب گئے ہیں ادھر تو اپنے بی بی بچن کو بھی لے جائیں۔"

"کا ہوا ای پاکستان بنا رہا ہندو مسلمانوں کے الگ کرنے کے واسطے نا تو ہم تو ایہاں دیکھ رہے ہیں کہ بھائی بھائی سے، میاں بیوی سے، باپ بیٹے سے الگ ہو رہا ہے۔ اب کدن ہوا ں چلے گئے تو مسلمان ہیں اور ہم ایہاں ہیں تو ہم کا خدا نہ خواستہ ہندو ہو گئے؟"

"کا میاں جواب دیو؟"

"ای کا جواب دیں گے؟" ان کے جناح میاں تو کھدے ہی ہاتھ جھاڑ جھوڑ کے چل دیہن، ای اچھی رہی۔ پاکستان بنے واسطے اوٹ اوٹ دیہن ہاں کے مسلمان اور جب بن گیا تو جنوا کہن کہ ہیاں کے مسلمان جائیں چولہے بھاڑ میں۔"

"بتاؤ!"

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں......
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

اماں کون سا اجالا داغ داغ ہو گیا۔ یہ آپ کے ساتھ بڑا مسئلہ ہے جب ہم اپنے قوم کی تعمیر کا جشن مناتے ہیں آپ شروع ہو جاتے ہیں اپنا ماتم لے کر۔ ارے ہوئی تھی مارکاٹ پر دو نئے ملک بھی تو بنے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے، آج ہمارے پاس ایک کے بجائے تین ملک ہیں، تین جھنڈے ہیں، تین قومیں ہیں، تین نیوکلیائی ذخیرے ہیں، 17-16 سرحدیں ہیں، تین فوجیں ہیں، 19-18 بغاوتیں ہیں، تین ٹیمیں ہیں اور 150 کروڑ لوگوں کے بیچ ایک اولمپک گولڈ میڈل ہیں؟ اور آپ وہاں رہ بھی جاتے تو کیا ملتا آپ کو؟ مائنارٹی کمیشن کی چیئرمینی؟ اُمی شناخت کے بحران میں آپ ساٹھ سال پہلے بھی جتلا تھے اور آج بھی وہیں کے وہیں ہیں؟

شناخت؟ اماں جہاں قوموں کا وجود ختم ہو رہا تھا وہاں شناخت کی کیا حیثیت ہے۔ جب یہ اجالا ہو رہا تھا اس وقت راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں میں 6 سالہ جیت نے دیکھا کہ اس کے گاؤں کو حملہ آوروں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ حملہ آوروں نے پہلے مال کی گہار کی اور پھر جان کے بدلے مذہب بدلنے کی مانگ کی۔ جیت کی پریوار میں 10 بزرگ اور 11 بچے تھے، جیت کے 6 بھائی اور 5 بہنیں۔ جیت کی ماں نے اس کے دو مہینے کے بھائی کی دہائی دیتے ہوئے جیت کے باپ سے کہا: حملہ آوروں کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟ مذہب بدل لو۔"

جیت کے باپ نے کہا: ہرگز نہیں ہم جان دے دیں گے پر نہ ہی مذہب بدلیں گے اور نہ ہی اپنی عورتوں کی آن دیں گے۔ سچے پادشاہ کا پاٹھ کر کے جیت کے باپ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں اور چار بہنوں کو شہید کیا۔ کرپان کا ایک وار جیت کے سر پر بھی لگا۔ جیت کی جب آنکھ کھلی تو اس نے آپ کو ایک ٹرین میں پایا۔ پہلے تو اپنے آس پاس کے لوگوں کو دیکھ کر وہ سمجھی کہ اس کے گھر والے ہیں پر وہ لاشیں بھی اجنبی نکلی۔ کسی طرح وہ اپنے اپ کو گھسیٹ کر اس طرف لے گئی جدھر کچھ جسم حرکت کر رہے تھے پیاس کا شدید غلبہ تھا۔ کسی طرح کچھ پانی فراہم ہوا۔ پر ابھی پانی کی بوند گلے میں نیچے اتاری بھی نہیں تھی کہ ٹرین جھٹکے کے ایک جگہ رکی، پلیٹ فارم پر دونوں طرف فوجیوں کی قطاریں تھیں اور دور سے ڈھول تاشے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید شرناتھیوں کا کوئی جتھا آنے والا تھا۔ جتھا آیا تو کسی پر لاشوں کا۔ گاؤں والوں نے اپنے کندھوں سے لاشیں اتار کر ٹرین میں ٹھونستے ہوئے کہا:

یاراں ساڈے پنڈ سے 200 لوگ کم ہو گئے ہیں۔

سوہرڈے سے 10-10 آدمی نیچے اتر آئے۔

پشاور ایکسپریس اپنا سفر یوں ہی طے کرتی رہی۔ اسٹیشن در اسٹیشن ملاقاتیوں کا جتھا ایسے ہی آتا رہا۔ آخر کار جب ٹرین امرتسر پہنچی تو 6 سالہ جیت کے علاوہ اس ٹرین میں کوئی ایسا نہ بچا تھا کہ جو جے ہند کہہ سکے۔ مسافروں کے استقبال کے لیے جو ملاقاتی وہاں آئے تھے ان میں سے کلونت سنگھ سے پہلے ٹرین میں کود کر چڑھا اور ڈبہ ڈبہ جھانکتا ہوا وہاں پہنچا جہاں جیت تھی۔ اس نے لپک کر جیت کو اپنی گود میں اٹھایا۔ اس کے خشک آنسوؤں کو اپنی آستین سے پونچھا اور کہا: فکر نہ کر پتر۔ سچے بادشاہ کی پکارسی تو پورا کریں گے۔ ہم نے بھی ایک ٹرین بھر کر ابھی ادھر بھیجی ہیں۔

صورت حال کا معائنہ کرنے جب ایک امریکی رپورٹر اسٹیشن پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ جہاں ٹرین سے گھسیٹ کر لاشیں ڈالی جا رہی تھیں وہیں اوپر ایک سائن بورڈ پر یہ عبارت لکھی تھی۔

شکایت کی کتاب اسٹیشن ماسٹر کے پاس موجود ہے، جس مسافروں کو راستے میں کوئی تکلیف پہنچی ہو فوراً رجوع کریں:

میں کس سے انتقام لوں
یہ سچ ہے بیکسوں کے خوں سے
سرخ ہو گئی زمیں
مصیبتوں کی داستاں میں سن چکا ہوں ہم نشیں
میں سن چکا ہوں کس طرح بزرگ ناتواں بھی
بلکتے شیر خوار بھی فسردہ نوجوان بھی
ازل کے گھاٹ
ایک ایک کر کے سب اتر گئے
میں سن چکا ہوں ہم نشیں
یہ داستانیں دل خراش
مگر کسے دوش دوں
میں کس سے انتقام لوں

فرمایا بزرگوں نے: قوم کی عزت، خاندان کی عزت ہے۔ خاندان کا پاس اس کی ناموس ہے۔ ماں نہ ہوتی تو بیٹا نہ ہوتا، جوانہ ہوتی تو نسل نہ ہوتی۔ بس ثابت ہوا کہ وہ فرد جسے عورت کہتے ہیں پوری قوم کی ذات ہے، اس کا اصل ہے، اس کا جزو خاص

تو جب سن سینتالیس کا رن پڑا، تو اس جنگ کا سب سے بڑا سرمایہ اسی صنف نازک کی ذات تھی اور اس جنگ کا سب سے بڑا ہتھیار بھی عورت کی ہی ہستی ہے۔

تو حاضرین جب ان دونوں نئے ملکوں کے رہنما اپنی اپنی گدیوں پر بیٹھے، پنڈتوں نے ہون کیے، مولویوں نے فال نکالے اور چوہدریوں کی چوہدراہٹ بھڑ کنے لگی تو ان نئے ملکوں کے رہنماؤں کو خیال آیا کہ ادھر کا کچھ مال ادھر اور ادھر کا کچھ مال ادھر رہ گیا ہے۔

تو پاگلوں کے ساتھ ساتھ اغوا شدہ عورتوں کے تبادلے کا بھی خیال پنپا اور نئے نئے منصوبے پنپے۔ تو وہ فریقین جو نہ صرف اپنی فوجوں کے ساتھ بلکہ اپنے لوگوں کے ساتھ بھی جنگ میں مصروف تھے۔ انھوں نے اتنی صلح ضروری سمجھی کہ اس سنگین موضوع پر ایک معاہدہ قائم کریں۔ تو ایک قرار نامہ تیار ہوا کہ کوئی حصہ دوسرے کی امانت میں خیانت نہیں کرے گا اور جس کا جو اصل ہے وہ دوسرے کو لوٹایا جائے گا۔ رہا سوال سود کا تو اسے یتیم خانے بھیج دیا جائے گا تو فوجیں دوڑائی گئیں، کیمپ بٹھائی گئیں اور کھیتوں میں، رن کے ڈیروں میں، کھلیانوں میں، نئے سرے سے عورتوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ بچھڑی، بھٹکی، عورتیں جب پکڑی گئیں تو ان کی اصل آزمائش تب شروع ہوئی جب وہ دوبارہ اپنے اپنوں کے پاس پہنچیں۔ پاکی ناپاکی کے امتحان لیے گئے، آگ میں چڑھنے اور اترنے، چڑھنے اور اترنے کے ان سلسلوں کو نیا رنگ تب چڑھا جب یہ ظاہر ہوا کہ بہت سی عورتیں اس لیے ناپید ہیں کہ اب وہ جہاں ہیں وہاں خوش ہیں۔

اختر کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی تھی جب اس کے شہر پر آفت آئی اور گھر کے گھر جلائے گئے تو باپ، بھائی اور بیٹے کا غم لیے وہ اس ٹرین میں سوار ہوئی جو ادھر جا رہی تھی۔ راستے میں، جیسا کہ ہوتا تھا، پرمیشور سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اسے ٹرین سے گھسیٹ کر اتار لیا۔ جب اختر 29 ویں بار کچل چکی تو نہ جانے کیوں پرمیشور کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے اپنی پگڑی کھول کر اس کے جسم پر ڈال دی۔ اس ایک لمحے کے لیے اختر پرمیشور کی اتنی شکر گزار ہوئی کہ اس نے اپنی ساری زندگی اس کے اوپر نچھاور کر دی۔

اختر اور پرمیشور اس کے گاؤں میں رہنے لگے۔ اختر کو سردارنی بننا منظور تھا، پرمیشور کی دوسری بی بی بننا منظور تھا پر نہیں منظور تھا تو دوبارہ اجڑنا۔ پر تاریخوں کے انقلاب میں اختر اور اختریاں نقار خانے کی طوطی کی طرح ہوتی ہیں۔ لاکھ چھپنے چھپانے پر بھی اختر کی نشان دہی ہو ہی گئی۔ 21 ہزار ایک سو پانچ اغوا شدہ عورتوں میں اختر محض ایک ہندسہ تھی۔ ایک گنتی خواہش، احساس اور خودی سے یکسر معصوم:

گزری ہیں جتنی صلیبیں میرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے

ہر ایک وصل خداوند کی امنگ لیے
گزری ہیں کتنی صلیبیں میرے دریچے میں

ممبئی میں کانگریس ہاؤس اور جناح ہال کے پشت پر ایک پیشاب گاہ ہے جسے "موتری" کہتے ہیں۔ ایک بار اسے مجبوراً اسے موتری میں جانا پڑا۔ ناک پر رومال رکھ کر جب وہ بدبو اور تعفن کے اس گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ دیوار پر کسی نے سفید چاک سے یہ عبارت لکھ دی تھی کہ مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا۔ دونوں ملک غلام رہے پر موتری آزاد ہی تھی۔ ایک بار پھر وہ اس موتری میں داخل ہوا پیشاب کرنے کے لیے تو اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا کے نیچے کسی نے کوئلے سے لکھ دیا تھا۔

"ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا۔"

دونوں ملک آزاد ہوئے پر موتری پر بدبو کا قبضہ ویسے ہی برقرار رہا۔

تیسری بار پھر سے موتری میں جانا پڑا پر پیشاب کرنے کے لیے نہیں۔ اس بار اس نے دیکھا کہ "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا اور ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا۔" کہ الفاظ مدھم پڑ گئے تھے اور ان کے نیچے کسی نے موٹی کھردری پنسل سے یہ عبارت لکھ دی تھی۔

"دونوں کی ماں کا ہندوستان مارا۔"

ابھی چند برس پہلے لاہور کے پانڈو نگر کے ایک مکان سے خطوں کا ایک پلندہ ملا۔ وہ سارے خط ایک ہی شخص نے لکھے تھے اور ایک ہی پتے سے آئے تھے۔ کتاب گھر، گیٹ مائی ہیرا، جالندھر، پنجاب۔

دسمبر 30، 1947ء

مکان نمبر: 32

پانڈو اسٹریٹ کرشنا نگر، لاہور کے رہنے والوں کے نام۔

جناب عالی!

یہ خط میں آپ کو اس امید پر لکھ رہا ہوں کہ آپ یہ خیال نہ کریں گے کہ ہندو آپ کو خط لکھ رہا ہے بلکہ ایک انسان ہونے کے ناتے میری درخواست پر غور فرمائیں گے۔

میں جب آخری دفعہ 17 ستمبر کو اپنے مکان 32 پانڈو اسٹریٹ کرشنا نگر میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ میرا مکان کسی اور کے نام ہو گیا ہے۔ میرے مکان کی، بلکہ اس مکان کی جو اب آپ کا ہے، بیٹھک کی الماری کے پاس ایک لوہے کا صندوق پڑا ہے جس میں میرے کچھ بہت اہم کاغذات ہیں۔ میری بیوی کی اور میری بینک کی پاس بک، گھر کی رجسٹری اور بیمہ کمپنیوں کی رسیدیں۔

میں یہاں بے گھر اور بے سہارا ہوں۔ اگر آپ مہربانی کر کے وہ کاغذات مجھ تک ارسال کر دیں تو میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔"

مفلس و ناچار

آپ کا خیر اندیش

ہر کشن داس بیدی

............☆☆☆☆............

9 فروری 1948ء

میرے محترم اور رفیق محمد لطیف صاحب!

آپ کی ارسال کردہ رجسٹری مجھے ملی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرا مکان ایک ایسے شخص کو الاٹ ہوا ہے جو صحیح معنوں میں ایک مکمل انسان ہے۔

لطیف صاحب میں آپ کے کام کے سلسلے میں اوتر کے ڈاک خانے گیا تھا۔ وہاں کا سب پوسٹ ماسٹر ایک سکھ ہے کہ جو پاکستان سے آیا ہے اور اس میں شرافت نام کی بھی نہیں ہے۔ میں نے جیسے ہی آپ کے نام کا ذکر کیا تو اس نے تو میرے بات سننے سے ہی انکار کر دیا۔ ان حالات میں میں مجبور ہو گیا اور واپس لوٹ آیا۔

لطیف صاحب مجھے امید تھی کہ گاندھی جی کی کوشش رنگ لائے گی اور ہم ایک دن پھر اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔ پر ایک کمینے اور رذیل انسان نے اس امن کے دیوتا کو ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا اور امید کی وہ آخری شمع بھی اب خاموش ہے۔

حاضرین! یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہر حال ہر کشن داس بیدی اور عبداللطیف خوش قسمت تھے کہ دونوں پنجابی تھے۔ نہ کوئی ہندو، سکھ پاکستانی پنجاب میں بچا اور نہ ہی کوئی مسلمان ہندی مشرقی پنجاب میں۔ پر ابھی سندھی ہندو باقی تھے، ابھی بلوچی ہندو باقی تھے، ابھی پشاوری اور افغانی سردار باقی تھے اور باقی تھے کروڑوں ہندوستانی مسلمان۔

تو حاضرین کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کہانی سنانا، یہ تو ناممکن ہے۔ یہ صرف جناح صاحب کے بس میں تھا۔ تو ہم سناتے ہیں داستان دلی کے اجڑنے کی:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستان مخدوم دہلوی کی

مخدوم دہلوی صاحب کا خاندان پرانی دلی کے پل بنگش علاقے میں رہتا تھا۔ پرانی دلی کے قدیم حکیموں کا خاندان، حکیم اجمل خاں کی روایتوں پر پوری طرح قائم جمیعۃ العلماء اور کانگریس پارٹی کا حمایتی، مسلم لیگ کا سخت مخالف۔ بٹوارے کے کچھ دنوں بعد جب لٹے پٹے برباد شرنارتھی اشتعال میں آ کے شہر میں حملہ کرنے لگے تو پہاڑ گنج قرول باغ اور صدر بازار میں رہنے والے ان کے خاندان اور جان پہچان کے سینکڑوں لوگوں نے آخران کے گھر میں پناہ لی۔ پورا محلہ مسلمانوں کا تھا، پھاٹک حبش خانہ برابر میں تھا۔ کانگریس کے اعلیٰ لیڈروں سے ربط ضبط تھا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ پولیس کا پہرہ تھا یہ اطمینان مزید تسکین میں بدل گیا جب محلے کو Muslim Zone قرار دے دیا گیا۔ مخدوم صاحب بیگم انیس قدوائی کے ساتھ مل کر شرنارتھی کیمپوں میں پناہ گزینوں کی خدمت کرنے میں مصروف تھے۔ جامع مسجد میں اور ہمایوں کے مقبرے میں ہزاروں کی تعداد میں بے گھر مسلمان بھی جمع ہو گئے تھے، مخدوم صاحب کے بہنوئی مہاجر دہلوی انگریز سرکار کے بڑے افسر پاکستان کے حمایتی ادھر جانے والوں کو دیکھ ریکھ میں لگے ہوئے تھے۔ 15 ستمبر کی رات کو مخدوم صاحب گھر ہی تھے کہ حملہ شروع ہو گیا۔ زور زور سے نعروں اور چیخوں کی آواز آئی۔ آن کی ان میں پورا محلہ زد میں آ گیا۔ شرنارتھیوں کے ساتھ حملہ کرنے والوں میں پولیس کے دستے پیش پیش تھے۔ نادرشاہی غلبے سے جو گھر کسی طرح محفوظ رہ گیا تھا اور سن ستاون کا غدر بھی جس کا بال نہ بانکا کر سکا تھا وہ دھو دھو کر جل گیا۔

ان کا پورا خاندان گھر سے نکل پڑا۔ پل بنگش سے پرانے قلعے تک کا سفر۔ چند میلوں کا فاصلہ اور کئی صدیوں کا قہر۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے کیمپ میں خاندان کا آدھا حصہ ہی پہنچ سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ہزار سے اوپر دلی والے کیمپ میں امڑ آئے۔ تو جناب:

ہاتھ میں بیڑی منہ میں پان
لڑ کے لیں گے پاکستان

کا نعرہ لگاتا دہلوی مسلمان جب گھر سے نکلا تو پہنچا پرانے قلعے کے کیمپ میں۔ جو قائم کیا گیا تھا ان مسلمان افسروں کے لیے جو پاکستان جانا چاہتے تھے، پر کیمپ میں کون لیگی کون کانگریسی، کون زمیندار، کون مصاحب۔ یہاں تو سب مسلمان تھے جنھوں نے بٹوارہ کرایا تھا اور جن کی وجہ سے یہ عظیم قتل عام برپا ہوا۔

کیمپ کی ذمے داری پاکستان سرکار کی تھی۔ 50,000 لوگوں کے بیچ پانی کا ایک نل، برسات کا مہینہ اور پرانے قلعے کی اجڑی فصیلیں۔ حالات یہاں تک کہ پہنچے کہ پاکستانی سرکار نے کیمپ سے ہاتھ دھو لیا اور دلی سرکار سے کہا کہ وہ کیمپ کی ذمے داری سنبھالیں۔ دلی سرکار کے اعلیٰ افسر کمشنر جی۔ ڈی کھوسلا جب پرانے قلعے کے کیمپ

معائنے کے لیے پہنچے تو کیمپ کے لوگوں نے جھلا کر ان سے کہا:

ایسے حالات میں رہنے سے تو بہتر ہم پاکستان چلے جائیں۔

اس دورے کے بعد کمشنر جی۔ڈی۔کھوشلا نے باپو کو یہ رپورٹ دی:

"پرانے قلعے کے مسلمان اس ملک میں نہیں رہنا چاہتے۔ میں جب ان سے ملنے گیا تو انھوں نے صاف کہا کہ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتے، پاکستان جانا چاہتے ہیں اور یہ دیکھ کر میرا دل بھر آتا ہے کہ ہمارے اپنے لوگ بے گھر اور بے سروسامان ہے۔ بتایے باپو میں کیا کروں؟

باپو: پر جب میں وہاں جاتا ہوں تب تو وہ یہ نہیں کہتے کہ انھیں پاکستان جانا ہے۔ وہ بھی ہمارے ہی لوگ ہیں۔ آپ انھیں کیمپ سے واپس لایے اور ان کی حفاظت کیجیے۔

پر کیمپ سے واپس لانا ممکن نہیں تھا کیونکہ ان کے گھروں پر شرنارتھیوں کا قبضہ ہو چکا تھا جیسا سردار پٹیل نے عرض کیا کہ اگر مسلمان یہاں سے نکلیں گے نہیں تو ادھر سے آرہے شرنارتھی کہاں جائیں گے۔

اب سوال یہ تھا کہ دلی کا مسلمان جائے تو جائے کہاں۔ ہندوستانی مسلمان کے نام پر بنا پاکستان پر، اتنی جگہ تو وہاں تھی نہیں کہ سب وہاں سما سکیں۔ جناح صاحب سے جب پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اسے یہ سوچ کر قناعت کرنی چاہیے کہ اس نے پاکستان کے لیے قربانی دی۔ 15 ستمبر 1947ء کو جب دلی کے مسلمانوں کا ایک وفد ان سے ملا تو انھوں نے فرمایا کہ "آپ کے سامنے دو راستے ہیں یا تو ہندوستانی سرکار سے اپنے حق کا مطالبہ کیجیے یا جنگ چھیڑ دیجیے۔"

شہر میں مارکاٹ جاری تھی۔ گھروں کو لوٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پاکستان جانے والی ٹرین ابھی بند تھی اور اوپر سے آ گیا پاکستان کے وزیر اعظم کا بیان۔

مجھ سے کہا گیا کہ دلی اور یوپی کے سارے مسلمان پاکستان آنا چاہتے ہیں اور پاکستان سرکار کو اس کا انتظام کرنا چاہیے تو میں یہ صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ حالانکہ پاکستان مسلمانوں کو پناہ دینے کے لیے تیار ہے پر ہم یہ نہیں چاہتے کہ مشرقی پنجاب کے علاوہ کہیں اور کا مسلمان اپنا وطن اور جائیداد چھوڑ کر پاکستان آیا۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی حفاظت ہندسرکار کی ذمے داری ہے اور وہ اپنا فرض پورا کریں۔ اگر بھارت سرکار اپنی ڈیوٹی پوری کرے تو کوئی یوپی دلی کا مسلمان یہاں نہیں آئے گا۔ اسے ضرورت ہی نہیں محسوس ہوگی۔ ملک کی تقسیم اس اصول پر ہوئی تھی کہ اقلیتیں اپنے اپنے علاقے میں رہیں گی اور سرکاریں اپنے ہر شہری کو اس کا حق دے گی اس کی حفاظت کرے گی۔

کیمپ میں حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ خاندان کے باقی افراد کا کچھ پتہ نہیں چل پا رہا تھا۔ بہن

اور بہنوئی تو غالباً پاکستان چلے گئے تھے۔ حالانکہ خبر پکی نہیں تھی۔ پر مسئلہ یہ تھا کہ مخدوم کا چھوٹا بھائی، ماں کا چہیتا بالکل لاپتہ تھا۔ والد ماجد اپنے سارے کانگریسی دوستوں کے گھر ہو گئے تھے پر نہ ہی رفیع صاحب، نہ مولانا نے کچھ مدد کی اور حد تو یہ ہے کہ پنڈت جی بھی کچھ کرنے سے قاصر تھے اور کرتے بھی کیسے۔ ان کے اپنے گھروں میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان پناہ گزیں جمع تھے۔

میں فراق میں بے حال تھی۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، نہانے دھونے اور پکانے کی پریشانی اس وقت کم لگنے لگی جب کیمپ میں ہیضے کی وبا کا شدید غلبہ ہوا۔

جب شہر میں کچھ امن ہوا اور پاکستان جانے کی ٹرینیں تیار تھیں تو اس وقت آیا مولانا آزاد کا جامعہ مسجد سے ایک تاریخی خطبہ:

> ''تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی...... پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے......
> عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تک چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے...... میں کہتا ہوں جو اجالے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اسی کے لیے ہیں، اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔''

کہا جاتا ہے کہ اس خطبے کے بعد ہزاروں بندھے ہوئے بستر کھل گئے۔ تو پرانی دلی کا یہ اعلیٰ نژاد خاندان اجڑنے کے بعد دوبارہ بسنے کی راہ پر گامزن تھا۔ آسرا ملا تو ایک پرانے وفادار نوکر، جانکی پرساد کے سرکاری کوارٹر میں جس کو ان کے باپ نے اپنے رسوخ سے محکمۂ زراعت میں نوکری لگوائی تھی اور دو دن بعد ہی خط آیا:

''بہن اور بہنوئی کراچی میں خیریت سے ہیں، خوش حال ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ کھن دہلوی، یعنی چھوٹے بھائی، ماں کی آنکھ کے تارے، خستہ حال، بیمار کسی طرح ادھر آ پہنچے ہیں۔ حالات خراب اور شدت

سے تمھیں اور والدہ کو یہاں کر رہے ہیں۔ یہاں آ کر انھیں لوا جاؤ۔ ماں نے بستر پکڑ لیا اور ضد ٹھان لی کہ کمن کا
چہرہ دیکھ لوں تو چین سے مروں۔"

ناچار ہندی مزاج ہندی نژاد، ہند پرست حضرت مخدوم دہلوی پاکستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جے پور،
اجمیر، جیسلمیر ہوتے ہوئے کھوکھراپار پہنچے۔ عامی آدمی کا سفر تھا، انگریزوں کی اولاد تو تھے نہیں کہ اڑ کے ادھر
جاتے۔

کراچی پہنچے تو وہاں عجیب ہی منظر پایا۔ ہر طرف سندھی، مہاجر، پنجابی مگر پاکستانی ندارد۔
پاکستان میں انڈین مسلمان اس بات پر پریشان ہیں کہ پاکستان میں نہ ان کا کوئی استقبال ہوا، نہ ان کے
لیے کوئی انتظام اور پاکستان اس بات پر ہراساں کی اگر سارے مسلمان یہاں آ گئے تو پاکستان کیسے چلے گا۔ بہنوئی
کو اس بات کی پریشانی کہ کانگریسی رشتے داران کی سرکار میں ساکھ خراب نہ کریں۔
ادھر دلی کے فساد کچھ اس وقت تھے جب نوا کھلی میں "ایکلا چلو رے" نعرے کا مرہم دلی میں بھی کارگر
ثابت ہوا۔
باپو کی دلی میں آمد ہوئی اور انھوں نے شروع کیا ورت اس مانگ کے ساتھ کہ قتل و غارت کم ہو اور
مسلمانوں کو واپس ان کے گھروں میں پہنچایا جائے۔

مگر باپو کا یہ ورت کال نوالہ ثابت ہوا اور 30 جنوری 1948ء کو باپو شہید کر دیے گئے:

خدا را نہ بولو یہ منحوس بولی
بھلا کون مارے گا باپو کو گولی
زمیں ایسی باتوں سے تھرا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

یہ شہادت گویا پورے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر ہوش میں لے آئی۔
یکا یک پورے برصغیر میں امن چھا گیا۔ گویا سب کے سب کسی قربانی کا انتظار کر رہے تھے۔
جب امن دوبارہ قائم ہوا تو بہت سے حیرت انگیز واقعے ہوئے۔ مارچ، اپریل 1948ء میں پاکستان سے
دو سے تین ہزار مسلمان ہر روز اپنے گھروں کو ہندوستان لوٹنے لگے۔
اب شروع ہوا پاکستان سے الٹی ہجرت کا سفر۔ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں مسلمان پاکستان سے ہندوستان
واپس آ رہے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو صرف جان کی امان کے لیے، آسرے اور شرن کے لیے پاکستان بھاگے
تھے اور وہ بھی تھے جن کی امیدوں اور خوابوں کا پاکستان چکنا چور ہو چکا تھا۔

چند مہینوں کے اندر اندر چار لاکھ کے قریب مسلمان پاکستان سے واپس آ گئے۔ دلی کے حکمرانوں کو یہ خدشہ پیدا ہوا:

"افواہیں گرم ہیں کہ جون کے آخر میں کچھ فساد ہوں گے۔ پاکستان سے واپس آ رہے مسلمانوں کی کثیر تعداد خالی گھروں میں بسنا چاہتی ہے۔ جب کہ شرنارتھیوں کو امید تھی کہ یہ مکان انھیں لاٹ کیے جائیں گے اس لیے وہ افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو ڈرانا چاہتے ہیں اور یہ نام نہاد مسلم زون جو تنی پاکستان ہیں، منی پاکستان ہونے کے علاوہ کچھ نہیں۔ لوگ بہت غصہ ہیں۔ عام شکایت یہ بھی کہ اگر ہم سیکولر ملک بنانا چاہتے ہیں تو یہ فرق کیسا اور یہ بٹوارہ کیوں کر۔"

خطرے کی گونج بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بابو راجندر پرساد نے پنڈت نہرو کو خط لکھا:

"اگر ایسے ہی 30-40 ہزار مسلمان ہر مہینے واپس آتے رہے اور ہندوستانی شہری بننے کا مطالبہ کرتے رہے تو بہت دشواریاں کھڑی ہو جائیں گی۔"

نتیجتاً 14 جولائی 1948ء کو ہندوستانی سرکار نے ایک طرفہ طور پر شروع کیا پرمٹ سسٹم۔ یہ خاص طور سے مسلمانوں کے ہندوستان واپس کو روکنے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ اس بات پر جب پنڈت نہرو نے اسمبلی میں یہ سوال اٹھایا: یہ باپو کو دیے ہوئے وچن کی وعدہ خلافی ہے۔

تو سردار پٹیل کا جواب تھا: دلی میں پچھلے کچھ مہینے سے مکمل امن چین ہے۔ جو لوگ اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے وہ آ چکے ہیں جو نہیں لوٹے ہیں انھیں پاکستانی قرار دینا چاہیے۔ وچن سے واپس پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تو اب شروع ہوا پرمٹ کا گڑبڑ جھالا:

بیگم ہیں ہند میں تو میاں سندھ میں مقیم
دونوں کو ہیں فراق کے شکوے نصیب سے
کیا قہر ہے کہ ان کی ملاقات کے لیے
پرمٹ ہے شرط، وہ بھی ملے گا رقیب سے

میاں بیوی، باپ بیٹے، بھائی بہن کے بیچ آیا کاغذ یعنی پرمٹ۔ جو ہندو یا سکھ یہاں آنا چاہتے تھے ان کے لیے الگ پرمٹ تھا اور جو مسلمان ہمیشہ کے لیے واپس آنا چاہتے تھے ان کے لیے الگ۔

پانچ الگ طرح کے پرمٹ نکالے گئے۔

پہلا: ان مسلمانوں کے لیے جو ہندوستان واپس آ کر ہمیشہ کے لیے بسنا چاہتے تھے۔

دوسرا: ان مسلمانوں کے لیے جو ہندوستان Temporary Visitry پر آنا چاہتے تھے۔

تیسرا: ان مسلمانوں کے لیے جو مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان جانا چاہتے تھے۔ یعنی Transit Permit۔

چوتھا: خاص تاجروں اور سرکاری افسروں کے لیے پرمٹ۔

پانچواں: ان ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کے لیے پرمٹ جو ہندوستان آ کر بسنا چاہتے تھے۔

فوراً اس کے جواب میں پاکستانی سرکار نے مسلمانوں کی آمد کو روکنے کے لیے اپنی طرف سے پرمٹ لگایا۔

تو حاضرین ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے بنا پاکستان اور پاکستان کی سب سے بڑی دشواری بنا ہندوستانی مسلمان۔

حاضرین ہم یہ نہیں جانتے کہ مخدوم دہلوی اور ان کے مفرور بھائی کھمن مرزا کو ہندوستان سے واپس لوٹنے کے لیے پرمٹ ملا یا نہیں پر ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ لکھنؤ کے رہنے والے حوالدار غلام علی لمب فنڑ کے ساتھ کیا ہوا۔

داستان حوالدار غلام علی لمب فنڑ کی

سن 47ء کے بٹوارے کے وقت سرکاری افسروں اور فوجیوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ دونئی سرکاروں میں سے کسی ایک کو چن لیں۔ تو راولپنڈی کے قریب چکلہ میں پوسٹڈ لکھنؤ کے حوالدار غلام علی کہ جو خاص سرکاری اعزاز پر برطانیہ سے لمب فنڑ کی ٹریننگ لے کر آئے تھے۔ انھوں نے انڈین آرمی جوائن کرنے کی خواہش ظاہر کی، اسی وقت راولپنڈی میں نسلی فسادات شروع ہو گئے اور انھیں مجبوراً وقتی طور پر پاکستانی آرمی میں ڈرافٹ کر لیا گیا۔ دو تین برس کے بعد ایک جونیئر پاکستانی افسر نے ان کی فائل دیکھی کہ وہ انڈین آرمی جوائن کرنے کے خواہش مند تھے۔ انھیں فوراً نوکری سے برطرف کر کے ہندوستانی شہری قرار دے کر ہندوستان ڈی پورٹ کر دیا گیا۔

کھوکھراپار بارڈر کے اس طرف جب وہ پہنچے تو پرمٹ نہ ہونے کی وجہ سے انڈین گورنمنٹ نے انھیں گرفتار کیا اور جیل میں ڈال دیا۔ سال بھر کے بعد انھیں پاکستانی شہری قرار دے کر واپس پاکستان ڈی پورٹ کر دیا۔ جب وہ پاکستان پہنچے تو انھوں نے پاکستانی شہریت کے لیے عرضی ڈالی۔ عرضی نامنظور ہوئی۔ بات عدالت تک پہنچی اور ان پر مقدمہ چلا۔ ایک طویل یعنی سات برس کے عرصے کے بعد مقدمہ خارج ہوا۔ ان کو ہندوستانی شہری قرار دیا گیا مگر مقدمے کا فیصلہ سناتے وقت جج صاحب نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ انھوں نے کہا: حالانکہ حوالدار غلام علی کا کیس خارج کر دیا گیا ہے مگر جب وہ یہاں پاکستان لوٹ کر آئے تھے تو پاکستانی آرمی نے ان کو فوج میں نوکری کی پیش کش کی تھی۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ وہ خاص سرکاری اعزاز پر برطانیہ سے لمب فنڑ کی ٹریننگ لے کر آئے ہیں۔ وہ نوکری کریں گے تو صرف اور صرف لمب فنڑ کی پوسٹ پر۔ چوں کہ پاکستانی

آرمی میں لب فنڑی کوئی پوسٹ نہ تھی اور نئی پوسٹ سینکشن کروانے میں کئی برس گزر جاتے اس لیے پاکستانی آرمی انھیں یہ پوسٹ دینے میں معذور تھی۔

اب جب مقدمہ خارج ہو گیا تو غلام علی نے کہیں سے رشوت دے کر ایک پاکستانی پاسپورٹ حاصل کیا اور اس کی بنا پر لکھنؤ ہندوستان پہنچے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے اتر پردیش گورنمنٹ میں ہندوستانی شہریت کی عرضی داخل کی۔ یو پی سرکار سال بھر ان کی عرضی لیے بیٹھی رہی اور سال بھر کے بعد انھیں پاکستانی شہری قرار دے کر واپس پاکستان ڈی پورٹ کر دیا۔

اب کی بار اب وہ پاکستان پہنچے تو پاکستانی سرکار نے ان کو لاہور کے ایک ہندو شرنارتھی کیمپ میں ڈالا۔ وہاں کیمپ میں بیٹھ کر غلام علی حوالدار نے اب شروع کی عرضیوں کی بوچھاڑ انڈین ہائی کمیشن کو، انڈین فارن منسٹری کو، ہندوستانی سرکار کو، یو پی گورنمنٹ کو، یونائیٹڈ نیشن کو اور ہر عرضی میں ان کا یہی اصرار ہوتا تھا کہ انھیں خاص سرکاری اعزاز پر برطانیہ لب فنگ کی ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا تو انھیں لب فنڑی کی پوسٹ پر باعزت و توقیر بحال کیا جائے۔

تو حاضرین: اب شروع ہوتا ہے فائلوں کا گزبڑ جھالا۔ حولدار غلام علی کی فائل انڈین ہائی کمیشن سے فارن منسٹری، فارن منسٹری سے ہوم منسٹری، ہوم منسٹری سے ڈیفنس منسٹری، ڈیفنس منسٹری سے واپس ہوم منسٹری، ہوم منسٹری سے یو پی گورنمنٹ چکر لگانے لگی۔ ڈیفنس منسٹری کو ان کے کاغذات ہی نہیں مل رہے تھے۔ فارن منسٹری کا یہ کہنا تھا کہ ہم ان کو ایمرجنسی سرٹیفکیٹ دے کر بلوا تو لیں، پر یہی یہ لگایا کہ انڈین آرمی انھیں لب فنڑی کی پوسٹ نہیں آفر کرے گی تو انھیں یہاں بلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انڈین آرمی کا یہ کہنا تھا کہ چونکہ وہ پاکستانی آرمی میں ایک بار نوکری کر چکے ہیں اس لیے انھیں انڈین آرمی میں نوکری دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

ہمدردی تو ہندوستانی نوکر شاہی کو غلام علی کے ساتھ بہت تھی مگر مسئلہ ان کے سامنے یہ تھا کہ کہیں ایک کو رعایت دی گئی تو اس کے بہانے لاکھوں پاکستان گئے مہاجر مسلمانوں کے لیے لوٹنے کے دروازے نہ کھل جائیں۔

ہوم منسٹری کا یہ کہنا تھا کہ چوں کہ وہ ایک پاکستانی پاسپورٹ پہلے ہی رکھ چکے ہیں اس لیے انھیں ہندوستانی پاسپورٹ ایشو کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ فارن منسٹری نے تب تک ایمرجنسی سرٹیفکیٹ ایشو کرنا بند کر دیے تھے۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ انھیں لانگ ٹرم ویزا پر ہندوستان بلایا جائے۔ مگر اس کے لیے پاکستانی پاسپورٹ ہونا شرط تھا۔ پر وہ تو غلام علی پہلے ہی سرینڈر کر چکے تھے اور لاہور کے ایک ہندو کیمپ میں رہنے والے کو پاکستانی سرکار پاسپورٹ ایشو کرے تو کیوں کرے۔

غرض کہ حاضرین بارہ سال کی محنت اور مشقت، فائلوں کی ادلا بدلی اور آمد و رفت کے بعد ہندوستانی نوکر شاہی نے انھیں ہندوستان بلانے کا ایک طریقہ نکال ہی لیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ حوالداری غلام علی ایک اسپیشل

پاسپورٹ پر ہندوستان بلا وے جائیں گے مگر شرط یہ رکھی کہ وہ کبھی بھی ہندوستانی شہریت کے لیے عرضی داخل نہیں کریں گے۔ ان کی نقل و حرکت پر خفیہ دیکھ بھال نظر رکھے گا اور ان کو ہر سال اپنی عرضی کو لوکل تھانے میں جا کر ری نیو کروانا ہوگا۔

غلام علی کی آخری فائلوں میں یہ لکھا پایا جاتا ہے:

نام	:	غلام علی
جائے پیدائش	:	ہندوستان
شہریت	:	نامعلوم

دو جدا ہو گئے دھڑوں کے بیچ ایک کٹا ہوا عضو لمب فنز غلام علی کا دھڑ۔

تو حاضرین پیش ہے بٹوارے کے پچیس سال آزاد پاکستان سے پاکستان بھیجا گیا ایک اور خط:

''عزیز از جان سعادت نشان برخوردار کامران۔

یہ خط میں تمھیں شیخ صدیق حسن کے لڑکے کے معرفت لندن بھیج رہا ہوں کہ شاید وہاں سے تم تک کراچی پہنچ جائے۔ بیٹا ادھر کی خبر کم کم آتی ہے اور جو آتی بھی ہے تو اس پر اعتبار کرنے کا دل نہیں کرتا۔ ابھی حال ہی میں خبر آئی کہ رجو قصائی کا لڑکا کراچی جا کر بہت بڑا بزنس مین بن گیا ہے اور اپنے نام کے آگے سید لکھنے لگا ہے کہ پھر خبر آئی کہ محسن کی نواسی نے وہاں جا کر غیروں میں شادی کر لی ہے۔ موٹر کار میں آگے بے پردہ بیٹھتی ہے اور خاندان کا نام روشن کر رہی ہے۔ پھر ایک دن شیخ صدیق حسن دوڑے دوڑے آئے اور کہنے لگے پاکستان میں سب سوشلسٹ ہو گئے ہیں اور پیاز پانچ روپیہ سیر بک رہی ہے۔ سن کر دل دھک سے رہ گیا۔ پھر خیال آیا کہ شیخ صدیق حسن پرانے کانگریسی ہیں پاکستان کے بارے میں جو خبر لائیں گے ایسی ہی لائیں گے۔ پھر ایک دن ایک ایسی خبر آئی جس سے ان سب افواہوں کی تردید ہو گئی۔ خبر یہ آئی کہ پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے اور زور و شور سے ان کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ سن کر بیٹا دل کو بہت تسکین پہنچی۔

بیٹا ہم تو کافروں کے ملک میں ہیں ہمارے گھر کے آگے غیر مقلدوں نے اپنی اونچی ایک مینار کی مسجد بنالی ہے۔ دن بھر بلند آواز میں آمین آمین کہتے ہیں اور ہم کچھ کر بھی نہیں پاتے ہیں۔

بیٹا ہمارا شجرہ ہماری سب سے بیش قیمت وراثت ہے۔ چودہ سال سے ہم نے اس امانت کو سنبھال کر رکھا تھا۔ پر ہندوستان و پاکستان کی رستہ خیزی میں یہ وراثت ہم سے بچھڑ گئی اب یہ صرف حافظے کے ذریعہ منتقل کی جا سکتی ہے۔

پیارے میاں ہمارے خاندان کی طرف سے سن سینتالیس کے فسادات میں چڑھنے والی پہلی بھینٹ تھے،

میں نے تب سے لے کر اب تک حساب کیا ہے، ہمارے خاندان سے کل 31 افراد ہلاک ہوئے ہیں، سات کو اہل ہنود نے ہندوستان میں قتل کیا، 14 پاکستان جا کر برادران اسلام کے ہاتھ اللہ کو عزیز ہوئے اور باقی اپنی موت مارے گئے۔

بیٹا مشاہدے میں تو یہی آیا ہے کہ بنکے ٹوٹ کر بکھر گئے تو بکھر گئے، تتر بتر تنکوں کو کبھی جمع ہوتے دیکھا نہیں گیا، مگر خوش کرنا انسان کا فرض ہے۔ اب جب کہ رستے کھلنے لگے ہیں تم بھی ایک چکر ادھر کا لگا جاؤ، اپنی صورت دکھا جاؤ۔ تمہاری چچی کا تقاضہ ہے کہ اکیلے نہ آنا، اپنی دلہن کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ ہاں میاں اکیلے نہ آنا۔ اسی بہانے ہم تمہارے بچوں کو دیکھ لیں گے کہ کون گورا ہے اور کون کالا۔

بیٹا اب میں اڑتے پنچھیوں کا ماتا دار ہوں اور کیا لکھوں تم کم لکھے کو بہت جانو۔ دنیا میں آ کر بہت کچھ دیکھا جو نہیں دیکھنا تھا سو وہ بھی دیکھا۔ اب آنکھ بند ہو کہ وہ دیکھیں کہ جسے دیکھنے کی ایک مدت سے آرزو ہے۔

داستان گوئی

محمود فاروقی، دانش حسین کاظم

میر باقر علی صاحب کا وہ دور بھی دیکھا کہ مجھ جیسے کئی ان کو ایک نظر دیکھ لینا اپنے لیے فخر ومباہات کا باعث سمجھتے تھے اس دور میں میر صاحب کی وہ دھاک تھی کہ بڑی بڑی دور سے ان کے نام بلاوے آتے اور میزبان ان کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتے۔ پھر وہ دور آیا کہ میر صاحب بھوجلا پہاڑی والے مکان میں جمعرات کو کہانی سناتے، سننے والے آتے دونی طاق پر رکھ کر کہانی سننے بیٹھ جاتے۔ میر صاحب کے ہاتھ میں افیون کی پیالی اور زبان پر داستان یوں بے تکان سناتے چلے جاتے کہ بڑے بڑے طرار جوانوں کو ان کے بڑھاپے پر رشک آتا۔ میں اس زمانے میں میر صاحب کی شاگردی کا دم بھرتا تھا۔ میر صاحب نے مجھے اپنا فن سکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر میری کوتاہیوں نے مجھے وہ فیض حاصل نہ کرنے دیا جس کا دروازہ میر صاحب نے میرے لیے کھول رکھا تھا۔ اب وہ دن یاد آتا ہے تو آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ ہائے میر صاحب۔

سید ذوالفقار علی بخاری

اُجلی چاندنی کا فرش ہے۔ فرش پر قرینے اور سلیقے کے ساتھ گاؤ تکیے دھرے ہیں۔ گاؤ تکیوں کے سہارے خوش پوش شرفاء بڑے تکلف و نفاست کے ساتھ رونق افروز ہیں اور میر باقر علی صاحب مرحوم۔ رستم و افراسیاب زال و نریمان۔ جمشید و بختر و۔ امیر حمزہ، خداوند لقا۔ عمرو عیار، حاتم طائی یا پھر طلیل خاں۔ مولا بخش، فقیر کی جھولی، پاجی پڑوس یا کوئی اور "داستان حیرت بیان" کہہ رہے ہیں۔ "کہہ" کیا "چہک" رہے ہیں (جیسے بلبل خوش نوا یا طوطی ہزار داستاں) خود اپنی داستان گوئی کے متعلق میر صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے داستان تو نہیں آتی۔ ہاں کچھ بائیں شائیں باتیں بک لیتا ہوں۔ یہ آخری دونوں فقرے میر صاحب کے طبعی انکسار کا ثبوت ہیں جب کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ صحیح معنی میں حقیقی طور پر میر کاظم علی داستان گو کے جانشین تھے۔ ان داستانوں کی اشاعت اس لیے بھی ضروری تھی کہ ہم ان میں عہدِ قدیم کی زندگیوں کو جیتا جاگتا اور ماضی مرحوم کی معاشرت کو چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ پھر میر صاحب کی زبان اور ان کا انداز بیان؟ آج اردو (زبان اور ادب دونوں اعتبار سے) کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ مگر میر باقر علی داستان گو کی زبان میں جو چٹخارا، جزئیات، قصے کے بیان پر جو قدرت وافر اوقصہ کی تصویر کشی اور محاکات پر جو حاکمانہ تصرف اس مرحوم کو حاصل تھا اس کی مثال اس عہد میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے۔ بلکہ نہیں مل سکتی۔

رئیس امروہوی

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے۔ اب تو اُسے پورا جگ گزر گیا میں نے دہلی کے میر باقر علی داستان گو کا نام سنا تھا۔ بالکل بچپن کا زمانہ تھا کوئی بارہ سال کی عمر ہو گی اُس زمانے میں نے پنجاب یونی ورسٹی کا منشی فارس کا امتحان پاس کیا تھا۔ میر صاحب کی داستانیں اور ان کا انداز بیان اُن باخبر ادبی حلقوں میں بڑا مقبول تھا جو میرے خیال میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ میر باقر علی کی متند شخصیت میرے لیے ایک عظمت کا مفہوم رکھتی تھی اور بس میں

داستان گوئی کے فن سے نہ واقفیت رکھتا تھا نہ کبھی مجھے بچپن میں کہانی کہنے میں مہارت حاصل ہوئی، البتہ طلسم ہوشربا اور الف لیلہ کو سنا بھی تھا اور دیکھا بھی مگر ان سے میر باقر علی کی داستان گوئی پر قیاس! جی ہاں غلط تو ہے مگر میں نے انھیں کچھ اس انداز میں سمجھا اور ان کے آرٹ کو اس پیمانہ پر میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میر باقر علی ایک نئے ادبی رجحان اور سماجی زندگی کے بڑے کامیاب نقاد تھے جو زندگی اور حیات پر ادبی مکاتیب کی خانہ بندی میں اسیر ہوئے بغیر بھرپور طنز کر سکتے تھے۔ اب جب کہ ہمارے دوسرے ادبی بزرگ زندہ ہو رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ نئی نسل میر باقر علی کے ساتھ بھی پورا انصاف کرے گی۔

سید محمد تقی

میر باقر علی داستان گو وہ شخصیت ہیں جہاں ہماری داستان گوئی کی روایت ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد میر باقر علی خود ایک داستان بن گئے۔ کہاں تو ان کی داستان گوئی کا اتنا شہرہ تھا کہ وہ دور دور رجواڑوں اور نوابوں کے درباروں میں بلائے جاتے تھے اور انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا اور کجا یہ کہ خود دلی میں داستان کی اتنی بے قدری ہوئی کہ میر باقر علی نے داستانوں کو لپیٹ کر طاق میں رکھا اور چھالیہ بیچنی شروع کر دی اور خود داستان عبرت بن گئے۔ اب کوئی داستان نگار آئے اور اس داستان کو رقم کرے، اس میں اردو زبان کا عروج و زوال دونوں نظر آ جائیں گے۔ اب انجمن ترقی اردو، پاکستان نے ان کی داستان اور داستانیں زندہ کرنے کا تہیہ کیا ہے تو یہ ایک نیک فال ہے ان کی داستان اور داستانیں دونوں سامنے آنی چاہئیں۔

انتظار حسین

کیا آگرے کا قلعہ یا دلی کا دونوں جگہ داستان گوئی نے دربار میں راہ پائی۔ ہر شہر کے علم دوست اور ادب نواز امراء نے انھیں اپنے یہاں ملازم رکھا۔ یہ تذکرہ بھی ملتا ہے کہ غالب اپنے گھر میں داستان گوئی کی محفل آراستہ کرتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو شاہی قلعے اور روسائے دہلی کی ان محفلوں کا آخری چراغ تھے۔ اب سے کئی برس پہلے میں نے یوٹیوب پر ان کی دو یا شاید ڈھائی منٹ کی ریکارڈنگ سنی تھی اور اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ مجھے اگر گمان بھی ہوتا کہ ہمارے یہاں یوٹیوب پر وبیری وقت پڑنے والا ہے تو میں ان کی آواز کو ریکارڈ کر لیتی۔ میر باقر علی ہماری ادبی اور تہذیبی روایت کا ایک درِ بے بہا تھے، ہم ایسے لوگوں کی ناقدری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، سو یہی ہم نے میر باقر علی کے ساتھ کیا، آخری دنوں میں دلی کی گلیوں میں کتری ہوئی ڈلی بیچتے تھے۔ عقیل عباس جعفری نے ان کی بعض داستانیں اور ان کے بارے میں بعض اہم ادیبوں کی تحریریں جمع کی ہیں۔ اس کے لیے انھیں داد ملنی چاہیے اور انجمن ترقی اردو کی معتمد اعزازی ڈاکٹر فاطمہ حسن کو بھی جنھوں نے اس اہم کتاب کی اشاعت سے انجمن کو سرخرو کیا۔

زاہدہ حنا

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ سب رس	ملا وجہی/مولوی عبدالحق	۳۵۰ روپے
۲۔ چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۳۵۰ روپے
۳۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بطور مرتب و مدون	ڈاکٹر شازیہ عنبرین	۵۰۰ روپے
۴۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ حیات اور ادبی کارنامے	ڈاکٹر محمد زاہد	۳۰۰ روپے
۵۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے (ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ)	پروفیسر رئیس فاطمہ	۳۵۰ روپے
۶۔ دیوان غالب کامل (کمپوز شدہ نیا ایڈیشن)	کالی داس گپتا رضا	۶۵۰ روپے
۷۔ اردو ادب کی تحریکیں (اشاعت ہشتم)	ڈاکٹر انور سدید	۷۰۰ روپے
۸۔ جوامع الحکایات ولوامع الروایات (جلد اول/دوم)	مترجم: اختر شیرانی	۷۰۰ روپے
۹۔ اردو نثر میں مزاح نگاری... (اضافہ شدہ ایڈیشن)	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۸۰۰ روپے
۱۰۔ جدید اردو شاعری (جلد اول)	عزیز حامد مدنی	۳۰۰ روپے
۱۱۔ دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی دہلوی	۳۵۰ روپے
۱۲۔ قواعد اردو	مرتب: ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۳۰۰ روپے
۱۳۔ جمیل الدین عالی شخصیت و فن	ڈاکٹر فہمیدہ عتیق	۵۰۰ روپے
۱۴۔ جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	۵۰۰ روپے
۱۵۔ اردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر نزہت عباسی	۷۰۰ روپے
۱۶۔ انتخاب سہ ماہی ''اردو'' (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۰ء)	ڈاکٹر جاوید منظر/ثروت رضوی	۵۰۰ روپے
۱۷۔ زاہدہ خاتون شروانیہ (حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ)	ڈاکٹر فاطمہ حسن	۳۰۰ روپے
۱۸۔ جدید اردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	۵۰۰ روپے
۱۹۔ تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۳۵۰ روپے
۲۰۔ اردو کی نثری داستانیں (اضافہ شدہ ایڈیشن)	ڈاکٹر گیان چند جین	۹۹۰ روپے
۲۱۔ باغ و بہار (یعنی قصہ چہار درویش)	میر امن دہلوی؛ مرتب: مولوی عبدالحق	۳۵۰ روپے
۲۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی علمی و تحریکی خدمات...	ڈاکٹر عائشہ کفیل برنی	۶۰۰ روپے
۲۳۔ نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ	ڈاکٹر ممتاز عمر	۸۰۰ روپے
۲۴۔ خواتین کے اردو سفرنامے ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۳ء	ڈاکٹر صدف فاطمہ	۳۵۰ روپے
۲۴۔ کراچی کے دبستان شاعری میں اردو غزل کا ارتقاء	ڈاکٹر جاوید منظر	۳۰۰ روپے

۵۰۰ روپے